سلسلۂ دار المصنفین

(نمبر ۱۳)

روح الاجتماع

یعنی

ڈاکٹر لیبان فرانسیسی کی کتاب "جماعتہائے انسانی کے اصول نفسیہ" کا اردو ترجمہ

از

مولنا محمد یونس انصاری فرنگی محلی مرحوم

سابق رکن دار المصنفین

باہتمام: مولوی مسعود علی صاحب ندوی

مطبع معارف اعظم گڈھ میں چھپی

سنہ ۱۳۶۰ھ
۱۹۴۱ء

طبع چہارم

فہرست فصول وابواب

روح الاجتماع

شمار	مضمون	صفحہ
۱	دیباچۂ مترجم،	۱ - ۴
۲	مقدمۂ مترجم،	۵ - ۳۶
۳	مقدمۂ مؤلف،	۱ - ۶
۴	تمہید،	۷ - ۱۸
	باب اوّل نفسِ اجتماعی کی تشریح وتمثیل	
۵	فصل ۱- جماعت کے ممیزاتِ عمومی،	۱۹ - ۳۲
۶	〃 ۲- جماعت کے حسیات جذباتِ اخلاق،	۳۳ - ۶۶
۷	〃 ۳- جماعت کے قوائے عقلی،	۶۷ - ۸۰
۸	〃 ۴- جماعت کے افعال پر مذہب کا اثر،	۸۱ - ۸۹
	باب دوم جماعت کے افکار اور معتقدات	

۹	فصل-۱- معتقداتِ جماعت کے عواملِ بعیدہ ،	۹۰ - ۱۱۴
۱۰	” ۲ - معتقداتِ جماعت کے عواملِ قریبہ ،	۱۱۵ - ۱۳۴
۱۱	” ۳ - قائدینِ جماعت کے خصائص ،	۱۳۵ - ۱۶۴
۱۲	” ۴ - نفسِ اجتماعی کے معتقداتِ اساسی کے حدود ،	۱۶۵ - ۱۷۹
	باب سوم	
	جماعت کے مختلف اقسام کی نفسیاتی تشریح ،	
۱۳	فصل ۱ - جماعت کے اقسام ،	۱۸۰ - ۱۸۵
۱۴	” ۲ - جرائم پیشہ جماعتیں ،	۱۸۶ - ۱۹۱
۱۵	” ۳ - فوجداری عدالتوں کی جیوریاں ،	۱۹۲ - ۱۹۹
۱۶	” ۴ - ووٹ دینے والی جماعتیں ،	۲۰۰ - ۲۱۱
۱۷	” ۵ - نیابی مجالس ،	۲۱۲ - ۲۳۴

دیباچہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ

۱۔ پیش نظر کتاب مشہور فرنچ مصنف موسیو لیبان کی کتاب روح الاجتماع (یعنی جماعتہائے انسانی کے اصول نفسیہ) کا ترجمہ ہے، موسیو لیبان ہندوستان کیلئے کوئی اجنبی مصنف نہیں ہیں، ان کی کتابیں تمدن عرب، تمدن ہند اور انقلاب الامم، اردو میں ترجمہ ہو کر ملک میں شائع ہو چکی ہیں، ہماری یہ کتاب اسی سلسلہ کی چوتھی کڑی ہے،

۲۔ ہندوستان میں اگرچہ انگریزی تعلیم یافتہ طبقہ اپنے تئیں یوروپین علوم وفنون کے خزانہ کا کلید بردار سمجھتا ہے، لیکن ہندوستان کے عربی تعلیمیافتہ طبقہ کو مسلمانان مصر کا ممنون ہونا چاہئے کہ وہ اپنی مادری زبان عربی میں یورپ کی بعض جدید تصنیفات کا ترجمہ کرتے رہتے ہیں، ان سے ہندوستان کا عربی داں طبقہ بھی اپنی قدیم عزت ووقار کو برقرار رکھنے کے لئے کبھی کبھی مواد حاصل کرتا رہتا ہے،

مصر وہندوستان گو ایک ہی گورنمنٹ کے زیر اثر اور ماتحت ہیں، اور تقریبًا دونوں ملکو

کے حالات ملتے جلتے ہیں، لیکن باوجود اس کے ان دونوں ملکوں میں بڑا فرق ہی،
مصر کی تمامتر موجودہ علمی چہل پہل اور دماغی ترقی کا علمبردار وہ فرقہ ہی جو جدید طرز تعلیم
کے سانچہ میں ڈھالا گیا ہی، بخلاف اسکے ہندوستان میں ابتک جتنے بھی علمی یا قومی کام انجام پائے
ہیں، ان میں سے تقریباً اکثر اس فرقہ کی کوششوں کا نتیجہ ہیں، جس نے بجائے کالجوں کی عالیشان
عمارتوں کے مسجدوں میں یا ٹوٹے پھوٹے حجروں میں بیٹھ کر پرانے طرز پر تعلیم حاصل کی ہی، اردوزبان
کے دورعلمی کے جو مایۂ ناز بزرگ گذرے ہیں، وہ عموماً خالص عربی تعلیمیافتہ، یا عربی وانگریزی علوم
فنون دونوں کے جامع تھے، اور اس سلسلہ میں جو چند علمی کتابیں موجودہ دور میں اردو زبان میں
ترجمہ یا تصنیف کی گئیں ان میں سے تقریباً اکثر عربی تعلیمیافتہ طبقہ کی جانفشانی اور دماغی محنتوں کا
نتیجہ ہیں، اور اس بنا پر جو کتاب اس وقت اردوداں ناظرین کی خدمت میں پیش کیجارہی ہی، اس کا
عربی داں طبقہ کی جانب سے پیش کیا جانا ہندوستان میں کچھ محلِ تعجب نہیں ہے،

۳۔ لیکن اس ترجمہ کے متعلق ایک اور خاص بات کا ذکر کر دینا بھی نہایت ضروری ہی، عربی
زبان میں جو اس کتاب کا ترجمہ روح الاجتماع کے نام سے شائع ہوا ہی، اسکے متعلق گو یہ تو نہیں
کہا جاسکتا کہ وہ ترجمہ اصل سے کتنا مختلف یا کتنا مطابق ہی، البتہ فرنچ زبان سے اس کتاب کا جو ترجمہ
انگریزی میں کیا گیا ہے، اور کروڈ کے نام سے شائع ہوا ہی، اس سے عربی ترجمہ جا بجا مختلف ہی،
عربی زبان میں اس کتاب کا ترجمہ فتحی پاشا زغلول نے کیا ہی، انکے عربی طرز تحریر کی ایک نمایاں
خصوصیت یہ ہے، کہ زبان نہایت بلیغ ہوتی ہے، اور عبارت میں ایجاز و اختصار زیادہ ملحوظ
رہتا ہے، "روح الاجتماع" کے علاوہ "سر تطور الامم" اور "سر تقدم الانکلیز السکسونیین"، جو فرنچ کتاب کے
عربی ترجمے ہیں، ان کتابوں کا مترجم بھی یہی مصری انشاپرداز ہی، اور ان سب کتابوں میں بھی اس کے
طرز تحریر کے یہی دو وصف نمایاں ہیں، گو اس طرز تحریر سے عبارت میں زور پیدا ہو جاتا ہی لیکن کسی

کتاب کا ترجمہ کرنے میں یہ طرزِ تحریر بجائے مفید ہونے کے الٹا مضر پڑتا ہے، بعض جگہ ایجاز و اختصار کی وجہ سے ترجمہ میں مصنف کا مطلب کچھ سے کچھ ہو جاتا ہے، اور بعض جگہ مطالب کی سلاست و روانی میں فرق آجاتا ہے،

اس بنا پر عربی ترجمہ کے ایجاز و اختصار کی وجہ سے عربی ترجمہ میں بیحد نقص پیدا ہو گئے ہیں، یہانتک کہ بعض جگہ اختصار کی بدولت مصنف کا اصلی مطلب بالکل الٹ گیا ہے، اس نقص کے علاوہ عربی ترجمہ میں سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ مترجم چونکہ اصطلاحاتِ فن سے ناواقف ہے، اسلئے اکثر جگہ عربی اصطلاحات وضع کرتے ہوئے اُس نے اصطلاحات میں نہایت بیجا تصرف کیا ہے، مثلاً مصنف نے جماعت کے میزاتِ عمومی بیان کرتے ہوئے جماعت کی خصوصیت یہ بتائی ہے کہ جماعت کا وقوف و شعور قریب قریب مفقود ہوتا ہے، اور اس پر ہمیشہ نیم شعوری کی ایک کیفیت طاری رہتی ہے، انگریزی میں کیفیتِ شعوری کو کانشنس نیم شعوری کو سب کانشنس اور کیفیتِ غیر شعوری کو انکانشنس کہتے ہیں، ان کیفیات میں پہلی کیفیت کا مظہر انسان کی حالتِ انفرادی ہے اور دوسری کیفیت کا مظہر نفسِ اجتماعی ہے، لیکن مترجم نے نفسِ اجتماعی کو تیسری کیفیت کا مظہر بتایا ہے، اور سب کانشنس کا ترجمہ کیفیتِ لاشعوری کیا ہے، جو انکانشنس کا ترجمہ ہے، یہ ایک بیجا تصرف ہے جس کا ارتکاب عربی مترجم نے اصطلاحات میں کیا ہے،

غرض یہ نقائص ہیں جن سے عربی ترجمہ مملو ہے، میں جب اپنا ترجمہ تمام کر چکا، تو اس وقت مکرمی مولوی عبدالماجد صاحب بی اے نے میری توجہ اس جانب مبذول کرائی، چنانچہ جب میں نے اس کتاب کے انگریزی ترجمہ کا مطالعہ کیا، تو فی الواقع مجھے انگریزی اور عربی ترجمہ میں بے انتہا فرق نظر آیا، اور اس کے بعد میں نے عربی ترجمہ سے قطع نظر کرکے انگریزی ترجمہ سے اپنے ترجمہ کو درست کرنا شروع کر دیا،

حاصل یہ ہے کہ گویہ ترجمہ در اصل عربی کتاب سے کیا گیا ہو، لیکن تصحیح اور نظر ثانی انگریزی ترجمہ سے کی گئی ہے، اور اس اعتبار سے گویا یہ سمجھنا چاہئے، کہ اب یہ ترجمہ اپنی موجودہ شکل میں بجائے عربی کتاب کے انگریزی کتاب کا ترجمہ ہے،

۴- موجودہ دور میں ہندوستان کے مسلمانوں کی قوم میں لیڈروں کی جو بہتات ہے، اور ہماری قوم کے نوجوانوں کو مقتدی بننے کے بجاے مقتدا بننے کا جو شوق ہو، غالباً اس راہ میں اُن کیلئے اس کتاب کا مطالعہ ازحد مفید ہوگا کہ کسی جماعت کے "قائد" بننے سے پیشتر اپنے میں قیادت کی صلاحیت پیدا کرنا چاہئے، قوموں کے قائد عموماً اپنی فطرت سے قائد پیدا ہوا کرتے ہیں، اور ان کی زندگی کا مقصد ہی گویا یہ ہوتا ہو کہ وہ کسی جماعت کے قائد بنیں، لیکن ہماری قوم میں روزمرہ جو مصنوعی قائد پیدا ہوا کرتے ہیں، ان کے لئے کیا اسکی بھی ضرورت نہیں کہ قائد بننے سے پیشتر کم از کم ان علمی اصول کی تعلیم تو حاصل کرلیں جو مختلف قائدین کے حالات سے مستنبط ہیں!

محمد یونس

فرنگی محل لکھنؤ، ۳۱ر جنوری ۱۹۱۸ء

مقدمۂ مترجم

(۲)

۱۔ انسان کے تمام دماغی اور نفسانی حالات کو ایک ایک کر کے دیکھ جاؤ، نفسِ انسانی کے ہر ہر مظہر اور ہر ہر شعبہ میں تم کو گوناگوں اور تغیر پذیر کیفیاتِ نفسانیہ کا جلوہ نظر آئیگا احساسات و مشاعر، خیالات و تصورات، عواطف و جذبات اور ارادہ، یہ چار قسم کی کیفیتیں انسان کی دماغی حیات کی کل کائنات ہیں، اور ان کے علاوہ جتنی کیفیتیں ہیں، وہ یا انہی کی مظہر ہیں، اور یا ان سے مل جل کر بنتی ہیں، لیکن افرادِ انسانی کی ان نفسانی کیفیتوں کا اظہار اکثر اس وقت ہوتا ہی جب مخصوص ماحول اور مخصوص علتوں کے ماتحت دماغی قویٰ اپنے اپنے فرائض انجام دیتے ہیں، انسان کی کیفیتِ وقوفی اور حالتِ شعوری ایک خارجی ماحول اور مخصوص مہیجاتِ بیرونی کی محتاج ہے، کہ جب تک یہ بیرونی موثر مخصوص خارجی حالات کی موجودگی میں اعصابِ حس کو متاثر نہ کرے، اس وقت تک انسان میں کیفیتِ وقوفی کا ظہور ہی نہیں ہو سکتا، اسی طرح جذبات اور تصورات بھی اپنے وجود کے لئے مخصوص حالاتِ خارجی اور مہیجاتِ بیرونی کے محتاج رہتے ہیں، اور ان سب کیفیاتِ نفسانی سے انسان کی نفسانی زندگی کی تشکیل ہوتی ہی، ہر انسان کو اپنی روزانہ زندگی میں مختلف بیرونی مہیجات اور موثرات سے سابقہ پڑتا ہے، اور یہ بیرونی مہیجات اعصابِ حس کے ذریعہ سے انسان کے نفسانی کیفیات میں گوناگوں

تغیر کرتے رہتے ہیں، اور چونکہ انسان کی نفسانی زندگی کا خمیر ان ہی مختلف اور تغیر پذیر کوائفِ نفسانی کے مجموعہ سے تیار ہوتا ہی، اسلئے ہم کہہ سکتے ہیں، کہ انسان کی انفرادی حیاتِ نفسی نام ہی ان تغیر پذیر کیفیاتِ نفسانی کے مجموعہ کا جو ذہنِ انسانی میں پیدا ہوتی اور مٹتی رہتی ہیں،

لیکن یہ تغیرات جو انسان کی ذہنی دنیا میں پیدا ہوتے ہیں، اور بسا اوقات انسان کی عملی زندگی پر بھی اثر کرتے ہیں، کیا یہ محض اتفاقی حادثات کا مجموعہ ہیں یا یہ بکھرے ہوئے اجزا علت و معلول کی زنجیر میں منسلک ہیں، ؟ بالفاظ دیگر یہ مختلف تغیراتِ ذہنی جو ذہنِ انسان میں پیدا ہوتے ہیں، کیا یہ چند مخصوص قوانینِ فطرت کے تابع ہیں، جو ان تغیرات کی علت واقع ہوتے ہیں، علم بتاتا ہے کہ یہ تغیراتِ ذہنی چند نفسانی قوانین کی بنا پر پیدا ہوتے ہیں، اور مٹتے ہیں، احساسات و مشاعر کے لئے علیحدہ قوانین ہیں، تصورات کیلئے علحدہ قوانین ہیں، جذبات کیلئے علحدہ قوانین ہیں اور ان سب قوانین سے ایک مخصوص علم میں بحث کیجاتی ہی، جس کا نام علم النفس ہی غرضکہ انسان کی حیاتِ نفسی جن تغیر پذیر کیفیاتِ نفسی کے مجموعہ سے عبارت ہی، انکی علتوں، ان کے قوانینِ نفسی اور انسان کی نفسانی زندگی کے حیرت انگیز طلسم کی عقدہ کشائی ایک مخصوص علم کے ذمہ ہی جسکو **علم النفس** کہتے ہیں،

۲۔ انسان کی حیاتِ نفسی کا ایک یہ شعبہ ہی، جسکی حقیقت کا انکشاف علم النفس کرتا ہی لیکن انسان کی حیاتِ نفسی کا ایک شعبہ اور ہی، جو انسان کی اس ممتاز خصوصیت پر مبنی ہی، کہ انسان فطرۃً مدنی الطبع پیدا ہوا ہی، میری زندگی مجھی تک منحصر نہیں ہیں خود ایک ذات ہوں، اور میرا وجود اپنی ہی نوع کے دیگر افراد کے ساتھ وابستہ ہے، میرے عادات، میرے رہنے سہنے کا طور و طریق میرے اعتقادات، میرا اخلاق، میرا کیرکٹر، غرض میری ہر وہ شے جس کو میں اپنی جسمانی یا دماغی زندگی کی جانب منسوب کر سکتا ہوں، وہ صرف میری ہی نہیں ہی، بلکہ اس میں کا اکثر حصہ میں نے دوسروں سے پایا ہے، اور اپنے پاس اس غرض سے امانت رکھا ہی، کہ اس میں کچھ اضافہ کر کے

اس دفینۂ مخفی کو میں دوسروں تک پہنچادوں، یہ میری زندگی کا دوسرا شعبہ ہے، جس کا تعلق صرف میری اپنی ذات کے ساتھ نہیں، بلکہ اس میں میرے ساتھ دوسرے بھی شریک ہیں، ہم قومی، ہم ملکی، اور ہم وطنی، غرض اس قسم کے وہ تمام مشترک الفاظ جو انسان کے حالاتِ اجتماعی یا اس کے رشتہ قومی کو ظاہر کرتے ہیں، ان کی بنا ر انسان کی یہی دوسری قسم کی حیات ہے، جو حیاتِ انفرادی کی طرح گو تغیر پذیر واقع ہوئی ہے لیکن انسان کی ان دو زندگیوں میں جو فرق ہے، وہ یہ ہے کہ اگر پہلی زندگی ایک ایک منٹ اور ایک ایک پل میں بدل جایا کرتی ہے تو اس کے مقابل انسان کی دوسری زندگی میں ایک زمانہ اور چند صدیوں کے بعد تغیر ہوتا ہے، گویا انسان کی تمدنی اور اجتماعی زندگی کرۂ ارض کے طبقاتِ آبی چٹانوں اور پہاڑوں کے مماثل ہے، جن میں ایک مدت کے بعد تغیر ہوتا ہے، اور تغیر کے بعد پھر انکی ظاہری حالت ایسی بدل جاتی ہے کہ اصلیت کا بالکل پتہ نہیں چلتا،

انسان کی یہ دو متقابل حیاتِ نفسی ہیں، جن میں سے حیاتِ انفرادی کے مظاہر تو ہم بتا چکے ہیں کہ انسان کے احساسات و مشاعر، تصورات و اعتقادات، جذبات و خیالات اور اسکی قوتِ ارادی، وغیرہ ہیں، لیکن انسان کی حیاتِ اجتماعی کی تشکیل جن عناصر سے ہوتی ہے وہ، وہ تمام لوازمِ تمدن ہیں، جو ایک قوم یا ایک ملک کے باشندوں کیساتھ مخصوص ہوتے ہیں اور جو انکی عملی زندگی کے ہادی اور رہبر ہوا کرتے ہیں، کسی قوم کا مخصوص نظامِ حکومت، اس کا مخصوص نظامِ معاشرت، اس کا مخصوص مذہب، اسکا طریقِ تجارت، اسکی صنعت و حرفت، اسکے علوم و فنون، اسکی صناعیاں اور دستکاریاں، اسکا مخصوص طرزِ جنگ، غرض وہ تمام لوازمِ تمدن جو کسی قوم کیساتھ خاص ہوتے ہیں، ان سے انسانی حیاتِ اجتماعی کی تشکیل ہوتی ہے، لیکن جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں کہ جس طرح انسان کی انفرادی حیاتِ نفسی تغیر پذیر ہے اسیطرح انسان

کی اجتماعی حیاتِ نفسی بھی تغیر پذیر اور بدلنے والی شے ہی، اور ان دونوں میں جو فرق ہی، وہ یہ ہے کہ حیاتِ انفرادی کے اندر منٹوں اور گھنٹوں میں فرق ہوتا ہے اور حیاتِ اجتماعی صدیوں کے بعد متغیر ہوتی ہی، اس فرق کی وجہ یہ ہی، کہ حیاتِ انفرادی کے تغیر کے لئے جن خارجی مہیجات کی ضرورت ہوتی ہی، وہ بھی گو اپنی ترکیب میں پیچیدہ ہوتے ہیں، لیکن انسان کی حیاتِ اجتماعی پر جو خارجی موثرات اثر کرتے ہیں، وہ بے انتہا ہوتے ہیں، اور اس کے ساتھ ان کی ترکیب بھی اتنی پیچیدہ ہوتی ہی، کہ ان سب کے متواتر عمل کرنے کے لئے ایک مدت درکار ہوتی ہی،

لیکن یہ مختلف عوامل اور مہیجات جو کسی ہیئتِ اجتماعی پر اثر کرتے ہیں، انکی تحدید دو قسم کے مہیجات میں کی گئی ہے بعض مہیجات تو وہ ہیں، جن کا تعلق خود ان افراد کے اندرونی حالات اور خود افراد کے ذاتی کیرکٹر اور افراد کی ذاتی فطرت سے ہوتا ہی، جماعت کے ان اندرونی مہیجات کی حقیقت سمجھنے کیلئے یہ پیشِ نظر کرلینا بھی ضروری ہی، کہ انسان کی ہیئتِ اجتماعی کا نظام تمامتر مبنی ہوتا ہی انسان کی قوتِ تقلید، اور اسکی اثر پذیری پر، حیاتِ اجتماعی کی اگر کوئی دقیق سے دقیق تشریح کیجائے تو اس کا حاصل بجز اسکے کچھ نہ نکلے گا، کہ حیاتِ اجتماعی نام ہی افراد کی اثر پذیری اور افراد کی تحدید حریت اور فنائے تشخیصیت کے مجموعہ کا، سوسائٹی میں داخل ہو کر سوسائٹی کا ہر فرد دوسرے افراد سے متاثر ہوتا ہی، اور اسی نسبت سے وہ دوسرو کو اپنے سے متاثر کرتا ہی، اور افراد کی ذاتی شخصیتیں اجتماعی مقاصد کے اندر فنا ہو جاتی ہیں، فطرتِ انسانی کا یہ باہمی فعل و اثر سوسائٹی کے اندرونی حالات میں تغیر کرتا ہی، اس کے بعد اس مجموعہ پر چند اور خارجی موثرات اپنا عمل کرتے ہیں، مخصوص آب و ہوا مخصوص ماحول، آبا و اجداد کے موروثی اثرات، ملک کی فطری بوقلمونی اور مختلف مناظرِ فطرت، غرض وہ تمام خارجی حالات جن میں انسان کی کوئی سوسائٹی بسر کر رہی ہو، وہ سب ملکر انسانی جماعت پر اپنا اثر

اثر کرتے ہیں، اور ان تمام اندرونی اور بیرونی موثرات کا مجموعہ اپنے فعل واثر سے سوسائٹی
کے ان تمام کیفیاتِ اجتماعی اور مظاہرِ نفسانی کی تشکیل کرتا ہے، جن کی تفصیل اوپر گذر چکی ہے، لیکن
ان تمام اندرونی اور بیرونی موثرات کا جو اثر افرادِ انسانی کے مجموعہ پر ہوتا ہے، وہ اس طرح
نہیں ہوتا کہ کوئی خاص موثر کسی خاص کیفیتِ اجتماعی پر اثر کرے اور دوسرا خاص موثر
دوسری کیفیتِ اجتماعی پر، بلکہ مؤثرات کا پورا مجموعہ کیفیاتِ اجتماعی کے پورے مجموعہ پر ایکبارگی
اثر کرتا ہے، اور اس بنا پر گو کیفیاتِ اجتماعی میں ہم ہر ہر موثر کے علٰحدہ علٰحدہ نشانات تو نہیں
بتا سکتے، لیکن اگر ہم عہدِ قدیم کی کسی خاص سوسائٹی کے پورے حالات کا علم رکھتے ہوں،
نیز موجودہ زمانہ میں اس سوسائٹی کے جو حالات ہیں، اُن سے بھی ہم کو پوری واقفیت
ہو تو زمانہ گذشتہ اور زمانہ موجودہ کے حالات کا باہمی مقابلہ کرنے سے ان حالات کے
اندر ہم ایک عجیب ربط و نظام پاتے ہیں، جس سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ جس طرح
حیاتِ انفرادی میں انسانی حیات کا ہر متاخر لمحہ اپنے پیشتر و لمحہ سے علّیت و معلولیت کا تعلق
رکھتا ہے، اسیطرح حیاتِ اجتماعی کے تمام منتشر اجزا بھی علیت کی ایک کڑی میں باہم منسلک ہیں،
اور یہ پورا مجموعہ ایک عجیب حیرت انگیز ربط و نظام کا پتہ دے رہا ہے، جس کی علامتیں عالم کے
تمام مظاہرِ وجود میں ہمکو عیاں نظر آتی ہیں، پس انسان کی مختلف کیفیاتِ اجتماعی میں سے
ہر کیفیتِ اجتماعی کی علتِ قریبہ وہ کیفیتِ اجتماعی ہوتی ہے، جو اس کیفیتِ اجتماعی کے
پیشتر گذر چکی ہے، اور اسی طرح سلسلہ وار تمام کیفیاتِ اجتماعی اپنے سے مقدم کیفیاتِ
اجتماعی کی معلول اور اپنے سے متاخر کیفیاتِ اجتماعی کے لئے علت ہوتی ہیں،

غرض وہ خارجی حالات جن میں انسان کی کوئی سوسائٹی زندگی بسر کر رہی ہو جب
اپنے قوانین کے مطابق جماعت کے اندرونی موثرات کے ساتھ ملکر جماعت پر اثر کرتے ہیں

اس وقت کسی خاص ہیئتِ اجتماعی کی تشکیل ہوتی ہے، جو مخصوص کیفیاتِ اجتماعی اور مخصوص لوازمِ تمدن کی پیدائش کا باعث ہوتی ہے، لیکن جس طرح فطرت کے اور دوسرے مظاہر کائنات میں "عمل" اور "ردعمل" دو برابر کی قوتیں ہوتی ہیں، جو علی التواتر اپنا اثر کرتی ہیں، اسی طرح انسان کی حیاتِ اجتماعی بھی "عمل" اور "ردعمل" دو برابر کی قوتوں کی رزمگاہ ہے، جہاں یہ دونوں قوتیں متواتر اپنا عمل کرتی ہیں، ہیئتِ اجتماعی کے بیرونی موثرات، یا بالفاظ دیگر وہ خارجی حالات جنمیں انسان کی کوئی جماعت زندگی بسر کر رہی ہو، افرادِ انسانی پر اپنا عمل کرتے ہیں، لیکن افرادِ انسانی کی فطرت میں خود اس طرح کی لچک پائی جاتی ہے، کہ جہاں وہ خارجی ماحول سے اثر پذیر ہوتی ہے وہاں دوسری طرف وہ خود اپنی صلاحیت و استعداد کے مطابق کسی خارجی ماحول کو تلاش کر کے خود اس پر اپنا اثر کرتی ہے، خارجی موثرات انسانی فطرت کو اپنے رنگ میں رنگتے ہیں، اور انسانی فطرت خارجی موثرات کو وجود میں لاتی ہے، اور اس طرح "عمل" اور "ردعمل" دو مساوی قوتوں سے اثر پذیر ہو کر اجتماعِ انسانی ترقی کی جانب قدم بڑھاتا ہے، لیکن یہ ترقی ہمیشہ اسی طرح ظہور پذیر ہوتی ہے، کہ بیرونی مؤثرات اندرونی مؤثرات سے ٹکر کھاتے ہیں، اور اندرونی موثرات بیرونی موثرات سے، اور دونوں کے فعل و اثر سے ایک جدید ہیئتِ اجتماعی کا وجود ہوتا ہے، جو اگلی ہیئتِ اجتماعی سے بالکل مختلف ہوتی ہے، اور ان دو سوسائٹیوں کے درمیان جو زمانہ باہمی فعل و اثر میں گذرتا ہے، وہ گویا ان دونوں کے درمیان اتصال پیدا کرتا ہے، جس میں بوڑھی قومیں مٹتی اور نوجوان قومیں اُبھرتی ہیں، اور اس طرح قدرت اقوامِ عالم کو مٹا بڑھا کر ارتقاے تمدن و تہذیب کا فرض انجام دیتی ہے، یہ ہے انسانی ہیئتِ اجتماعی کا وہ فرض جس کو دنیا کی مختلف قومیں اپنی اپنی بساط کے موافق انجام دیتی ہیں، اور اپنے بعد والی قوموں کے لئے چھوڑ جاتی ہیں،

غرض انسانی ہیئتِ اجتماعی کے مختلف تغیرات پر عمیق نظر ڈالنے سے ہمکو نظر آتا ہی، کہ

۱۔ انسان کی تہذیب و تمدن کی ترقی کا بڑا دار و مدار ان خارجی اور اندرونی مؤثرات کے عمل اور ردِ عمل پر ہوتا ہی، جو انسان کی ہیئتِ اجتماعی پر اپنا اثر کرتے ہیں،

۲۔ ان مختلف موثرات کا یہ باہمی تاثر و تفاعل ان مختلف کیفیاتِ اجتماعی کی پیدائش کا باعث ہوتا ہے، جو مختلف اوقات میں پیدا ہوتی اور مٹتی رہتی ہیں،

۳۔ تغیرات کا یہ پورا سلسلہ چند قوانینِ فطری کی بنا پر عمل میں آتا ہی جو قوموں کی ترقی و انحطاط میں بہت بڑا اثر رکھتے ہیں،

پس انسان کی ہیئتِ اجتماعی کے مختلف تغیرات، اور ان تغیرات کے مختلف علل و اسباب سے جس علم میں بحث ہوتی ہی، اس کا نام علم الاجتماع ہی، قوموں کے مختلف تغیرات قوموں کی ترقی و تنزل کے قوانینِ نفسی، کیفیاتِ اجتماعی کی حقیقت، اور ان مختلف کیفیات اجتماعی کے علل و اسباب کی جستجو، قوموں کے حالات میں جو بیرونی موثرات تغیر پیدا کرتے ہیں، انکی تحدید اور اُن کا تعین، ان تمام مسائل سے بحث کرنا، علم الاجتماع کا فرض ہی، قوموں کی ترقی و تنزل کے کیا اسباب ہوتے ہیں ؟ قوموں کے لوازمِ تمدن میں کس طرح تغیر ہوتا ہے ؟ قوموں کے اختلاط و امتزاج کے کیا کیا اسباب ہوتے ہیں ؟ خارجی موثرات کتنے ہیں ؟ اُنکی کیا نوعیت ہی ؟ قوموں پر اُن کا کیا اثر ہوتا ہی ؟ یہ اور اسی قبیل کے دیگر سوالات، علم الاجتماع کے حدود میں داخل ہیں، علم تاریخ اور علم الاجتماع میں فرق یہ ہے کہ علم تاریخ میں واقعاتِ ماضیہ کے جزئیات سے بحث کیجاتی ہی، اور علم الاجتماع میں ان جزئی واقعات سے بحث نہیں ہوتی، بلکہ وہ ان واقعات پر یکجائی نظر ڈال کر انسانی ہیئتِ اجتماعی کے تغیرات کے علل و اسباب سے بحث کرتا ہی،

۴۔ لیکن انسانی ہیئتِ اجتماعی کے مختلف تغیرات کے عللِ قریبہ و بعیدہ سے مہذب ممالک میں جن بہترین دماغوں نے بحث کی ہے، اُنھوں نے بحث کرنے کے دو طریقے اختیار کئے ہیں، اور یہ دونوں طریقے وہی ہیں جو عموماً مختلف مصنفین دوسرے علوم میں بھی اختیار کرتے ہیں، مثلاً علم طب کو لو، علم طب سے بحث کرنے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ اغذیہ انسانی اور اغذیہ کے طبعی عمل، اور ہر ہر عضو کے قوانینِ صحت و قوانینِ مرض سے قطع نظر کر کے صرف اس بات سے بحث کیجائے، کہ فلاں فلاں مرض میں کون کون سی دوائیں مفید ہیں، اور فلاں فلاں مرض میں کون کون دوائیں مضر ہیں، اس طریقۂ بحث سے صرف دواؤں کی خاصیتوں کا علم ہوتا ہے، اور کسی مرض کو مان کر صرف اس مرض کے طرقِ ازالہ سے بحث کیجاتی ہے اس سے بحث نہیں ہوتی کہ یہ مرض پیدا کس طرح ہوا؟ اس مرض کے علامات کیا ہیں؟ اسباب کیا ہیں؟ پھر خود قوانینِ صحت و قوانینِ مرض کیا ہیں؟ غذا کا ہر ہر عضو پر کیا اثر ہوتا ہے؟ ان مباحث سے اس صورت میں بالکل بحث نہیں ہوتی، بخلاف اس کے دوسرا طریقۂ بحث جو ہے، وہ یہ ہے، کہ دواؤں کا اثر بتانے سے پیشتر اس بات سے بحث کیجائے کہ اعضاے انسانی کے وظائفِ عمل کیا کیا ہیں؟ ہر ہر عضو کی حالتِ صحت و حالتِ مرض کے حدود کیا ہیں؟ اعضاے انسانی میں کن کن اسباب سے مرض پیدا ہوتے ہیں؟ ان امراض کے علامات کیا ہوتے ہیں؟ انسانی غذا کی حقیقت کیا ہے؟ اعضاے انسانی پر غذا کا کیا اثر ہوتا ہے؟ امراض کو ادویہ اور اغذیہ سے کیا تعلق ہے؟ ادویہ کی کیفیت و کمیت سے مرض پر کیا اثر پڑتا ہے؟ غرض یہ اور اسی قبیل کے دیگر مسائل جو انسان کے حالاتِ صحت و مرض کے اسباب کا انکشاف کریں، اس دوسرے طرز میں ان سے بحث کیجاتی ہے، اور یہ دوسرا طرز پہلے طرز سے زیادہ عام و شامل اور جامع و مانع ہے،

بعینہٖ اسی طرح انسانی ہیئتِ اجتماعیہ سے بھی بحث کرنے کے دو طریقے ہیں، پہلا طریقہ یہ ہے، کہ ایک مخصوص ماحول فرض کر کے مخصوص کسی ہیئتِ اجتماعیہ کے متعلق یہ سوال کیا جائے کہ ان حالات کے اندر اس ہیئتِ اجتماعی پر فلاں واقعہ یا حادثہ کا کیا اثر پڑیگا' روس کے موجودہ حالات میں انقلابِ روس ملک کے لئے مفید ہی یا نہیں، ہندوستان کے موجودہ حالات کو دیکھتے ہوئے ہوم رول ہندوستان کیلئے مفید ہوگا یا مضر؟ چینی قوم کے موجودہ حالات کے لحاظ سے وہاں شخصی حکومت زیادہ بکار آمد ہوگی، یا جمہوریت؟ یہ اور اسی قبیل کے دیگر مسائل جن میں ہیئتِ اجتماعی کی ایک خاص حالت فرض کر کے مستقبل کے نتائج یا ان نتائج کی علتیں دریافت کیجائیں، ان سے بحث کرنا یہ ایک طرز ہی،

دوسرا طرز یہ ہے کہ بجائے اسکے، کہ پہلے ہیئتِ اجتماعی کے مخصوص حالات فرض کر کے یہ بات دریافت کیجائے، کہ فلاں واقعہ کا قوم پر کیا اثر ہوگا؟ یا ان حالات کے اندر فلاں فلاں واقعہ کی علت کیا ہی؟ بجائے اسکے پہلے اس بات سے بحث کیجائے کہ ہیئتِ اجتماعی پر جو مؤثرات اثر کرتے ہیں، انکی حقیقت کیا ہی؟ خود مخصوص خارجی حالات کس طرح پیدا ہوتے، اور قوم پر کس طرح اثر کرتے ہیں؟ اس دوسرے طریقہ میں یہ سوال نہیں ہوتا کہ فلاں فلاں حالات میں ہیئتِ اجتماعی پر فلاں فلاں واقعہ کا کیا اثر پڑیگا، بلکہ سوال یہ ہوتا ہی، کہ ہیئتِ اجتماعی کے لئے یہ مخصوص حالات خود کس طرح پیدا ہوئے؟ مظاہر تمدن اور کیفیاتِ اجتماعی کو کن مختلف اسباب نے پیدا کیا ہے، پھر اس سے بھی آگے بڑھکر انسان کی حیاتِ اجتماعی کی غرضِ معین کیا ہے، اور یہ غرض حاصل کس طرح ہوتی ہے؟ قوموں کے قوانینِ نفسی کیا کیا ہیں، جو قوموں کے حالات میں تغیر کرتے ہیں، علم الاجتماع سے بحث کرنے کا یہ دوسرا طریقہ ہے جو پہلے طریقہ سے

زیادہ عام وشامل اور پہلے طرز سے زیادہ مقبول ہی، اور زمانۂ حال کے جن فلاسفہ نے عِلم الاجتماع سے بحث کی ہی، انھوں نے عموماً یہی طرز اختیار کیا ہی، انگلستان میں مسٹر بکل نے سب سے پہلے تمدنِ انسانی کی تاریخ اسی طرز پر لکھی اور لیبان نے بھی اپنی کتاب "انقلاب الامم" میں علم الاجتماع سے اسی طرز کے مطابق بحث کی ہے، غرض علم الاجتماع سے بحث کرنے کے عموماً یہ دو طرز ہیں، جو فلاسفہ نے اختیار کئے ہیں، لیکن ان میں سے دوسرا طرز زمانہ حال میں زیادہ مقبول ہے،

یہاں تک سلسلۂ بحث میں ہم نے جتنے منازل طے کئے ہیں، ان کو یکجا طور پر ایک مرتبہ پیشِ نظر کر لو:-

۱- انسانی زندگی کی دو قسمیں ہیں ۱- حیاتِ انفرادی سے متعلق جتنے علوم ہیں، ان میں سے علم النفس میں ان مختلف تغیرات اور تغیرات کے علل واسباب سے بحث ہوتی ہی جو انسان کی ذہنی دنیا میں پیدا ہوتے ہیں، اور حیاتِ اجتماعی سے متعلق جتنے علوم ہیں، انمیں سے علم الاجتماع میں ان مختلف تغیرات اور تغیرات کے علل واسباب سے بحث ہوتی ہی، جو انسان کی ہیئتِ اجتماعیہ میں مختلف اوقات میں پیدا ہوتے ہیں،

۲- علم الاجتماع میں جن مسائل سے بحث ہوتی ہی، وہ مختصراً حسبِ ذیل ہیں:

انسانی اجتماع پر کون کون خارجی اور اندرونی موثرات اثر کرتے ہیں؟

انسان کے کیفیاتِ اجتماعی یا بالفاظِ دیگر لوازمِ تمدن کس طرح پیدا ہوتے ہیں؟

ان لوازمِ تمدن اور مختلف کیفیاتِ اجتماعی کے اندر تغیر و انقلاب کس طرح اور کن اصول پر ہوتا ہے؟

غرض وہ تمام امور جن کا تعلق انسان کی اجتماعی زندگی سے ہی، ان سے علم الاجتماع

میں بحث کیجاتی ہے،

۳۔ لیکن علم الاجتماع سے فلاسفہ نے عموماً دو طرز پر بحث کی ہے، اوّل یہ کہ چند مخصوص خارجی حالات کے اندر مختلف واقعات وحوادث کا جو اثر ہیئتِ اجتماعی پر ہوتا ہے اس کے علل واسباب دریافت کرنا، دوسرے یہ کہ خود ان خارجی حالات و موثرات کی حقیقت اور ان کی پیدایش کے علل واسباب سے بحث کرنا،

یہ علم الاجتماع کا ایک ہلکا سا خاکہ ہے جو صفحاتِ بالا میں بالاجمال درج کیا گیا،

(۲)

۱۔ صفحاتِ بالا میں علم الاجتماع کا جو ایک ہلکا سا خاکہ کھینچا گیا، اس سے غالباً علم الاجتماع کی حقیقت تو خوب ذہن نشین ہوگئی ہوگی اور یہ بھی معلوم ہوگیا ہوگا کہ مختلف فلاسفہ نے علم الاجتماع سے بحث کرنے کے کیا کیا طریقے اختیار کئے ہیں،

لیکن بیاناتِ بالا کے مطالعہ سے غالباً ناظرین کو یہ بھی معلوم ہوا ہوگا، کہ علم الاجتماع کو انسان کی نفسانی حیاتِ اجتماعی کیساتھ وہی نسبت ہے جو انسان کی فزیکل ہسٹری کو انسان کی حیاتِ جسمانی کے ساتھ ہے، یعنی گویا علم الاجتماع انسان کی اجتماعی زندگی کی تاریخ کا نام ہے، جس طرح علم جیالوجی (طبقات الارض) میں یہ بحث کیجاتی ہے کہ طبقاتِ ارض نے موجودہ شکل کس طرح حاصل کی؟ زمین میں کیا کیا تغیرات واقع ہوئے؟ اور ان تغیرات کے اسباب کیا ہیں، اسی طرح انسان کی فزیکل ہسٹری میں یہ بحث کیجاتی ہے کہ انسان کی پیدایش کس طرح ہوئی؟ انسان نے موجودہ ترقی کس طرح حاصل کی؟ مختلف اصنافِ انسانی کے مابہ الامتیاز کیا کیا چیزیں ہیں؟ انسان کے دورانِ ترقی میں انسان میں کیا کیا تغیرات ہوئے؟ اور ان تغیرات کے اسباب کیا ہیں؟ بعینہٖ اسی طرح علم الاجتماع میں جو بحث ہوتی ہے

وہ یہ ہے، کہ ہئیتِ اجتماعی کا وجود کس طرح ہوا؟ ہئیتِ اجتماعی نے موجودہ ترقی کس طرح حاصل کی؟ اور اس دوران میں کیا کیا تغیرات اس میں پیدا ہوے؟ اور ان تغیرات کے اسباب کیا ہیں؟ غرض جن فلاسفہ نے علم الاجتماع سے ابتک بحث کی ہے، ان کی بحث کا زیادہ حصہ اجتماعِ انسانی کی تاریخ سے متعلق رہا ہے، اور گویا اس لحاظ سے انسان کی نفسانی حیاتِ اجتماعی کیساتھ اس علم کو وہی نسبت ہوگی، جو فزیکل ہسٹری کو انسان کی حیاتِ مادی کے ساتھ یا جیالوجی کو جغرافیہ زمین کے ساتھ ہے،

لیکن یہ ظاہر ہے کہ جس طرح فزیکل ہسٹری سے صرف انسان کے ان مختلف ادوارِ مادی کا علم ہوتا ہے جس کو انسان نے طے کیا ہے، اسی طرح علم الاجتماع سے بھی محض واقعاتِ تاریخی کی حقیقت اور ان کے اسباب کا انکشاف ہوگا، اور جس طرح انسان کی حیاتِ انفرادی کے ادوار مادی اور ادوار نفسی کی حقیقت کا واقعی انکشاف اس وقت تک نہیں ہو سکتا، تاوقتیکہ اس کی حیاتِ انفرادی کے تمام عناصر و اجزار سے علٰحدہ علٰحدہ بحث نہ کیجائے اسکے خواصِ جسمانی کی تشریح، اسکے حالاتِ صحت و مرض، اسکے قویٰ و اعضائکے وظائفِ عمل اور انکی تشریح، اسکے دماغی قویٰ کی تفصیل، جذبات، احساسات، تصورات، افکار، عقائد، ارادہ ان تمام مظاہرِ دماغی کی توضیح و تشریح، جذبات کے انحطاط و زوال اور ترکیب و تقسیم کے قوانین، احساسات کی تحلیل اور تصور و احساس کے باہمی فروق، عقیدہ کی پیمایش اور زوال کے اسباب، تخیل کی وسعت اور اسکی پوری توضیح، فکر کرنے کے طریقے، صحیح و غلط فکر کی باہمی تمیز، قوتِ ارادی کے مظاہر وغیرہ، ان تمام مسائل سے جب تک باتفصیل بحث نہ کیجائے، اس وقت تک صرف انسان کی فزیکل ہسٹری جان لینے سے حیاتِ انفرادی کے تمام شعبوں کی تشریح نہیں ہو سکتی یہی وجہ ہے کہ انسان کی حیاتِ انفرادی سے جن علوم میں بحث ہوتی ہے، ان میں اعلیٰ درجہ علم تشریح

اور علم النفس کا ہے، علم تشریح میں اعصابِ جسمانی اور قویٰ و اعضاء کے وظائف اعمال سے بحث ہوتی ہی، اور علم النفس میں جذبات و کیفیاتِ نفسیہ اور انسان کے مظاہر دماغی سے،

پس اسی طرح انسان کی حیاتِ اجتماعی سے جب بحث کرنا ہو، تو کوئی علم ایسا ہونا چاہیئے جو علم النفس کی طرح مظاہر اجتماعی کی حقیقت کی تشریح کرتا ہو، اور جس میں یہ بتایا جائے کہ نفسِ اجتماعی کی حقیقت اور اس کے میزات کیا کیا ہیں، جماعت کے جذبات کی پیدائش کس طرح ہوتی ہی، جماعت میں کن کن جذبات کا ظہور ہوتا ہی، جماعت کے فکر کرنے کا کیا طرز ہی جماعت کو آمادۂ عمل کرنے کے لئے کون سے ذرائع اختیار کئے جاتے ہیں، جماعت کے کتنے اقسام ہیں اور ان اقسام کے باہمی میزات کیا کیا ہیں؟ جب تک ان مسائل سے بحث نہ کیجائے اسوقت تک گو علم الاجتماع سے اجتماعی زندگی کے انحطاط و زوال اور ان کے اسباب کی وضاحت تو ہو جائیگی، لیکن انسانی ہیئتِ اجتماعی کی حقیقت پر روشنی نہ پڑے گی،

علاوہ بریں اوپر معلوم ہو چکا ہی، کہ ہیئتِ اجتماعی کے تغیرات جن اسباب کے معلول ہوتے ہیں ان کی تحدید دو قسموں میں کی گئی ہے، مہیجاتِ بیرونی اور موثراتِ اندرونی، نیز یہ بھی معلوم ہو چکا ہے، کہ ان دو قسم کے موثرات میں باہم عمل اور ردِ عمل کا فعل جاری رہتا ہی، اور اس باہمی تاثر و تفاعل کے اثرات سے کیفیاتِ اجتماعی اور مظاہرِ تمدن کی پیدائش ہوتی ہی، نیز یہ کہ ان اندرونی موثرات کے اندر جو جو موثر شامل ہیں، اُنکا زیادہ حصہ جماعت کی خود اندرونی ترکیب سے تشکیل پاتا ہی، لیکن جماعت کی یہی اندرونی ترکیب نام ہی نفسِ اجتماعی کے مظاہر کے مجموعہ کا، جماعت کے جذبات، اس کے تصورات، اسکے اوہام، اسکے عقائد، ان ہی سب چیزوں کی ایک خاص ترکیب سے ہیئتِ اجتماعی کا جو ہیولیٰ تیار ہوتا ہی اسی کو نفسِ اجتماعی کہتے ہیں، اور اس نفسِ اجتماعی کے مظاہر سے جس علم میں بحث ہوتی ہی، اسکو

علم نفسیاتِ اجتماع کہتے ہیں، پس جب تک جماعت کی اندرونی ترکیب اور نفس اجتماعی کے مظاہر کی حقیقت کی تشریح نہ کیجائے، اس وقت تک جماعت کے ان اندرونی موثرات کی حقیقت واضح نہ ہوگی، جو اجتماعی تغیرات کی پیدائش میں خاص مداخلت رکھتے ہیں، اسلیئے علم الاجتماع کے مباحث کا ایک ضروری پہلو یہ بھی ہے، کہ اجتماعِ انسانی کی حقیقت سے بحث کیجائے اور یہ بتایا جائے، کہ محض افرادِ منتشر کا حالتِ اجتماع میں آجانا کن جدید نفسانی حالات کی پیدائش کا باعث ہوتا ہی، اور یہ پہلو علم الاجتماع کے لئے اتنا ضروری ہی کہ بلا اس کے علم الاجتماع کی تکمیل کسی طرح نہیں ہوسکتی،

پس حاصل یہ ہے کہ فلاسفہ نے علم الاجتماع سے بحث کرنے کے جو طریقے اختیار کئے ہیں، ان کا تعلق زیادہ تر اجتماعِ انسانی کی تاریخ سے ہے، اور اسکو فلسفۂ تاریخ کہنا زیادہ موزوں ہوگا، لیکن اس سلسلہ میں کبھی اس بات سے بحث نہیں کی گئی کہ خود انسانی اجتماع کی حقیقت کیا ہی، اور نفسِ اجتماعی کے مظاہر کیا کیا ہیں؟

۲- یہی نقطۂ بحث ہے جس کو سب سے پہلے مہذب ممالک میں لیبان نے دریافت کیا، لیبان نے پہلے مدتوں مختلف ممالک میں سیاحت کی، مختلف قوموں کے عادات، اطوار خو بو، اور ان کے آئینِ قومی دریافت کئے، اور ایک مدت تک مختلف قوموں اور مختلف جماعتوں میں رہکر اس نے جماعتوں کے طریق کار اور حیاتِ اجتماعی کے ایک ایک شعبہ سے واقفیت حاصل کی، اور اس کے بعد علم نفسیاتِ اجتماع کو مدون کیا،

علم نفسیاتِ جماعت کو لیبان نے جس طرز پر مرتب کیا ہی اس میں لیبان کو دیگر علماء سے چند باتوں میں خاص خاص امتیاز حاصل ہی، اور چونکہ لیبان کے علاوہ کسی مصنف کی کوئی دوسری کتاب ایسی موجود نہیں ہے، جس میں مستقل طور پر صرف نفسیاتِ جماعت سے بحث ہو اسلئے

ہم لیبان کے خصوصیات کو اسی کے اوراق سے لیکر ذیل میں بیان کرتے ہیں:

۱۔ لیبان کی سب سے بڑی خصوصیت جس میں تمام علماء پر اسکو فوقیت حاصل ہو یہ ہو کہ علم الاجتماع کے اس پہلو پر مہذب ممالک میں سب سے پہلے اُسی نے قلم اٹھایا، گو امریکہ اور انگلستان کے بعض علمانے بھی اس پہلو پر نظر ڈالی ہو لیکن اس پہلو کو انھوں نے کوئی خاص اہمیت نہیں دی ہو، بلکہ عام علم النفس کے ضمن میں جابجا علم الاجتماع کے اس پہلو پر بھی نظر ڈال گئے ہیں، نفسیاتِ جماعت پر مستقل طور پر نظر ڈالنا، اور اصول و فروع کو ترتیب دینا اور بات ہے، اور کسی خاص بحث کے ضمن میں اس پہلو پر بھی بحث کرنا اور بات ہے،

خود لیبان کو علماء سے یہ شکایت ہو کہ اُنھوں نے علم الاجتماع کے اس پہلو کیجانب کیوں خاص توجہ نہیں کی، چنانچہ ایک مقام پر کہتا ہے ؛۔

"جماعتوں کا بیان بڑھتے بڑھتے طویل ہو گیا، حالانکہ ہمیں ان کی بابت بہت تھوڑا علم ہو، بات یہ ہو کہ جن لوگوں نے علم النفس کی جانب توجہ کی ہو، وہ جماعتوں سے کنارہ کش رہے، اور اسی لئے ہمیشہ ان کے حالات سے ناواقف رہے"

پھر دوسری جگہ کہتا ہے ؛۔

"جماعت کے نفسانی حالات کے متعلق ہماری بحث بہت مختصر اور بطور سابقہ تصانیف کے خلاصہ کے ہو گی، اور ناظرین ان ہی مسائل سے واقف ہو سکیں گے، جو اس فن کے ابتدائی مسائل ہیں، کیونکہ میری حالت تو یہ ہے کہ میں نے ایک ایسی زمین پر قدم رکھا ہے، جو ایک مدت سے بنجر چھوڑ دی گئی تھی، اسلئے میں تو تمام فروع و اصول کا استقصار نہیں کر سکتا، البتہ دوسرے لوگوں کو چاہئے کہ ان مسائل میں خوب غور و خوض کر کے اصول و فروع کو ترتیب دیں"

لیبان کو علمائے علم النفس سے یہ شکایت ہے جس کا اظہار اُس نے اپنی کتابوں میں متعدد مقامات پر کیا ہے، حالانکہ لیبان کہتا ہے کہ اس علم کے فوائد بے شمار ہیں، اس علم کے جن فوائد کو لیبان نے گنوایا ہے، وہ حسب ذیل ہیں:

۱۔ اس علم کا سب سے ادنیٰ فائدہ تو یہ ہے کہ "علم شے بہ از جہل شے"۔

لیبان کہتا ہے:۔

"جماعت کے نفسانی حالات کا معلوم کرنا بے حد ضروری ہے، خواہ ہم اس کا عملی حصہ حاصل کریں، یا صرف واقعات کی حقیقت دریافت کرلیں، بہر حال جس طرح علم زراعت کی واقفیت کسی قدر فائدہ مند ہوتی ہے، اسی طرح انسان سے جو افعال صادر ہوتے ہیں، ان کے اسباب کا دریافت کرنا بھی فائدہ سے خالی نہیں"۔

یہ ایک عام فائدہ ہے لیکن اس علم کا دوسرا بڑا فائدہ جو ہے، وہ یہ ہے کہ

۲۔ بہت سے واقعاتِ تاریخی ایسے ہیں جن کے علل و اسباب کا اس وقت تک پتہ نہیں چلتا، تاوقتیکہ جماعتوں کے نفسانی حالات سے واقفیت نہ پیدا کیجائے، علم نفسیاتِ جماعت کا یہ فائدہ مبنی ہے اسی اصول پر جس کو ہم ایک ہی آدھ صفحہ اُدھر لکھ آئے ہیں، اور وہ یہ ہے، کہ ہیئتِ اجتماعی کے تغیرات میں جن اسباب و موثرات کو دخل ہوتا ہے، ان میں سب سے زیادہ اہمیت اندرونی موثرات یعنی ہیئتِ اجتماعی کی اندرونی ترکیب کو حاصل ہوتی ہے، اور یہ اندرونی ترکیب عبارت ہے جماعت کے خیالات، جذبات و افکار وغیرہ سے جو نفسِ اجتماعی کے مظاہر ہیں، پس جب کسی ہیئتِ اجتماعی کے تغیرات کے اسباب دریافت کرنا ہوں، تو پہلے خود اس ہیئتِ اجتماعی کی اندرونی ترکیب اور اسکے نفسانی حالات

کی جستجو کرنا چاہیئے کہ بغیر ان نفسانی حالات کا علم حاصل کئے ہوئے، اس ہیئت اجتماعی کے تغیرات کے اسباب سے واقفیت نہیں ہوسکتی،

موسیو لیبان نے علم نفسیات اجتماع کے اس خاص فائدہ کو اپنی کتاب میں بہت اہمیت دی ہے، چنانچہ ایک مقام پر لکھتا ہے :-

"اس علم سے ایسے بے شمار اخلاقی اور اجتماعی واقعات کی توجیہ ہو جاتی ہے جنکی حقیقت سے واقف ہونے کا اور کوئی ذریعہ نہیں ہے"

ان دو فوائد کے علاوہ اس علم کا تیسرا بڑا فائدہ یہ ہے کہ

۳۔ مختلف جماعتوں کی قیادت، بلا اس کے کہ جماعت کے نفسانی حالات سے واقفیت پیدا کیجائے، ناممکن ہے، اس لئے خاص کر ان لوگوں کو اس علم کیجانب زیادہ توجہ کرنا چاہیئے، جن کے ہاتھوں میں مختلف قوموں کی زمام سیاست ہوتی ہے، اور جن کا ایک اشارہ قوموں کے حالات میں عظیم الشان تغیر پیدا کر دیتا ہے،

لیبان کہتا ہے :-

"جماعتوں کے نفسانی حالات سے واقف ہونا اس زمانہ میں اس قدر ضروری ہوگیا ہے، کہ ہر بڑے سے بڑا سیاست داں اس جانب خاص توجہ کرتا ہے، نہ اسلیے کہ اس ذریعہ سے وہ جماعت پر اپنی حکومت اور سیادت قائم کرے، کیونکہ یہ بہت مشکل ہے، بلکہ اسلیئے کہ اس ذریعہ سے وہ جماعت کے زور کو گھٹا سکے"

اور یہی سبب ہے کہ لیبان دوسرے موقع پر کہتا ہے :-

"حالانکہ وہ لوگ جنھوں نے دنیا پر حکومت کی ہے اور جن کے ہاتھوں میں اقوام و ممالک کی عنانِ حکومت رہی ہے، بانیانِ مذاہب سے لیکر بانیانِ حکومت تک،

اور پیغمبرانِ مذاہب سے لے کر سیاست داں مدبرین تک حتیٰ کہ وہ لوگ بھی جو چھوٹے چھوٹے قبائل کے سردار رہے ہیں، یہ سب ہمیشہ علم النفس کے ماہر ہوئے ہیں۔"

لیبان کہتا ہے کہ جماعت کی قیادت وہ شخص نہیں کر سکتا جو جماعت کے نفسانی حالات سے واقف نہ ہو، جس کو یہ نہ معلوم ہو کہ جماعت کو کس طرح اثر پذیر کرنا چاہیئے، خطیبانہ انداز کا جماعت پر کتنا اثر پڑتا ہے، غیر معقول دلائل سے جماعت کس طرح اثر پذیر ہوتی ہے، بعض خاص الفاظ اور جملے کسی جماعت میں کس بنا پر مقبول ہوتے ہیں، اور بعض خاص الفاظ اور جملوں کو بسا اوقات جماعت کیوں ناپسند کرتی ہی، جس شخص کو ان تمام امور کا علم نہ ہو، وہ ہرگز قیادت کی صلاحیت نہیں رکھتا، اسلیئے جب کسی قوم کی عنانِ سیاست اپنے ہاتھ میں لینا ہو تو سب سے پہلے جماعت کے ان نفسانی حالات کا علم حاصل کرنا چاہیئے،

غرض یہ اس علم کے چند مختصر سے فوائد ہیں، جن کو لیبان نے جابجا اپنی کتابوں میں ذکر کیا ہے اور اس بات پر حیرت کی ہی کہ باوجود ان فوائد کے علمائے علم النفس اس فن سے کیوں اسقدر بیگانہ نظر آتے ہیں۔

۲- دوسری بڑی خصوصیت لیبان کی یہ ہی کہ جن لوگوں نے علم الاجتماع سے بحث کی ہی انھوں نے ان موثرات میں جو ہئیتِ اجتماعی پر اثر کرتے ہیں، قوموں کے نظامِ اخلاق اور مذہب کے اثر کو بہت کم اہمیت دی ہی، بلکہ اکثروں نے تو سوسائٹی کے موثرات میں نظامِ اخلاق اور مذہب کو شمار ہی نہیں کیا ہی، لیکن بخلاف اس کے لیبان نے نظامِ اخلاق اور مذہب کے اثر کو بہت زیادہ اہمیت دی ہے، بلکہ قوموں کے مزاجِ عقلی کی تکوین کا بھی مدار اس نے اپنی دوسری کتاب "انقلاب الامم" میں اسی نظامِ اخلاق ہی پر رکھا ہی، اور اپنی دوسری کتاب "روح الاجتماع" جس کا ترجمہ آیندہ صفحات میں ناظرین کے پیش نظر ہی اس کی ایک خاص فصل میں مذہب کے اثر سے اس نے بحث کی ہی نظامِ اخلاق کے اثر سے علمائے علم الاجتماع نے جو غفلت برتی ہی، اسکے بابت لیبان

اپنی دوسری کتاب "انقلاب الامم" میں ایک موقع پر لکھتا ہی :۔

"جن ماہرینِ علم النفس نے نفسیاتِ اجتماع سے بحث کی ہے، ان کے ضعفِ نتائج کا بڑا سبب یہ ہے کہ انھوں نے اپنے مباحث کو صرف عقلی مسائل پر محدود کر لیا ہے اور قوموں کے نظامِ اخلاق سے بالکل بحث نہیں کی ہے، میں کسی ایسے شخص سے واقف نہیں، جس نے نظامِ اخلاق کی اہمیت سے بحث کی ہو بجز موسیو پولهان اور ایم ریبو کے کہ ان دونوں نے اس جانب تھوڑی سی توجہ کی ہے"۔

عموماً فلاسفہ نے سوسائٹی کے مؤثرات میں ان چیزوں کو داخل کیا ہی جو مادی حیثیت سے جماعت پر اثر کرتی ہیں، ملک کی آب و ہوا، ماحول اور اسی قسم کے دیگر موثرات کو ان کے نزدیک زیادہ اہمیت حاصل ہی، اور وہ واقعات کی توجیہ جو کرتے ہیں، تو محض مادیین کے اصول پر، حالانکہ لیبان کہتا ہے، کہ ان ظاہری اسباب کے پیچھے اس قدر کثرت سے چھپے ہوئے مؤثرات ہوتے ہیں، جن تک عقلِ انسانی کی رسائی ہی نہیں ہو سکتی،

چنانچہ لیبان روح الاجتماع میں ایک مقام پر لکھتا ہے :۔

"زمانہ حال کے بعض مورخین خصوصاً موسیو ٹائن انقلابِ فرانس کے بعض واقعات کی توجیہ کرنے میں جو ناکامیاب رہے، اس کا باعث بجز اس کے کچھ نہیں معلوم ہوتا کہ موسیو ٹائن نے جماعت کے نفسانی حالات سے واقفیت پیدا کرنے کی کوشش نہیں کی، بلکہ ان مشکل مباحث میں بھی اس نے مادیین کا وہی طرز اختیار کیا جو عموماً واقعات کی توجیہ کرتے وقت وہ اختیار کرتے ہیں، مادیین اخلاقی قوتوں سے بہت کم بحث کرتے ہیں، حالانکہ ان ہی قوتوں کی بنیاد پر تاریخ کی عمارت تعمیر ہوتی ہے"۔

پھر اس کے بعد ایک خاص فصل میں لیبان نے دعویٰ کیا ہے کہ جماعت کے اعمال وافعال پر مذہب کا بہت بڑا اثر ہوتا ہے، جس سے انکار کرنا واقعہ سے انکار کرنا ہے، اس فصل کے آخر میں لیبان ایک مقام پر لکھتا ہے :-

"پس مذہب کو جماعت کے مشاعر و احساسات اور اعمال وافعال پر جو تسلط اور غلبہ حاصل ہے، اس کی بنا پر میرا یہ خیال ہے، کہ کوئی شخص اہم تاریخی واقعات کی حقیقت کو اس وقت تک بتمام و کمال نہیں سمجھ سکتا، تاوقتیکہ وہ ان دینی معتقدات سے واقفیت نہ پیدا کرلے، جو ان واقعات کی آڑ میں جماعت کی قیادت کرتے ہیں، پھر بعض تاریخی واقعات تو ایسے گذرے ہیں، جن کی توجیہ جماعت کے عقائدی پہلو کے علاوہ کسی اور پہلو سے ہو ہی نہیں سکتی، یہی وجہ ہے، کہ موسیو ٹائن نے جو ایک زبردست فلسفی مورخ گذرا ہے، گو واقعۂ انقلابِ فرانس کی تاریخ لکھتے ہوئے اس واقعہ کے تمام جزئیات پر مورخانہ اور محققانہ نظر ڈالی ہے، لیکن چونکہ اُس نے جماعتوں کی اس نفسانی حقیقت کو کہ جماعتیں ہمیشہ مذہبی جذبہ کی محکوم ہوتی ہیں نظر انداز کردیا، اسلئے بعض واقعات کے اسبابِ علل دریافت کرنے میں وہ ناکام رہا"

حاصل یہ ہے کہ لیبان کے نزدیک جماعتوں اور قوموں کے تغیرات جن نفسانی موثرات کے معلول ہوتے ہیں، ان میں قوموں کے مذہب اور ان کے نظامِ اخلاق کے اثر کو بڑی اہمیت حاصل ہے، اور اس اہمیت کو یا تو بعض فلاسفہ اور مورخین نے بالکل نظر انداز کردیا ہے، اور یا اگر اس کی جانب کسی نے توجہ بھی کی ہے تو محض سطحی توجہ کی ہے، لیبان زمانۂ حال میں پہلا فلسفی ہے، جس نے ان نفسانی موثرات سے نہایت شرح و بسط کے ساتھ اپنی کتابوں میں بحث کی ہے،

۳۔ تیسری بڑی خصوصیت لیباںؔ کی یہ ہے کہ اول تو لیباںؔ کے پہلے کسی مصنف نے نفسیاتِ جماعت کے موضوع پر جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں، مستقلاً قلم اٹھایا ہی نہیں اور اگر قلم اٹھایا بھی ہی، تو محض اس پہلو پر اٹھایا ہے، کہ جماعت سے مجرمانہ افعال کا صدور کیوں ہوتا ہے، یعنی یہ کہ جن جرائم کے ارتکاب سے انسان انفرادی حالت میں ہچکچاتا ہی، ان افعال کے ارتکاب پر اجتماعی حالت میں اوس کو کیونکر جرأت ہوتی ہے، اور پھر اس موضوع پر بھی جن لوگوں نے کچھ لکھا ہی، وہ ججوں کی ایک جماعت ہی جنھوں نے عدالتوں کی کرسیوں پر بیٹھ کر صدہا مقدمات اس قسم کے فیصل کئے ہیں، اور اپنے اسی تجربہ کی بنا پر انھوں نے اعداد و شمار سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ جماعت صرف مجرمانہ افعال کا ارتکاب کر سکتی ہی۔

لیباںؔ اس کے متعلق روح الاجتماع میں ایک مقام پر لکھتا ہی:

"البتہ تھوڑے دنوں سے ان کو کچھ اس جانب توجہ ہوئی ہی مگر اب بھی ان کی نگاہ جس حیثیت سے جماعتوں پر پڑتی ہی، وہ یہ ہی کہ جماعتیں ناروا افعال اور جرائم کا ارتکاب کرتی ہیں، بلاشبہہ یہ صحیح ہے، کہ دنیا میں جرائم پیشہ جماعتیں بھی پائی جاتی ہیں، لیکن ان کے ساتھ دنیا میں نیک چلن اور بہادر جماعتیں بھی ہین، پس جماعتوں کو صرف ارتکابِ جرائم کی نگاہ سے دیکھنے کا یہ مطلب ہوگا، کہ ہم کسی شے پر صرف ایک حیثیت سے نظر ڈالیں، لیکن یہ ظاہر ہے کہ جس طرح کسی شخص کے صرف ظاہری عیوب دیکھ لینے سے اس کے پورے اوصاف اور پورے حالات کا علم نہیں ہو سکتا، اسی طرح صرف اس بات کی واقفیت سے کہ جماعت کبھی ارتکابِ جرائم کرتی ہی، جماعت کے پورے حالات کا علم نہیں ہو سکتا۔"

پھر دوسری جگہ لیباںؔ کہتا ہے:۔

"جن علمائے نے اس علم کی جانب توجہ کی ہے، ان کے مباحث زیادہ تر جماعت کی مجرمانہ حیثیت سے متعلق ہیں، لیکن میں نے اس موضوع پر صرف ایک فصل میں بحث کی ہے اور وہ بھی مختصر ہے، اسلئے میں مناسب سمجھتا ہوں کہ ناظرین کو ایم ٹارڈ اور موسیو سیگل کے اس رسالہ کی جانب توجہ دلاؤں جس کا نام "جماعاتِ جارحہ" ہے اور خصوصیت سے اسلئے زیادہ ان کتابوں کیجانب توجہ دلانے کی ضرورت ہے، کہ میں نے جماعت کے قوائے عقلی کے متعلق جو خیالات ظاہر کئے ہیں، وہ ان دونوں مصنفوں کے خیالات کے برعکس ہیں۔"

پھر اس کے بعد لیبان نے جہاں پر جماعت کے اخلاق سے بحث کی ہے، وہاں نہ صرف یہ بتایا ہے کہ جماعت سے بسا اوقات محاسنِ اخلاق کا ظہور اور نیک افعال کا صدور بھی ہوتا ہے، بلکہ اس کے ساتھ اُس نے ان لوگوں کی غلطی کا سبب بھی بتا دیا ہے، جو جماعت پر صرف اسکی مجرمانہ حیثیت سے نظر ڈالتے ہیں:۔

چنانچہ لیبان کہتا ہے:۔

"بعض ماہرین نفسیات نے جو جماعت پر صرف اسکی مجرمانہ حیثیت سے نظر ڈالتے ہیں، مطلقاً یہ حکم جو لگا دیا ہے کہ جماعت کے اخلاق ہمیشہ انحطاط پذیر ہوتے ہیں، اس کا باعث صرف یہ ہے کہ اُنھوں نے جماعت کے اخلاق پر یکرخی نظر ڈالی ہے یعنی انھوں نے صرف یہ دیکھ لیا، کہ وہ شر و فساد کے جانب زیادہ مائل ہوتی ہے اس بنا پر انھوں نے کہدیا کہ جماعت ہمیشہ بد اخلاق ہوتی ہے۔"

پھر اس کے بعد جماعت کے اخلاق کی بابت لیبان یہ دعوی کرتا ہے، کہ

"تاریخ کے مطالعہ سے ثابت ہوتا ہے کہ افراد نے نہیں، بلکہ جماعتوں ہی نے نزاہت علم و عمل، اور عظائم اعمال کی مسلّم الثبوت مثالیں پیش کی ہیں۔"

یہ تو لیبان کا عام دعویٰ ہے، کہ جماعت کے اخلاق بسا اوقات پاکیزہ بھی ہوتے ہیں
لیکن جس خاص فصل میں اس نے جماعت کی مجرمانہ حیثیت سے بحث کی ہے اور جرائم پیشہ جماعتوں
کی سائیکالوجی لکھی ہے، وہاں دیگر مصنفین کے خلاف اُس نے نہایت بلند آہنگی کیساتھ یہ
بھی دعویٰ کیا ہے کہ جماعت سے درحقیقت کبھی مجرمانہ افعال کا صدور نہیں ہوتا، یوں
قانون کی نظر میں خواہ ان کے افعال جرم کی حد کے برابر آجاتے ہوں، لیکن فلسفیانہ نقطۂ نظر
سے انکے افعال پر جرم کا اطلاق کرنا صحیح نہیں ہے،

لیبان کہتا ہے:-

"یہ صحیح ہے کہ جماعت کے بعض افعال، بعض اوقات جرم کی حد کے اندر آجاتے ہیں
لیکن یہ جرائم اسی طرح کے ہوتے ہیں، جس طرح ایک درندہ جانور جرائم کا ارتکاب کرتا ہے اور
اور باوجود اسکے درندہ کو کوئی مجرم نہیں کہتا، بات یہ ہے کہ جماعت سے جو جرائم سرزد
ہوتے ہیں وہ کسی ہیجِ شدید کی بدولت اس سے وقوع میں آتے ہیں، اور اس ہیجِ شدید سے متاثر
ہو کر جب افراد ان جرائم کا ارتکاب کرتے ہیں، وہ یہ نہیں سمجھتے کہ وہ جرائم کا ارتکاب کر رہے
ہیں بلکہ وہ یہ سمجھتے ہیں، کہ وہ ایک واجب یا فرض ادا کر رہے ہیں، اور ظاہر ہے
یہ شان مجرموں کی نہیں ہوتی۔"

غرض لیبان نے اس کتاب میں درجہ بدرجہ ثابت کر دیا ہے کہ اصل میں جماعت کیجانب
مجرمانہ افعال کا ارتکاب کرنا ہی غلط ہے، اور خاص کر جن لوگوں نے جماعت پر محض مجرمانہ
حیثیت سے نظر ڈالی ہے، ان کی غلطی نہ صرف اتنی ہے کہ انھوں نے جماعت کی جانب مجرمانہ افعال
کا ارتکاب کیا، بلکہ اُنھوں نے اس مسئلہ پر یکرخی نظر ڈالی ہے، یہ لیبان کی خاص تحقیق ہے
جس میں وہ دیگر علمائے یورپ کے مقابل میں منفرد ہے،

لیبان کی یہ چند خصوصیات ہیں جنمیں وہ تمام متقدمین اور متاخرین علمائے علم النفس پر خاص فوقیت رکھتا ہے، اور جن کو اُس نے اپنی کتابوں میں جابجا خود ذکر کیا ہے، ان خصوصیات کا لحاظ کرتے ہوئے، غالباً لیبان کا یہ دعویٰ کہ نفسیاتِ اجتماع پر مستقل حیثیت سے اسکے پہلے کسی نے قلم نہیں اٹھایا، کچھ بیجا نہیں ہے، پھر لیبان کے نظریات اپنی جگہ پر خواہ کتنے ہی مکمل ہوں، لیکن اسکی تصنیفات اس قدر جا و بیجا تکرار اور حشو و زوائد سے مملو ہیں، کہ بعض جگہ تکرار کی بدولت مطالعہ کرنے والے کی طبیعت میں انتشار پیدا ہو جاتا ہے، مگر اس سقم کیساتھ یہ بھی پیش نظر رکھو کہ لیبان ہی پہلا شخص ہے جس نے اس موضوع پر سب سے پہلے مستقل حیثیت سے قلم اٹھایا ہے اور اسکے پیشتر جن لوگوں نے اس موضوع پر بحث بھی کی تو اُن کے نتائج اور بحث اسقدر ناقص اور خلاف واقعہ تھے کہ اس موضوع پر لکھتے وقت لیبان کو ان نتائج سے قطع نظر کرکے علم کے مبادی اور مسائل کو نئے سرے سے خود ترتیب دینا پڑا، اور ہر مسئلہ کے اصول و فروع خود لیبان ہی نے ترتیب دیئے، پس ان تمام امور کا لحاظ کرنے کے بعد لیبان کی تصنیفات کی اہمیت بہت زیادہ بڑھ جاتی ہے، اور علمائے یورپ میں لیبان ایک خاص امتیاز کا مستحق ٹھہرتا ہے،

(۳)

لیکن اس سلسلہ میں اگر ہم علمائے یورپ سے قطع نظر کرکے اسلامی لٹریچر اور علمائے اسلام کی تصنیفات پر بھی ایک نظر ڈال کر یہ دیکھیں کہ آیا اسلامی لٹریچر میں بھی علم نفسیاتِ جماعت کے متعلق کچھ مواد مل سکتا ہے یا نہیں تو یہ بہت زیادہ دلچسپ بات ہوگی، صفحاتِ بالا میں یہ خوب اچھی طرح ثابت ہو گیا ہے کہ علم الاجتماع سے جس ترتیب اور جس طرز سے لیبان بحث کی ہے، اس حیثیت اور اس طرز سے لیبان کے پہلے کسی مصنف نے اس علم پر نظر نہیں ڈالی، اسلئے اب اس بحث میں ہمارے لئے نہایت آسانی ہو گئی ہے، اب ہم لیبان

ہی کے نظریات کو لیکر اسلامی لٹریچر میں ان لٹریچر میں ان نظریات کو تلاش کرتے ہیں،
لیبان نے اپنی کتاب کو تین ابواب پر تقسیم کیا ہے، پہلے باب میں اس نے جماعت کے
اوصافِ عمومی سے بحث کی ہے، اور اس باب کو تین فصلوں میں پھیلایا ہے پہلی فصل میں
جماعت کے ممیزات عمومی سے بحث ہے، دوسری فصل میں جماعت کے جذبات ہیں تیسری
فصل میں جماعت کے قوائے عقلی سے اور چوتھی فصل میں مذہب ہے لیبان کا طرزِ استدلال اپنے نظریات
میں یہ ہے کہ چونکہ اجتماعِ انسانی انسان کے عہدِ طفولیت کا ورثہ اور اسکی ابتدائی تاریخ کی یادگار ہے
اسلئے جو اوصافِ جذبی و عقلی انسان کے عہدِ طفولیت میں افراد میں پائے جاتے ہیں، انہی کا ظہور
انسان کی حالتِ اجتماعی میں بھی ہوتا ہے، اور چونکہ جماعت کیفیتِ نیم شعوری کا مکمل مظہر ہوتی
ہے اسلئے حالتِ اجتماع میں آکر افراد کی عقلی خصوصیتیں ماند پڑجاتی ہیں، اور حالتِ اجتماع
میں ارسطو کے بھی ہوش و حواس گم ہوجاتے ہیں، اور عام افراد کی طرح بہکی بہکی باتیں کرنے
لگتا ہے، اثر پذیری، ضعفِ عقلی، تلون مزاجی، مبالغہ پسندی اور غیظ و غضب، یہ تمام اوصاف
جو ناقص العقل افراد کی خصوصیتیں ہیں، حالتِ اجتماع میں آکر یہی سب اوصاف تمام افراد میں پیدا
ہوجاتے ہیں، اور چونکہ جماعت میں آکر افراد کی عقل کند ہوجاتی ہے اسلیے جماعت میں استدلال کرنے
کی بھی صلاحیت نہیں رہتی، البتہ قوتِ تخیل ترقی کرجاتی ہے اور قوائے عقلی بے حس و حرکت ہوجاتے ہیں،

پس اس صورت میں جو شخص جماعت کو اثر پذیر کرنا چاہتا ہے، اس کو چاہئے کہ جماعت
کو اثر پذیر کرنے کے لئے حسبِ ذیل وسائل اختیار کرے:۔

۱۔ استدلال سے گریز،

۲۔ تمثیل بیانی یعنی کسی واقعہ کو تشبیہات اور استعارات کی صورت میں بیان کرنا،

۳۔ بعض خاص الفاظ جو جماعت کے نزدیک پسندیدہ ہیں، انکو زیادہ استعمال کرنا اور

جو الفاظ اور جملے جماعت ناپسند کرتی ہے، ان کے استعمال سے حتی الامکان احتراز کرنا،

۴- جماعت کو آمادہ عمل اور اثر پذیر کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس کے مذہبی عقائد یا موروثی خیالات سے زیادہ استدلال کیا جائے،

۵- مدعیانہ اور تحکمانہ طرز خطابت،

۶- الفاظ اور معانی کی تکرار،

یہ وسائل ہیں، جن سے جماعت اثر پذیر ہوتی ہے، اور جن سے عموماً خطبا اور قائدین جماعت کام لیتے ہیں، یہ دو ابواب کا خلاصہ ہے، اس کے بعد تیسرے باب میں جماعت کے اقسام سے بحث کی ہے، اور اس میں زیادہ تر نظریاتِ سابقہ کو جماعت کے اقسام پر منطبق کیا ہے، یہ لیبان کے طرز بیان کا ایک تقریبی خلاصہ ہے،

پس لیبان کے نظریات پر اگر ایک غائر نظر ڈالی جائے، تو بہت آسانی سے یہ پتہ چل جاتا ہے کہ لیبان جس علم کو علمِ نفسیاتِ جماعت کہتا ہے، اور جو نظریات علم نفسیات جماعت کے اس نے ترتیب دیئے ہیں، انہیں کا اکثر حصہ علم خطابت سے متعلق ہے، خطیب کو کن الفاظ اور جملوں کا استعمال کرنا چاہیئے؟ خطیب کو استدلال کا کیا طریقہ اختیار کرنا چاہیئے؟ جماعت کو اثر پذیر کرنے کے کیا طریقے ہیں؟ تحکمانہ طرزِ ادا اور تکرار کا جماعت پر کیا اثر پڑتا ہے؟ استعارات اور تشبیہات جماعت کو کس طرح اثر پذیر کرتے ہیں؟ یہ اور اسی قسم کے دیگر سوالات کا تعلق علم خطابت سے ہے،

لیکن فرق یہ ہے کہ علم خطابت میں ان مسائل سے جو بحث ہوتی ہے، تو اسلئے کہ علم خطابت کا موضوع ہی یہی ہے کہ الفاظ اور جملوں سے جماعت کس طرح اثر پذیر ہوتی ہے تو گویا علم خطابت میں ان مسائل سے اصلاً و بالذات بحث ہوتی ہے، اور علم نفسیاتِ جماعت میں

ہیئتِ اجتماعی کے عام موثرات کے ضمن میں ان خطابی مسائل سے بھی بحث ہو جاتی ہے یہی وجہ ہو کہ لیبان نے گو اپنی کتاب میں علم الخطابت کے بعض مسائل سے بحث تو کی ہو لیکن علم خطابت کے مسائل کا استقصا، نہیں کیا ہے،

غرض لیبان کے نفسیاتِ جماعت میں جن ابواب کو زیادہ اہمیت حاصل ہے، وہ دو ہیں:

۱۔ جماعت کے جذبات و قوائے عقلی کی تشریح،

۲۔ معتقداتِ جماعت کے موثرات، اسی ضمن میں اُس نے بعض ان مسائل سے بھی بحث کی ہو، جن سے علمِ خطابت میں بھی بحث ہوتی ہے،

ان نظریات میں جتنا حصہ ایسا ہے، جو علم خطابت سے تعلق رکھتا ہو، اس کا غالب حصہ اسلامی لٹریچر میں شرح و بسط کے ساتھ موجود ہو، ابن سینا نے شفا میں اور علمائے ادب اور دیگر منطقیین نے خطابت پر مستقل طور پر لکھا ہے، لیکن جیسا کہ ہم نے اوپر بیان کیا کہ لیبان کی غرض ان مسائل کے بیان کرنے سے علم الخطابت پر کچھ لکھنا نہ تھا، بلکہ لیبان کے مباحث میں نفسِ اجتماعی کے مظاہر عقلی و فکری وغیرہ سے بحث کرنا زیادہ تر ملحوظ ہو، اسلئے علم خطابت کی کتابوں میں یہ مسائل اگر شرح و بسط کیساتھ مذکور ہیں، تو اس سے علم نفسیاتِ اجتماع میں کوئی مزید اضافہ نہیں ہوتا، اور اسلئے ہمارے نزدیک علم خطابت کے مسائل سے لیبان کے نظریات کو تطبیق دینا یا لیبان کے نظریات کی تائید میں علم خطابت کی کتابوں سے شواہد پیش کرنا بالکل بے فائدہ ہے،

البتہ یہ ضرور ہو کہ ابن سینا نے شفا میں خطابت پر جو کچھ تحریر کیا ہو، اس سے طبعاً و ضمناً ہم علم نفسیاتِ اجتماع کے بعض مسائل کا یوں ہی سا استنباط کر سکتے ہیں، ابن سینا نے شفا میں نہایت تفصیل سے اس امر پر بحث کی ہو کہ خطبہ دیتے وقت خطیب کو کون سے الفاظ اور کس قسم کے جملوں کا استعمال کرنا چاہئے، قیاساتِ خطابی اور قیاساتِ جدلی میں کیا

کیا فرق ہی، خطیب استدلال جو پیش کرتا ہی، اسکی کیا نوعیت ہوتی ہی تمثیل اور استقرا ان دونوں
میں سے جماعت پر کس کا اثر زیادہ ہوتا ہی تشبیہات و استعارات سے مجمع کس طرح اثر پذیر ہوتا ہی، مدح
و ذم یا رغبت و نفرت کے جذبات پیدا کرنا ہوں، تو اس کے لئے خطیب کیا کیا تدابیر اختیار
کرسکتا ہی، غرض وہ تمام مسائل جن کا تعلق علم خطابت سے ہی، نہایت بسط کیساتھ ابن سینا نے
ان سے بحث کی ہی اور یہ مسائل گو مستقلاً علم نفسیاتِ جماعت کے مسائل تو نہیں لیکن ان مسائل
سے نفسیاتِ جماعت کے اصول و فروع کی ترتیب و تدوین میں ایک گونہ آسانی ہوسکتی ہی،

لیکن ان مسائل کے علاوہ لیبان کے اور نظریات جو ہیں، مثلاً یہ کہ جماعت کے جذبات
اور قوائے عقلی کی تشریح، یا مثلاً یہ مسائل کہ معتقداتِ جماعت کے پیدا کرنے میں زمانہ کا
کیا اثر ہوتا ہے، مخصوص نظامِ حکومت اور مخصوص نظامِ معاشرت کو ہیئتِ اجتماعی کے
تغیرات میں کیا دخل ہوتا ہی تعلیم و تربیت سے ہیئتِ اجتماعی پر کیا اثر ڈالا جا سکتا ہی؟ یہ اور
اسی قسم کے دیگر مسائل جن کا تعلق خاص علم نفسیات جماعت کیساتھ ہی، اس ترتیب و تفصیل
کیساتھ اسلامی لٹریچر میں ان کا کہیں پتہ نشان نہیں ملتا، البتہ ان کی جانب جستہ جستہ اشارات
و کنایات کہیں کہیں ملتے ہیں، مثلاً ابنِ خلدون نے ایک خاص فصل میں یہ دعوی کیا ہی، کہ دیہاتی
باشندے شہری باشندوں سے زیادہ نیک کام کرتے ہیں، یا اسی طرح ابنِ خلدون نے
ایک اور فصل میں یہ دعویٰ کیا ہی، کہ دیہاتی باشندے شہری باشندوں سے زیادہ شجاع
ہوتے ہیں، یا مثلاً ایک فصل میں یہ دعویٰ کیا ہی کہ وحشی قوموں کو دیگر اقوام پر غلبہ حاصل
کرنے کی زیادہ قدرت ہوتی ہی، اور گو ان مباحث کا مقصد دیہاتی اور شہری باشندوں
کی اخلاقی حالت کا موازنہ کرنا ہے، لیکن ان مباحث سے جماعتوں اور قوموں کی
اخلاقی حالت کا بھی تھوڑا بہت اندازہ ہوتا ہے،

ان مباحث کے علاوہ لیبان نے ایک خاص فصل میں یہ دعویٰ جو کیا ہی، کہ جماعت کے اعمال و افعال پر مذہب کا بڑا اثر ہوتا ہے اور جماعت کسی بڑے کام کو اُس وقت تک انجام نہیں دیسکتی، جب تک اس کے افعال مذہبی جامہ نہ پہن لیں، اس کے بکثرت شواہد موجود ہیں،

اسی بحث کے ضمن میں لیبان بڑی بڑی حکومتوں اور سلطنتوں کے قیام کا سبب حسب ذیل بیان کرتا ہے:-

"حقیقت یہ ہے کہ رومی نشان کے آگے بیکیں اقوام سپر انداز جو ہو گئیں، تو اس کی وجہ یہ تھی، کہ شہنشاہ روم ان کی نگاہ میں ایک معبود کے رتبہ پر پہنچ گیا تھا، اور چھوٹے سے چھوٹے گاؤں میں اس کے نام کی محرابیں اور طاق تعمیر کئے جاتے تھے اور رومی حکومت میں ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک ایک جدید مذہب کی اشاعت کی گئی تھی، جس کی بنا قیاصرۂ روم کی پرستش پر تھی، یہاں تک کہ مسیحیت کے ظہور سے کچھ مدت پیشتر سرزمین گال میں شہر لیون کے قریب قیصر آگسٹس کے نام کا ایک ہیکل تعمیر کیا گیا تھا، جس کے مجاوروں کی سطوت وہیبت باشندگان گال کے دلوں پر بیٹھی ہوئی تھی"

لیبان کہتا ہے کہ سلطنتِ روم کی تقویت اور شوکت کا باعث یہ تھا، کہ تمام رومی صوبے شہنشاہانِ روم کے ناموں کا کلمہ پڑھتے تھے، اور مذہبی پردے میں دولتِ روم کی طاقت و شوکت کا اظہار کیا جاتا تھا، بلکہ ایک خاص مذہب ایجاد کیا گیا تھا، جس کی بنا پر قیاصرۂ روم کی پرستش پر تھی، اس مذہب کی اشاعت تمام رومی صوبوں میں کی گئی تھی، لیبان کے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ رومی سلطنت کو اس وقت تک استحکام نصیب

نہ ہوا جب تک رومی شہنشاہوں نے اپنے اغراضِ ملک گیری پر مذہبی رنگ نہ چڑھالیا، اور خود رومی شہنشاہوں نے بجائے شاہانہ سطوت کے مذہبی تقدس وعظمت کا رنگ نہ اختیار کرلیا" غرض مذہبی رنگ جس تحریک پر چڑھا دیا جاتا ہے، وہ بہت جلد کامیاب ہو جاتی ہی،

پھر لیبان ایک دوسرے موقع پر اس مذہبی رنگ کی جس سے حکومتوں کی سطوت و شوکت میں اضافہ ہوتا ہے، حسبِ ذیل تشریح کرتا ہے:۔

"انسان میں اصلی دینداری کا ظہور اس وقت ہوتا ہی جب وہ اپنی رائے، اپنی مرضی اور اپنی ذات کو کسی معبود کی مرضی اور اس کے ارادہ پر چھوڑ دیتا ہے، اور اپنی مرضی کو اُس کی مرضی کے اندر بالکل فنا کر دیتا ہے، جب یہ اعتقادی کیفیت انسان کے اندر پیدا ہو جاتی ہی، تو اس وقت تمام دوسرے خیالات کے گرد وغبار سے اس کا شیشۂ دل پاک وصاف ہو جاتا ہی، اور اس وقت اس کے تمام افعال واعمال کا محور اور مرجعِ وحید صرف وہی ذات ہوتی ہی، جس کی مرضی اور شخصیت کے اندر اُس نے اپنی مرضی اور شخصیت کو فنا کر دیا ہی"

اس فقرہ میں لیبان نے تصریح کر دی ہی، کہ افعالِ جماعت پر مذہب کا جو اثر ہوتا ہی اسکی حالت یہ ہوتی ہے، کہ افراد کی شخصیتیں اور افراد کے ذاتی ارادے سب کا رُخ ایک خاص مقصد کی جانب ہوتا ہے، ایک خاص معبود کا خیال (خواہ یہ معبود کسی رنگ میں ہو) تمام افراد پر اس قدر مستولی ہو جاتا ہے، کہ تمام دوسرے خیالات، ذاتی رنجشیں، کدورتیں اور خود غرضیاں سب دور ہو جاتی ہیں، اور تمام افراد ہمہ تن ایک خاص خیال میں محو ہو جاتے ہیں اب اگر اس فقرہ کو اس پچھلے فقرے سے ملاؤ، جو اوپر مذکور ہو چکا ہی، تو ان دونوں فقروں کا حاصل یہ ہوگا، کہ سلطنتوں کو شوکت وسطوت اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتی تاوقتیکہ کسی

مذہبی رنگ سے سیاسی اغراض کو تقویت نہ پہنچائی جائے اور وہ مذہبی رنگ یہ ہو کہ کسی مافوق العادہ معبود کی عبادت و اطاعت کا خیال افراد پر مستولی کر دیا جائے، تاکہ تمام دوسرے خیالات دماغوں سے بالکل نکل جائیں، چونکہ اس وقت ایک ہی خیال تمام افراد پر مستولی ہوتا ہے، اسلئے افراد کی ذاتی رنجشیں اور کدورتیں فنا ہو جاتی ہیں، اور تمام لوگ ایک مقصد کے درپے ہوتے ہیں، یہ راز ہوتا ہے حکومت کی تقویت کا،

یہ لیبان کا بیان ہے لیکن ابن خلدون نے بھی ایک خاص فصل میں دعویٰ کیا ہے، کہ بڑی بڑی حکومتوں کے قیام کا راز کوئی خاص مذہبی تحریک ہوا کرتی ہے، جو سیاسی اغراض کے اندر مضمر ہوتی ہے،

ابن خلدون کہتا ہے ا-

"حکومت بغیر غلبہ کے حاصل نہیں ہوتی، اور غلبہ کے حصول کا ذریعہ صرف یہ ہے کہ وہ گروہ جو غلبہ حاصل کر رہا ہو، متحد الخیال ہو، بات یہ ہے کہ جب لوگوں کی خواہشوں میں اختلاف اور خیالات میں تضاد ہوتا ہو، اور لوگوں کا میلان دنیا کی جانب ہوتا ہو، تو اُس وقت آپس میں پھوٹ پڑ جاتی ہے، لیکن جب لوگوں کی توجہ کسی خاص مقصد کی تحصیل کی جانب مبذول ہوتی ہے، اور سب کی توجہ خدا کی جانب ہوتی ہو، تو اس وقت آپس کا اختلاف مٹ جاتا ہے، ہر شخص ایک دوسرے کی اعانت کرتا ہے، اور اس طرح باہمی معاونت و مساعدت کے ذریعہ سے حکومت کی سطوت و شوکت میں ترقی ہو جاتی ہو[1]"

اس کے بعد دوسری فصل میں ابن خلدون دوسرا یہ دعویٰ کرتا ہو کہ سیاسی اغراض

[1] مقدمہ ابن خلدون ص۱۲۴؛

مذہبی پردے میں اگر حاصل کی جاتی ہیں، تو اُن اغراض کے حصول میں آسانی ہوتی ہی، اس دعوی پر ابن خلدون نے جو دلیل قائم کی ہے، وہ حسب ذیل ہی:۔

"جو فریق اپنے سیاسی اغراض کو مذہبی پردہ میں حاصل کرنا چاہتا ہی، چونکہ اس گروہ کے افراد میں ذاتی رنجشوں اور کدورتوں کا نام و نشان نہیں ہوتا، اور سب کا منتہائے مقصود متعین ہوتا ہے، اسلیئے اس فریق کا ہر ہر فرد منتہائے مقصود کے حاصل کرنے میں اپنی جان تک لڑا دیتا ہے، بخلاف فریق مقابل کے کہ اسکی قوت خواہ کتنی ہی زیادہ ہو، مگر چونکہ اس کا کوئی خاص قبلۂ مقصد نہیں ہوتا، اسلئے وہ اپنی جان ویسی نہیں لڑاتا، جس طرح پہلا فریق لڑاتا ہی[1]"

ابن خلدون اور لیبان دونوں کے مندرجۂ بالا اقتباسات بالکل متقارب المعنی ہیں، اور اس باب میں دونوں کی تحقیق یکساں ہی،

حاصل یہ کہ لیبان نے جس طرز پر علم نفسیاتِ جماعت کے اصول و فروع کو مدون کیا ہے اس موضوع پر گو علمائے اسلام میں سے کسی نے مستقلاً کچھ نہیں لکھا، تاہم اسلامی لٹریچر میں علم الخطابت یا مباحثِ تاریخی کے ضمن میں اشارۃً وکنایۃً جو کچھ مواد موجود ہی اس سے اس فن پر ہلکی سی روشنی ضرور پڑتی ہے، اور اس لحاظ سے کہہ سکتے ہیں، کہ گو کسی خاص ترتیب کے ساتھ لیبان کے نظریات اور علم نفسیاتِ جماعت کے مسائل سے اسلامی لٹریچر خالی ہے، تاہم اسلامی لٹریچر اس فن کے مسائل سے بالکل ناآشنا نہیں ہی،

---

[1] مقدمہ ابن خلدون ص۳۰،

مقدمۂ مؤلف

ہم اپنی پہلی تصنیف میں قبائل کے نفسانی حالات سے بحث کرچکے ہیں، اب اس کتاب میں جماعتوں کے نفسانی حالات سے بحث کرتے ہیں:۔

ہر قبیلہ کی روح چند اوصاف اور خصائل کے مجموعہ سے پیدا ہوتی ہی، جو اس کے افراد میں وراثتہً چلے آتے ہیں، لیکن جب یہ افراد یکجا ہوکر کوئی کام کرنے کے لئے اٹھتے ہیں، تو اس اجتماع سے چند جدید نفسانی حالات پیدا ہوتے ہیں، جو موروثی خصائل کے مطابق اور بسا اوقات اُن کے مخالف ہوتے ہیں،

قوموں کی زندگی پر ہمیشہ منتظم جماعتوں کا بہت بڑا اثر پڑتا رہا ہی، لیکن اس زمانہ میں یہ اثر جس حد تک پہنچ گیا ہی، اس حد تک کسی زمانہ میں نہیں پہنچا تھا، کیونکہ ہمارے زمانہ میں جماعتوں کا یہ غیر ارادی اثر افراد کے اس اثر کا قائم مقام ہوگیا ہی جس کے ساتھ انکا طبعی ارادہ شامل ہوتا ہی، اور آج یہ اثر موجودہ زمانہ کے خصوصیات میں شمار کیا جاتا ہی،

جماعت کے موضوع پر باوجود اسکی مشکلات کے میں صرف علمی وسائل سے بحث کرنا چاہتا ہوں، یعنی میں اس طریقہ کو اختیار کرنا چاہتا ہوں، جس کی بنا علمی قواعد پر ہی، اور ان آرا، نظریات اور مذاہب کی جانب متوجہ نہیں ہونا چاہتا جو بطور مسلمات کے مان لئے گئے ہیں، کیونکہ ہمارے موضوعِ بحث کی طرح جب کوئی موضوع ایسا ہو، جس میں فکروں کو جولانی کا موقع ملے، تو اس میں حقیقتِ گم شدہ تک پہنچنے کا صرف یہی ایک ذریعہ نظر آتا ہی، ایک ماہرِ فن جو اپنی بحث سے کسی بات کو ثابت کرنا چاہتا ہی، اسکی پروا نہیں کرتا، کہ اسکی اس بحث

سے کن مصالح اور منافع کو صدمہ پہنچتا ہے، موسیو گوبلٹ ڈی الویلا نے جو ایک زبردست مفکر ہے اپنی ایک حال کی تصنیف کی بابت یہ خیال ظاہر کیا ہے :-

"میں نے اس کتاب میں ان خیالات سے اکثر جگہ اختلاف کیا ہے، جو موجودہ زمانہ میں متفق علیہ قرار دیئے گئے ہیں، کیونکہ میں کسی کا مقلد نہیں ہوں"۔

مجھے یقین ہے کہ میری یہ تصنیف بھی میری اور سابقہ تصانیف کا درجہ حاصل کریگی، کیونکہ میرا خیال ہے کہ کسی مذہب میں شامل ہوجانے سے اپنے افکار کو محدود کرنا، اور اسکے خیالات کا پابند ہوجانا ضروری ہوجاتا ہے،

تاہم ناظرین کو یہ بتادینا میرا فرض ہے، کہ وہ کیا سبب ہے، جس کی بنا پر میرے اخذ کردہ نتائج بادی النظر میں ان مباحث کے لازمی نتائج سے مختلف ہوتے ہیں، میں نے ایک مقام پر یہ ثابت کیا ہے، کہ ہر جماعت کی قوتِ فکر یہ یہاں تک کہ ان جماعتوں کی بھی جو اہلِ فضل وکمال سے مرکب ہوتی ہیں انحطاط پذیر ہوتی ہے، پھر یہ بھی میرا خیال ہے کہ باوجود اس دماغی انحطاط کے نظامِ جماعت میں خلل انداز ہونا، ان کے شیرازے کو پراگندہ کردینا ہے، لیکن بات یہ ہے کہ تاریخی حوادث میں زیادہ غور وفکر کرنے سے میں ہمیشہ اس نتیجہ تک پہنچا ہوں کہ افراد کی طرح انسانی جماعتوں کی تنظیم وترتیب بھی مشکل سے عمل میں آتی ہے، اس لئے ان کے حالات میں دفعۃً تغیر پیدا کرنا ہماری دسترس سے باہر ہے، فطرت البتہ ان کے حالات میں انقلاب کلی پیدا کرسکتی ہے، لیکن یہ تغیر ہمارے ارادہ کا پابند نہیں ہوسکتا، یہی وجہ ہے، کہ گو بعض لوگوں کے اس خیال کو کہ قوموں کی حالت میں پوری اصلاح ہوجائے، عقل اچھا سمجھتی ہے، لیکن اس خیال نے قوموں پر بہت برا اثر کیا، کیونکہ یہ اصلاحیں صرف اس وقت مفید ہوسکتی ہیں،

جب قومی روح کو دفعۃً بدل دیا جائے، لیکن یہ قدرت صرف زمانہ ہی کو حاصل ہے تمام
انسان اپنے جذبات و احساسات اور عادتوں کے محکوم ہوتے ہیں، اور یہ تمام چیزیں
ہمارے اندر موجود ہیں اور قوانین و نظام حکومت تو محض ہمارے نفس کا ایک پرتو اور
اس کی ضروریات کے ترجمان ہیں، لیکن چونکہ نفس ہی ان قوانین و نظام حکومت کا مبدر رہے
اس لئے وہ خود ان کو بدل نہیں سکتا،

جاننا چاہئے کہ اجتماعی حالات کی بحث کو ان اقوام کی بحث سے علیحدہ کرنا صحیح نہیں
ہے، جن میں وہ حالات پائے جاتے ہیں، کیونکہ اگرچہ عقلی و نظری حیثیت سے یہ صحیح ہے کہ
ان حالات کی کوئی قدر و قیمت ہے لیکن بلحاظ عمل انکی قدر و قیمت ہمیشہ اقوام کی نسبت سے ہوتی ہے،

پس کسی قوم کی اجتماعی حالت پر بحث کرنے کی غرض سے ان پر دو مختلف حیثیتوں
سے نظر ڈالنا مناسب ہے، اس وقت یہ بھی معلوم ہوگا، کہ محض نظری تعلیم عملی تعلیم سے
کس قدر مختلف ہوتی ہے، اور کوئی نتیجہ (حتیٰ کہ علوم طبعیہ کے نتائج بھی) اس کلیہ سے بہت
کم مستثنیٰ ہو سکتے ہیں، مثال کے طور پر دائرہ کو لو، کلی طور پر اس کی شکل وہی ہندسی شکل ہے جو
اصول و قواعد کے تحت میں داخل ہے لیکن کبھی ایسا ہوتا ہے کہ وہ آنکھوں کے سامنے مختلف
صورتوں میں آتا ہے، کبھی تم اسکو ستون کی صورت میں دیکھتے ہو، اور کبھی وہ تمہارے
سامنے مربع شکل میں آتا ہے، کبھی دائرہ ایک نامکمل ٹکڑا ہوتا ہے، اور وہ خطِ مستقیم کی صورت
میں نمایاں ہوتا ہے، لیکن باوجود اس کے ان ظاہری شکلوں کا لحاظ اصلی اور حقیقی اشکال
سے زیادہ کرنا چاہئے، کیونکہ یہی ظاہری شکلیں ہماری نظر کے سامنے آتی ہیں، اور ہم انہی کا
نقشہ یا فوٹو کھینچ سکتے ہیں، اسی وجہ سے یہ کہا جاتا ہے کہ بعض اوقات ظاہری صورت
اصلی صورت سے زیادہ حقیقت رکھتی ہے، کیونکہ ہندسی اصول کے مطابق ہندسی اشکال

کی تشخیص و تعیین کے یہ معنی ہیں، کہ اُن کی اس حقیقت کو بگاڑ دیا جائے، اور وہ لوگوں کی نگاہ سے چھپا دی جائیں، اس بنا پر اگر ہم ایک ایسی دنیا فرض کریں جس کے رہنے والوں کو چیزوں کی تصویر کھینچنے کے سوا اُن کے چھونے کی قدرت نہ ہو، تو ان کے لئے اُن کی حقیقی صورت کا تصور قائم کرنا مشکل ہوگا، پس معلوم ہوا کہ علمی حیثیت سے خارجی اشکال کی کتنی اہمیت ہے، اور عام لوگ ہندسی اشکال کو صرف ان کی شکلوں ہی سے سمجھ سکتے ہیں،

پس وہ فلسفی جو اجتماعی حالت سے بحث کر رہا ہے، اس کا فرض ہے کہ علمی قدر و قیمت کے مقابل میں ان حالات کی عملی قدر و قیمت سے بھی غافل نہ رہے، کیونکہ تمدنی تغیرات میں ان عملی حالات کو بہت کچھ اہمیت حاصل ہے، اور اگر اُن کا لحاظ رکھا جائے تو خالی منطق سے جو بے سر و پا نتائج ہوتے ہیں ان کی صحت پر یقین کر لینے سے احتیاط ہو جاتی ہے،

اس کے علاوہ چند اور اسباب ہیں، جن سے یہ احتیاط برتنے کی ضرورت ثابت ہوتی ہے،

۱۔ چونکہ اجتماعی حالات نہایت مشکل اور پیچیدہ ہوتے ہیں، اسلئے ان اسباب کا احاطہ کرنا اور ان کے باہمی فعل و اثر کو پہچاننا سخت دشوار امر ہے،

۲۔ ظاہری حوادث کی تہ میں کثرت سے چھپے ہوے مؤثرات ہوتے ہیں، جو نظر نہیں پڑتے، اور یہ ظاہری حوادث کسی نہ کسی عظیم الشان عمل کا نتیجہ ہوتے ہیں جو ہمارے علم و بحث سے بالاتر ہے،

ظاہری حوادث کی مثال امنڈنے والی موجوں سے دی جا سکتی ہے، جو سطحِ آب پر سمندر کے اس اندرونی تلاطم کا پتہ دیتی ہیں، جو ہماری نظر سے غائب ہے، جماعتوں کے حالات میں غور و فکر کرنے سے بعض اوقات تو ہمیں یہ نظر آتا ہے کہ ان سے یہ افعال ایسی حالت میں

سرزد ہو رہے ہیں، جس سے اُن کے قوائے مدرکہ کے انحطاط کا پتہ لگتا ہی، لیکن دوسرے وقت ان کے دوسرے افعال و اعمال کے دیکھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک پوشیدہ طاقت کے زیر اثر ہیں جسے اگلے لوگ مقدر یا طبیعت یا دستِ غیب کی امداد سے تعبیر کرتے تھے، اور اس زمانہ کے لوگ اسے مردوں کی آواز سے تعبیر کرتے ہیں،

حاصل یہ کہ گو ہم جماعت کی اس قوت کی حقیقت سے ناواقف ہوں لیکن ہم اس کے وجود سے انکار نہیں کر سکتے، اور یہی قوت قوموں کے تمام اندرونی اور بیرونی نظام میں مخفی طور پر کام کیا کرتی ہے، کوئی شے تم کو زبان سے زیادہ پیچیدہ، زیادہ خوش نما اور زیادہ دقیق النظام نہ ملے گی، لیکن جانتے ہو کہ اس کا منصدر کون ہی؟ اس کا مصدر وہی بے حس و شعور روح ہے جو جماعت کے قالب میں مخفی رہتی ہی، دیکھو اکاڈیمیاں اور ماہرین فن نحو کس کس طرح اس کوشش میں اپنی جان کھپاتے ہیں، کہ زبان کے قواعد کی تدوین کریں، لیکن بالآخر اس کوشش میں ناکامیاب رہتے ہیں، اسی طرح ہمیں یہ بھی یقین نہیں آتا کہ وہ بلند خیالات جو باکمال رہبرانِ قوم پیدا کرتے ہیں وہ خود ان کے اعمالِ دماغی کے نتائج ہوتے ہیں، بلاشبہہ یہ صحیح ہی کہ وہ ان خیالات کے موجد ہوتے ہیں، لیکن ہم کو یہ نہ بھولنا چاہئیے کہ عاک کے وہ ذرے جن کے تودے پر ان افکار نے نشو و نما حاصل کی، ان کو جماعتوں کی اس مخفی روح نے پیدا کیا ہی، جو پوشیدہ طور پر جماعت پر حکمراں ہی،

جماعتوں کو کام کرتے وقت کبھی اپنے عمل کا احساس نہیں ہوتا، اور دراصل یہی ان کی طاقت کا راز ہوتا ہے، لیکن بایں ہمہ ہم دیکھتے ہیں، کہ وہ اشخاص جو صرف الہام کے مطیع ہوتے ہیں، ایسے کام کر بیٹھتے ہیں، جن کے سمجھنے سے عقل حیرت زدہ رہ جاتی ہی، وجہ یہ ہے کہ عالمِ انسانیت میں عقل ایک نئی اور ناقص شے ہے، اس لئے ہماری عقل

کو اس بات کی قدرت نہیں، کہ وہ افعال جو غیر شعوری حالت میں انسان سے صادر ہوتے ہیں، ان کے قوانین و اصول سے وہ واقف ہو سکے، اور یہ تو بہت بعید ہی کہ ہم ان افعال کے ایک قانون کو دوسرے قانون کی جگہ پر لاکر رکھدیں، تمام انسانی افعال میں غیر شعوری قوت سب سے زیادہ اور عقل کا حصہ سب سے کم ہی، اور غیر شعوری قوت ایک مخفی طاقت کے مانند فعل و اثر کرتی ہے،

اس بنا پر اگر ہم معرفتِ اشیا کے ان محفوظ اور تنگ حدود پر ٹھہر جانا چاہتے ہیں اور ہم ظنیات اور غیر مفید فرضیات کے میدان میں سرگشتہ ہونا نہیں چاہتے، تو ہم کو صرف ان حوادث کی بحث پر اکتفا کرنا چاہیئے، جو ہمارے حواس کے سامنے ہیں، ان مشاہدات کی بنا پر جو نتائج حاصل ہوں گے، وہ محض سرسری ہوں گے، کیونکہ ان عام حوادث کی آڑ میں جن کو ہم علانیہ دیکھتے ہیں، ایسے حوادث بھی موجود ہیں، جو رویاے کاذبہ کی صورت میں ہم کو نظر آتے ہیں، اور ان کی آڑ میں بعض ایسے حوادث ہوتے ہیں جو ہمکو مطلق نظر نہیں آتے،

———— ———

تمہید

جماعتوں کا دور

"زمانۂ حال کا انقلاب، تمدن کے عظیم الشان انقلابات قوموں کے خیالات کا نتیجہ ہوتے ہیں، جماعت کی طاقت کی نسبت زمانۂ حال کے لوگوں کے خیالات، یہ خیالات سلطنتوں کی مقلدانہ سیاست کو اول بدل رہے ہیں، قوم کو کس طرح غلبہ حاصل ہوتا ہے، اور اس غلبہ کی رفتار کیا ہے، جماعت کے تسلط کے لازمی نتائج، جماعتیں صرف بگاڑ سکتی ہیں، بنا نہیں سکتیں، جماعتیں اس تمدن کو مٹا دیتی ہیں، جس کی بنیاد کمزور ہو گئی ہو، جماعتوں کے احوالِ نفسیہ سے بے خبری، صاحبِ شریعت اور اہلِ سیاست کے لئے ان حالات سے واقف ہونے کی اہمیت۔"

دنیا کے واقعات کو سرسری نگاہ سے دیکھنے والے یہ سمجھتے ہیں، کہ وہ عظیم الشان انقلابات جو اقوام کے تمدن میں تغیر پیدا ہونے سے پہلے پیدا ہوتے ہیں، (مثلاً سلطنتِ روما کا زوال، اور عربی حکومت کا قیام) کسی بڑے سیاسی تغیر کا نتیجہ ہوتے ہیں، مثلاً بعض قوموں کا بعض پر حملہ آور ہونا اور تختِ سلطنت کا ہاتھ سے نکل جانا وغیرہ وغیرہ لیکن اگر ان واقعات پر گہری نظر ڈالو تو معلوم ہوگا، کہ ان کے ظاہری اسباب کے علاوہ ان کا حقیقی

سبب قوموں کے خیالات کا عام انقلاب ہے، پس اہلِ نظر کو جس بات سے حیرت ہونا چاہئے وہ یہ عظیم الشان سیاسی تغیرات نہیں ہیں، بلکہ قابلِ اعتبار صرف وہ تغیر ہے، جو کسی قوم کے افکار، خیالات اور اعتقادات میں واقع ہوتا ہے، اور حقیقت میں یہ عظیم الشان تغیرات جو صفحاتِ تاریخ پر باقی رہیں گے، اس مخفی تغیر کے ظاہری آثار ہوتے ہیں، جو لوگوں کے خیالات میں پیدا ہوتا ہے، لیکن اگر یہ واقعات بہت نادرالوقوع ہیں، تو اس کا سبب یہ ہے، کہ قوموں کے اخلاق میں سب سے زیادہ پائدار وہ موروثی خیالات ہیں، جو ان کے آبا و اجداد سے ان کو وراثتہً ملے ہیں،

انسان کی تاریخ میں کوئی ایسا دور نہ گذرا ہوگا، جس میں انسانی افکار کے اندر اتنا عظیم الشان تغیر واقع ہوا ہو، جتنا ہمارے زمانہ میں واقع ہوا ہے اور اس کے اصلی سبب دو ہیں:

۱۔ ان تمام دینی، سیاسی اور اجتماعی معتقدات کی بنیادیں ایک دم متزلزل ہوگئی ہیں، جو موجودہ تمدن کی بنا ہیں،

۲۔ موجودہ زمانہ کے علمی اور صنعتی انکشافات کی بدولت زندگی میں نئے حالات اور جدید افکار پیدا ہوگئے ہیں، اور چونکہ پرانے افکار کا ابھی پورے طور پر زوال نہیں ہوا ہے، اسلئے ان کی قوت ابتک باقی ہے اور جو افکار ان کی جگہ لے رہے ہیں، وہ ابھی دورِ تکون اور ابتدائی حالت میں ہیں، اسلئے موجودہ زمانہ تغیر و اضطراب کا زمانہ ہے،

اس امر کی نسبت پیشین گوئی کرنا کہ آگے بڑھکر موجودہ ہیجان سے کیا نتیجہ پیدا ہوگا اسی طرح دشوار ہے، جس طرح ہم یہ نہیں بتا سکتے، کہ کن افکار اور خیالات پر آنے والی قوموں کے تمدن کی بنیاد ہوگی، البتہ ہم ابھی سے اتنا جانتے ہیں، کہ ان قوموں کے آگے ایک عظیم الشان اور زبردست قوت ہوگی، اور اس کا لحاظ کرنا ان کے لئے ضروری

ہوگا، اس قوت سے میری مراد جماعتوں کی قوت ہے، یہ وہ طاقت ہے، جو آج تک صرف
بوسیدہ خیالات کے ان مٹے ہوئے نشانات پر جن کو لوگ حقیقت سمجھتے تھے، قائم ہے
وہ مردہ ہوگئی تھی لیکن ان مختلف شورشوں کے بعد جنھوں نے ان دوسری قوتوں کے
اثر کو بالکل دبادیا، جو پہلے انسان پر حکومت کرتی تھیں، وہ دوبارہ پھر زندہ ہوگئی
اور نظر آتا ہے کہ وہ عنقریب اپنے ماسوا سب کو فنا کردیگی، تم دیکھتے ہو کہ ہمارے قدیم
اعتقادات اپنی کمزور بنیادوں کی بدولت لرز رہے ہیں، اور قدیم تمدن کے ستون ایک
دوسرے پر گر رہے ہیں، اور صرف جماعت ہی کا ایک غلبہ ہے، جس کو کوئی روکنے والا
نہیں رہا ہے، بلکہ وہ برابر بڑھتا جاتا ہے، اور اس بنا پر جس زمانہ کی جانب ہم بڑھ رہے
ہیں، وہ لازمی طور پر **جماعتوں کا دور** ہے،

تقریباً ایک صدی ادھر تاریخی حوادث و واقعات پر حکومتوں کی آبائی اور موروثی
سیاست اور بادشاہوں کے ذاتی جھگڑوں کا اثر حاوی تھا، لیکن آج تقلیدی سیاست
کا کوئی وزن اور بادشاہوں کے شخصی جھگڑوں کا کوئی اثر نہیں رہا، بلکہ جو غلبہ ہے وہ
جماعتوں کی آواز کو ہے، وہی بادشاہوں کا رویہ مقرر کرتی ہے اور سلاطین اس کوشش میں
رہتے ہیں، کہ ان کی آوازوں پر کان لگائیں، اور اب قوموں کے طریق کار کا رخ امرا
کے مشورہ کی جانب نہیں رہا، بلکہ جماعتوں کی روح کی جانب ہے،

پس تغیرات کا یہ دور جس میں ہم زندگی بسر کر رہے ہیں، اسکی ایک ممتاز خصوصیت
یہ ہے کہ قوموں کی حالت میں تغیر ہوگیا ہے، اور اگر پہلے عنانِ سلطنت افراد کے
ہاتھوں میں تھی، تو اب جماعتوں کے ہاتھوں میں آگئی ہے، بادی النظر میں یہ معلوم ہوتا
ہے کہ اس زمانہ میں چونکہ حقِ انتخاب عام کر دیا گیا ہے، اسلیئے جماعتوں کو غلبہ حاصل ہوگیا

ہے لیکن یہ حق تو ایک عرصہ سے لوگوں کو حاصل تھا، اور یہ حالت جو آج پیدا ہوئی ہی، وہ پہلے نہ تھی، حقیقت یہ ہے کہ جماعت کا تسلط پہلے اُن افکار کے پھیلنے سے بتدریج بڑھتا گیا جو زمانۂ حال میں ذہنوں کے اندر راسخ ہو گئے ہیں، پھر اس کے بعد جب سے لوگوں نے اجتماعی قوت کے اثر کو حصولِ مقاصد کا ذریعہ بنانا شروع کیا، اس وقت سے جماعتوں نے غلبہ حاصل کر لیا، یہانتک کہ رفتہ رفتہ جماعتوں کو اپنے منافع اور اپنی زبردست قوت کا بھی احساس پیدا ہو گیا، اب جماعتیں کمپنیاں اور مختلف تجارتی بینک قائم کرتی ہیں، جن کا مقصد یہ ہی کہ تقسیمِ عمل اور اجرت پر تسلط حاصل کر لیا جائے، اگرچہ اس میں قواعدِ اقتصاد اور ثروتِ عامہ کے اصولِ تدبیر کے خلاف کرنا پڑے،

اسی اثر کا نتیجہ ہے، کہ آج جماعتیں نیابی مجالس میں ایسے ممبر منتخب کر کے بھیجتی ہیں جو شخصی رائے اور استقلالِ ذاتی سے مجرد ہوتے ہیں، اور ان کی رائے منتخب کرنے والی جماعتوں کی رائے کے سوا کچھ نہیں ہوتی،

جماعت کو غلبہ ہو جانے کے باعث اس کے مطالبات اب زیادہ واضح ہوتے جاتے ہیں، اور اس کا مقصد بجز اس کے کچھ نہیں معلوم ہوتا کہ ہیئتِ اجتماعی کے موجودہ نظام میں سرے سے انقلاب پیدا کر دیا جائے، تاکہ مساوات کی وہ پہلی حالت عود کر آئے، جو آفتابِ تمدن کے طلوع ہونے کے پیشتر مختلف قبائل میں پائی جاتی تھی، جماعتوں کا ایک مطالبہ یہ بھی ہی کہ اوقاتِ عمل کی تعیین کر دی جائے، اور ریلوے، کارخانے اور کانیں کسی کی ملکیت نہ رہیں، نیز یہ کہ تمام لوگ منافع سے برابر متمتع ہوں اور ادنیٰ طبقات کو اعلیٰ طبقات کے مساوی کر دیا جائے،

یہ بڑی مشکل ہی کہ جماعتیں غور و فکر سے زیادہ عمل پر قدرت رکھتی ہیں، اور اپنے

موجودہ نظام کی بدولت انھیں بڑی قوت حاصل ہوگئی ہے، پس عنقریب وہ معتقدات مذاہب جو ابھی دورِ طفولیت میں ہیں، ان مذاہب و معتقدات کی طرح افکار پر غلبہ حاصل کرلیں گے، جو پہلے کسی زمانہ میں ذہنوں میں راسخ تھے، یعنی ان کی طاقت اس قدر بڑھ جائے گی، کہ ان کے سامنے تمام دوسرے اثرات ہیچ ہو جائیں گے، اور اس وقت جماعت کے مقدس حقوق، بادشاہوں کے مقدس حقوق کی جگہ لے کر قابلِ تقدیس اور مافوق البحث بنجائینگے

جماعت کے اثر اور غلبہ کی یہ حالت دیکھکر اُن اہلِ قلم اصحاب کے دلوں پر خوف طاری ہوگیا ہے، جو اقوام کے طبقۂ متوسطہ میں ایک خاص منزلت رکھتے ہیں، اور جو اس طبقہ کے افکار و خیالات کے بہت بڑے حامل ہیں، ان لوگوں کو اس جدید تسلط سے جو برابر بڑھتا جارہا ہے، خوف پیدا ہوا، افکار میں جو اضطراب پیدا ہوگیا ہے اسکا انھوں نے مقابلہ کرنا چاہا، اور کنیسہ کی جانب یہ لوگ استغاثہ لے کر گئے کہ شاید وہ اپنے روحانی اثر اور اخلاقی غلبہ کے بل پر ان کی کچھ مدد کرے، حالانکہ بیشتر یہ لوگ خود اس کی سخت اہانت کرتے تھے، اور اب بھی لوگ پکار پکار کر کہتے ہیں کہ علم اپنے افلاس کی وجہ سے تہذیبِ نفس کا فرض نہیں انجام دے سکتا، اور اب ہماری قسمت کنیسہ کے ہاتھ میں ہے، یہ لوگ روم سے توبہ کر کر کے پلٹتے ہیں، اور ہم کو اس بات کی دعوت دیتے ہیں، کہ ہم پھر وحی و الہام کی جانب رجوع کریں، حالانکہ وہ اس بات کو بھولے بیٹھے ہیں، کہ اب وقت گذر چکا، بے شبہہ ہم مانتے ہیں کہ خدا کا دریائے فیض پھر جوش میں آیا ہے، اور یہی وجہ ہے کہ ان لوگوں کو توبہ و استغفار کی توفیق ہوئی ہے، تاہم جماعت پر اب اس کے فیض کا نہ کچھ اثر ہو سکتا ہے، اور نہ وہ ان واقعات کی پروا کرتی ہے، جو ان زہاد کے قلوب میں اضطراب اور گھبراہٹ

پیدا کر رہے ہیں، پس اب وہ کبھی ان معبودوں کی جانب مائل نہ ہوگی، جن سے خود یہ لوگ پہلے نفرت پیدا کرا چکے ہیں، اور جن کے اثر کے برباد کرنے میں ان لوگوں کو ایک خاص مداخلت تھی، نہر کے بند کو جب کہ وہ ٹوٹ چکا ہو، باندھ دینا، انسان اور خدا دونوں کی طاقت سے باہر ہے،

لوگ کہتے ہیں کہ علم اپنی غربت اور افلاس کی وجہ سے تہذیبِ نفوس کا فرض نہیں انجام دے سکتا، حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ علم غریب اور مفلس نہیں ہوا ہے، اور وہ اس اضطراب کے پیدا کرنے میں جو افکار کے اندر پیدا ہو گیا ہے، اور جماعت کے تسلط کو ترقی دینے میں جو اضطراب کی بدولت بڑھ رہا ہے، بالکل بے گناہ ہے، علم نے ہم سے صرف اس بات کا وعدہ کیا تھا کہ وہ اسرارِ عالم کو کھول دیگا، یا کم از کم اشیاء کی باہمی نسبتوں کو بتا دیگا، اس نے کبھی اس بات کا وعدہ نہیں کیا تھا کہ وہ ہمیشہ امن و صلح کی ذمہ داری کرتا ہے، علم، جمادِ محض ہے کہ ہمارے خدمات کا احساس اسے نہیں ہوتا، اور بہرا ہے کہ ہماری چیخ پکار اس تک نہیں پہنچتی، یہ صرف ہمارا فرض ہے کہ ہمیشہ اس سے اتحاد اور دوستی قائم رکھیں، پس علم کی روشنی کے سامنے جو توہمات مٹ گئے ہیں ان کو کوئی چیز دوبارہ اب ہمارے سامنے نہیں لا سکتی،

تمام اقوام میں ایسی کھلی ہوئی اور ظاہری علامتیں پائی جاتی ہیں، جن سے پتہ چلتا ہے کہ جماعت کا اثر اور غلبہ آئندہ جلد جلد ترقی کریگا، اور اب وہ کسی حد پر نہیں ٹھہر سکتا، ہم جماعت کے تابعِ فرمان ہیں، اور ہمیں تمام وہ نتائج برداشت کرنا ہیں جو جماعت کے غلبہ سے پیدا ہونگے، اس لئے اس بارہ میں کچھ گفتگو کرنا بیکار ہے ممکن ہے کہ عنانِ حکومت کا جماعت کے ہاتھوں میں آجانا، تمدنِ مغرب کے

زوال کا پیش خیمہ ہو اور مغرب میں طوائف الملوکی پیدا ہو جائے، جس کی بابت خیال کیا جاتا ہی کہ اس مرتبہ کا طے کرنا ہر قوم کے لئے ضروری ہی، لیکن جو ہونے والا ہی ہو کر رہے گا، بات یہ ہے کہ ابتک جماعتوں نے جو کام کئے ہیں، ان کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہی کہ ان کو ایوان تمدن کے منہدم کرنے میں ایک خاص مداخلت ہوتی ہے، تاریخ سے پتہ چلتا ہی، کہ جب کسی قوم کی اخلاقی قوتیں جن پر اسکی ترقی کا مدار ہی، کمزور ہو جاتی ہیں، تو نیم شعوری وحشی جماعتوں کے ہاتھوں اس قوم کا خاتمہ ہو جاتا ہے، برخلاف اس کے تمدن کی بنیاد قائم کرنے والے، اور اس کو مضبوط کرنے والے وہ چند مخصوص لوگ ہوتے ہیں، جو عالی دماغی اور دور بینی میں خاص امتیاز رکھتے ہیں، لیکن جماعت کا کوئی اس قسم کا فعل ابتک دیکھنے میں نہیں آیا، وہ صرف بگاڑنے کی قدرت رکھتی ہی، اور وحشیانہ حکومت کرتی ہے، بخلاف اس کے جن افراد کی بدولت قومیں ترقی پاتی ہیں، وہ نہایت عزم واستقلال کے ساتھ عقلی احکام کی پابندی کرتے ہیں، اُنکی نظر ہمیشہ مستقبل پر رہتی ہی، علم وتہذیب ان کے زیور ہوتے ہیں، اور عقل اُن کی رہنمائی کرتی ہے، حالانکہ جماعتوں نے اس بات کا یقین دلادیا ہے، کہ وہ اپنے اصلی رنگ میں رہ کر اُن مسائل پر عمل کرنے سے بالکل قاصر ہیں، جماعتوں میں تباہ کرنے کی جو قوت ہوتی ہی اسکی حالت ان بیماریوں کی سی ہی، جو بہت جلد کمزور جسموں کو فنا کر دیتی ہیں، اسی لئے جب کسی تمدن کی ہڈیاں کھوکھلی ہو جاتی ہیں، تو جماعتیں اس پر غلبہ پاکر تمدن کی بنیاد کو جڑ سے گرادیتی ہیں، یہ جماعتوں کا اصلی فعل ہوتا ہی، لیکن بادی النظر میں یہ دکھائی دیتا ہے، کہ مختلف واقعات کے جمع ہونے سے زمین کا تختہ اُلٹ گیا،

ہم کو اپنے تمدن کے متعلق بھی یہی خوف لگا ہوا ہی، کہ کہیں اس کا بھی

یہی حشر نہ ہو، اگرچہ ابھی تک ہمیں اس کا کچھ علم نہیں، بہرحال یورپ کا کچھ ہی انجام ہو، اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں، کہ جس طرح بن پڑے ہم جماعت کی فرماں برداری کریں، کیونکہ بے عقلی کے ہاتھوں تدریجاً جماعت اس قدر خودسر ہو گئی ہے کہ اب اُسکو روکنے والی کوئی قوت باقی نہیں رہی،

جماعتوں کا بیان بڑھتے بڑھتے طویل ہو گیا، حالانکہ ہمیں ان کی بابت بہت کم علم ہے، بات یہ ہے کہ جن لوگوں نے علم النفس کی جانب توجہ کی، انھوں نے جماعتوں سے کنارہ کشی اختیار کی، اور اسی لئے ہمیشہ ان کے حالات سے وہ ناواقف رہے، البتہ تھوڑے دنوں سے ان کو کچھ اس جانب توجہ ہوئی ہے، مگر اب بھی اُن کی نگاہ جس حیثیت سے جماعتوں پر پڑتی ہے، وہ یہ ہے کہ جماعتیں ناروا افعال اور جرائم کا ارتکاب کرتی ہیں، بلاشبہ یہ صحیح ہے کہ دنیا میں جرائم پیشہ جماعتیں پائی جاتی ہیں، لیکن انکے ساتھ دنیا میں نیک اور بہادر جماعتیں بھی ہیں، پس جماعتوں کو صرف ارتکابِ جرائم کی نگاہ سے دیکھنے کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم کسی شے پر صرف ایک حیثیت سے نظر ڈالیں، لیکن یہ ظاہر ہے کہ جس طرح کسی شخص کے صرف ظاہری عیوب کے دیکھ لینے سے اس کے پورے اوصاف اور پورے حالات کا علم نہیں ہو سکتا، اسی طرح صرف اس بات کی واقفیت سے کہ جماعت کبھی ارتکابِ جرائم کرتی ہے، جماعت کے پورے حالات کا علم نہیں ہو سکتا،

حالانکہ وہ لوگ جنھوں نے دنیا پر حکومت کی ہے، اور جن کے ہاتھوں میں اقوام وممالک کی عنانِ حکومت رہی ہے، بانیانِ مذاہب سے لیکر بانیانِ حکومت تک اور پیغمبرانِ دین سے لیکر مدبرینِ سیاست تک، حتیٰ کہ وہ لوگ جو چھوٹے چھوٹے قبائل کے سردار رہے ہیں، یہ سب ہمیشہ علم النفس کے ماہر ہوئے ہیں، یہ لوگ جماعت

کی روح سے فطرۃً واقف ہوتے تھے، اور اکثر اوقات یہ علم ان کا صحیح نکلتا تھا، یہی وجہ تھی
کہ ان لوگوں نے بڑی بڑی حکومتوں کی بنیاد ڈالی، نپولین کو دیکھو کہ وہ ان قوموں کے
نفسانی حالات سے وسیع واقفیت رکھتا تھا جو اس کے زیر اثر تھیں، لیکن شاید اس کو
دیگر اجنبی قوموں کے حالات سے بالکل واقفیت نہ تھی، اور یہی حالت اس کے بڑے
بڑے مشیروں کی تھی، وہ بھی اجنبی قوموں کے حالات سے ناواقف تھے، اسکے مشیر
ٹیلرانڈ نے ایک بار اس کو لکھا کہ اسپین کے باشندے غنیم سے شریفوں اور بہادروں کی
طرح لڑتے ہیں، لیکن جب نپولین نے اسپین پر حملہ کیا، تو اس کو ایسے لوگوں سے سابقہ
پڑا، جو بالکل مطلق العنان وحشی تھے، اگر اس کو وہاں کے باشندوں کے جذبات سے
کچھ بھی واقفیت ہوتی، تو بہت جلد اسکو اصل حالت کا پتہ لگ جاتا، یہی وجہ تھی، کہ نپولین
نے جب اسپین اور روس کے ممالک پر حملے کیے، تو وہ ناکام رہا، اور اس کو بہت جلد
ہزیمت ہوگئی،

اس زمانہ میں جماعتوں کے نفسانی حالات سے واقف ہونا اس قدر ضروری
ہوگیا ہے، کہ ہر بڑے سے بڑا سیاست داں اس جانب خاص توجہ کرتا ہے نہ اسلئے
کہ وہ جماعت پر اپنی حکومت اور سیادت قائم کرے، (کیونکہ یہ بہت مشکل ہے) بلکہ اسلئے
کہ اس ذریعہ سے وہ جماعت کے زور کو گھٹا سکے،

پس اگر ہم یہ دریافت کرنا چاہیں، کہ جماعت پر نظام حکومت اور رسوم کا اثر
کیوں کم پڑتا ہے، تو ہمیں سب سے پہلے جماعت کے نفسانی حالات اور اسکی روح سے
واقفیت پیدا کرنا چاہئے، اس سے ہمیں یہ بات بھی معلوم ہوسکے گی کہ جماعت کو
کسی رائے کے پیدا کرنے کی قدرت بالکل نہیں ہوتی، یہ باتیں اس کے مقررہ دائرہ

سے بالکل خارج ہیں نیز یہ کہ جماعت پر عقلی اصول اور قوانین کے ذریعہ سے حکومت نہیں کی جا سکتی، بلکہ اس پر حکومت صرف اُن ذرائع سے کیجا سکتی ہی، جو اس پر اثر قائم کر سکیں اگر کوئی کلکٹر یہ چاہے، کہ لوگوں پر ایک جدید ٹیکس مقرر کرے تو اس کو یہ خیال نہیں کرنا چاہئے کہ یہ ٹیکس بلحاظ اصولِ اقتصاد کے انصاف پر مبنی ہے یا نہیں، کیونکہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جو بات انصاف سے زیادہ دور ہوتی ہے، اسی کو لوگ زیادہ پسند کرتے ہیں، اور اب اگر یہ نیا ٹیکس بظاہر شدید زیر باری کا باعث نہ معلوم ہوگا، تو یقیناً لوگ اسے پسند کریں گے، یہی وجہ ہے کہ مقررہ ٹیکس کے ادا کرنے میں عوام کو کچھ دقت واقع نہیں ہوتی، خواہ اسکی مقدار بہت زیادہ ہی کیوں نہ ہو، کیونکہ وہ اسے قسط بقسط اپنی حاجتوں کو پورا کرتے وقت ادا کرتے رہتے ہیں، اور چونکہ وہ اس بھاری ٹیکس سے مانوس ہوتے ہیں، اسلئے وہ ان کو کچھ نہیں کھلتا، لیکن اگر اس ٹیکس کے بجائے، انکم ٹیکس یا اور کوئی ٹیکس لگایا جائے، جو انھیں یکبارگی ادا کرنا پڑے، تو اگرچہ اسکی مقدار مقررہ ٹیکس سے دس گنی کیوں نہ کم ہو، تاہم وہ اپنی شکایتوں سے آسمان سر پر اٹھالیں گے، کیونکہ اب بجائے معمولی رقم کے جسے وہ قسط بقسط ادا کرتے تھے، دفعۃً ایک ایسی مقدار کا بوجھ ان کے سر ڈال دیا گیا، جو انھیں یکبارگی ادا کرنا پڑے گی، اور یہی بات جماعت کی ضجریتِ طبع اور بے چینی کا باعث ہوتی ہے، ہاں البتہ اگر وہ بجائے شور وغل کے کفایت شعاری سے کام لیں تو کبھی ان کو یہ خفیف سا ٹیکس بھاری نہ معلوم ہو، لیکن یہ ایک ایسا اصول ہے، جو غور و فکر کا محتاج ہے، اور یہی بات جماعت کی قدرت سے باہر ہے[۱]،

---

[۱] اسکی مثال ہندوستان میں ہاؤس ٹیکس کا واقعہ ہی، جس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے

مذکورہ بالا بیان میں ہم نے ٹیکس کے یقین کی مثال جو دی ہے، وہ ایک آسان مثال ہے، جس کی صحت سے ہر شخص آسانی کے ساتھ واقف ہو سکتا ہے، اور نپولین جیسے لوگ تو شاید ان امور سے ناواقف نہ ہونگے لیکن وہ مصنفین جو اجتماعی زندگی کے حالات سے ناواقف ہیں، ان کو ان باتوں کا علم نہیں، کیونکہ ان کو یہ بات تجربہ سے نہیں معلوم ہوئی کہ لوگ ہمیشہ عقلی اصول اور قواعد کی پابندی نہیں کرتے ہیں،

اس مثال کے علاوہ ہم بہت سی مثالیں پیش کر سکتے ہیں، جو علم روح الاجتماع کے اصول کے مطابق ہیں، اس علم سے ایسے بیشمار اخلاقی اور اجتماعی واقعات کی پوری توجیہ ہو جاتی ہے، جن کی حقیقت سے واقف ہونے کا کوئی اور ذریعہ نہیں اور ہم عنقریب اپنی جگہ پر اس بات کی وجہ بیان کریں گے کہ زمانۂ حال کے بعض مورخین خصوصاً موسیو ٹائن انقلاب فرانس کے بعض واقعات کی توجیہ کرنے میں کیوں ناکامیاب رہے، اس کا سبب بجز اس کے کچھ نہیں معلوم ہوتا، کہ موسیو ٹائن نے جماعتوں کے نفسانی حالات سے واقفیت پیدا کرنے کی کوشش نہیں کی، بلکہ ان مشکل مباحث میں بھی اُس نے مادیین کا وہی طرز اختیار کیا، جو عموماً وہ واقعات کی توجیہ کرتے وقت اختیار کرتے ہیں، مادیین بہت کم اخلاقی قوی سے بحث کرتے ہیں، حالانکہ انہی قوتوں کی بنیاد پر تاریخ کی عمارت تعمیر ہوتی ہے،

جماعت کے نفسانی حالات کا معلوم کرنا بے حد ضروری ہے، خواہ ہم اسکا عملی حصہ معلوم کریں، یا صرف واقعات کی حقیقت دریافت کر لیں، بہر حال جس طرح علم زراعت

(بقیہ حاشیہ ص ۱۶) کے لئے مراد آباد میں ہندو مسلمانوں کا ایک عظیم الشان اجتماع ہوا، اور بہت کچھ شور و غل مچایا گیا، آخر کار گورنمنٹ نے مجبور ہو کر اس تجویز کو ملتوی کر دیا، (مترجم)

کی واقفیت کسی قدر فائدہ مند ہوتی ہے، اسی طرح جو افعال انسان سے صادر ہوتے ہیں، ان کے اسباب کا دریافت کرنا بھی فائدے سے خالی نہیں،

جماعت کے نفسانی حالات کے متعلق ہماری بحث بہت مختصر اور بطور گذشتہ تصانیف کے خلاصہ کے ہوگی، اور ناظرین صرف انہی مسائل سے واقف ہوسکیں گے جو اس فن کے ابتدائی مسائل ہیں، کیونکہ میری حالت تو یہ ہے کہ میں نے ایک ایسی زمین پر قدم رکھا ہے، جو ایک مدت سے بنجر چھوڑ دی گئی تھی، اس لئے میں تو تمام اصول و فروع کا استقصار کرنے سے قاصر ہوں، البتہ دوسرے لوگوں کو چاہیئے، کہ ان مسائل میں خوب غور و خوض کرکے اصول و فروع کو ترتیب دیں،

باب اوّل (۱)

نفسِ اجتماعی کی تشریح و تمثیل

فصل اوّل

جماعت کے امتیازاتِ عمومی، قانونِ وحدتِ فکری

" علمائے نفسیات کی اصطلاح میں جماعت کی کیا تعریف ہے، کثیر التعداد افراد کا اجتماع تشکیلِ جماعت کے لئے کافی نہیں ہے، جن افراد سے جماعت کی تشکیل ہوتی ہے، ان کے افکار و مشاعر میں اتحاد پیدا ہو جاتا ہے، اور ان کی شخصیتیں معدوم ہو جاتی ہیں، جماعت ہمیشہ ایک کیفیتِ نیم شعوری سے مغلوب رہتی ہے، حالتِ اجتماع میں کیفیتِ شعوری معدوم ہو جاتی ہے، اور کیفیتِ نیم شعوری کا غلبہ ہوتا ہے، قوتِ عقلیہ انحطاط پذیر ہو جاتی ہے، اور احساسات میں تغیرِ عظیم ہو جاتا ہے، جدید احساسات کے حسن و قبح کا اندازہ ان افراد کی حالتوں کے اعتبار سے ہونا چاہئے، جن سے جماعت کی تشکیل ہوئی ہے جماعت بآسانی شجاعت یا افعالِ ذمیمہ کی جانب مائل کی جا سکتی ہے۔"

متعارف معنی کے لحاظ سے جماعت کا اطلاق ہر اُس مجمع پر ہوتا ہی، جو چند افراد پر مشتمل ہو، گو ان افراد کی نسبتیں مختلف اور اُن کے اجتماع کے اغراض جدا جدا ہوں لیکن علم نفسیات کے نقطۂ نظر سے اس لفظ کا اطلاق ایک بالکل مختلف معنی پر ہوتا ہے، مجامع کی بعض صورتیں ایسی ہوتی ہیں، کہ مجمع کی تشکیل جن افراد سے ہوتی ہے، ان کی ذاتی حیثیتیں اور انفرادی مشاعر و احساسات ایک غرضِ اصلی اور مقصدِ وحید کے اندر بالکل فنا ہو جاتے ہیں، اور پورے مجمع پر ایک خاص حالت اور کیفیت طاری ہو جاتی ہے، اس وقت اس مجمع کی حالت دیگر مجامع سے مختلف ہوتی ہے، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہی کہ اس مجمع کے افراد میں وقتی طور پر ایک عام روح پیدا ہو جاتی ہے، اس حالت پر پہنچ کر افراد کا یہ مجموعہ ایک خاص اجتماعی صورت اختیار کر لیتا ہے، جس کے لئے مجھے زبان میں "مجامعِ نفسیہ" یا "مجامعِ منظمہ" سے زیادہ موزوں نام نہیں ملتا، اب یہ جماعت چونکہ ایک ذات بن جاتی ہے، اس لئے "ناموسِ وحدتِ فکری" کی مطیع ہو جاتی ہے،

غرض تقریر بالا سے واضح ہو گیا کہ علمائے نفسیات کی اصطلاح میں جماعت کا اطلاق ہمیشہ اُن مجامع پر ہوتا ہے، جن میں "ناموسِ وحدتِ فکری" مع اپنے دیگر فروع و لوازم کے موثر اور عاملِ وحید ہو، اور اگر کسی وسیع سرزمین پر ہزار آدمی بلا کسی خاص مقصد کے عارضی طور پر جمع ہو جائیں، تو وہ علم النفس کی اصطلاح میں جماعت نہ شمار کئے جائیں گے، بلکہ علمی اصطلاح کی بنا پر جماعت کی تشکیل کے لئے خاص موثرات کی ضرورت ہوتی ہے، جن کی تشریح میں آگے چل کر کروں گا،

پس ذی شعور ذات کا معدوم ہو جانا، اور احساسات کا جماعت کے مقصدِ وحید کے اندر فنا ہو جانا، علم النفس کے نقطۂ نظر سے جماعت کے یہ دو اصلی وصف ہیں، لیکن ان اوصاف کے نمودار ہونے کے لئے یہ ضروری نہیں، کہ بہت سے لوگ ایک جگہ اکٹھا ہوں، بلکہ کبھی ایسا ہوتا ہے، کہ جماعتِ نفسیہ کے یہ اوصاف ہزاروں آدمیوں میں پائے جاتے ہیں، جو ادھر ادھر منتشر ہوتے ہیں، اور ساری قوم میں کوئی زبردست واقعہ ایسا پیش آتا ہے، جو ان کے دلوں پر کوئی سخت اثر پیدا کر دیتا ہے، پس اگر وہ اتفاقیہ طور سے جمع ہو گئے، اور ان کے قلوب اس اثر سے متاثر ہیں، تو اسی وقت وہ جماعت کا جامہ پہن لیں گے، پھر کبھی ایسا ہوتا ہے، کہ جماعت صرف دس آدمیوں سے مرکب ہوتی ہے، اور کبھی سو آدمیوں پر بھی جو اتفاقاً کہیں جمع ہو گئے ہوں، جماعت کا اطلاق نہیں ہوتا، کبھی پوری قوم جماعت ہوتی ہے، جب کہ قوم کے تمام افراد کسی ایک اثر سے متاثر ہو رہے ہوں، گو ان کا ظاہری اجتماع نہ ہو،

پھر جب کسی جماعت کی تشکیل ہو جاتی ہے، تو اس میں دو قسم کے مخصوص اوصاف پیدا ہو جاتے ہیں،

۱۔ ایک وہ جو عموماً تمام جماعتوں میں وقتی طور پر پائے جاتے ہیں، یہ اوصاف اس قدر صاف اور کھلے ہوئے ہوتے ہیں، کہ ان کا شمار ہر شخص آسانی سے کر سکتا ہے، اور

۲۔ دوسرے وہ اوصاف جو ان افراد کے لحاظ سے جن پر جماعت مشتمل ہے، ہر جماعت میں مختلف ہوتے ہیں، اور یہ اوصاف بعض اوقات جماعت کی قوتِ مدرکہ پر بھی اثر کرتے ہیں، اس بنا پر یہ ممکن ہے، کہ ہم مختلف انواع پر جماعت کی تقسیم کریں، اور ہم آگے چل کر جب اس تقسیم کو بیان کریں گے، تو اس موقع پر یہ بھی بیان کر دیں گے کہ وہ جماعتیں

جو مختلف عناصر سے مرکب ہوتی ہیں، اور وہ جن کی تشکیل تشابہ عناصر سے ہوتی ہے، مثلاً خاندان، گروہ، ذاتیں، ان دونوں میں چند عام اور جامع اوصاف پائے جاتے ہیں، جو انہی کیساتھ مخصوص ہوتے ہیں، اور بعض اوصاف وہ ہوتے ہیں، جن سے باہم ان کو امتیاز حاصل ہوتا ہے،

لیکن قبل اس کے کہ ہم جماعت کے اقسام سے بحث کریں، یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جماعت کے ان اوصاف کی تشریح کر دیں، جو ہر جماعت میں مشترک طور پر پائے جاتے ہیں، اس میں یہ فائدہ ہے کہ جس طرح علمائے طبیعیات پہلے ان خواص اور اوصاف سے بحث کرتے ہیں، جو ایک جاندار کے تمام افراد میں پائے جاتے ہیں، پھر اس کے بعد وہ ان اوصاف کا ذکر کرتے ہیں، جو اس جاندار کے انواع و اصناف میں امتیاز پیدا کرتے ہیں، اسی طرح ان علما کی اتباع میں نفسیات میں بھی پہلے ان اوصاف کی تشریح ہو جائے گی، جو ہر جماعت میں بالاشتراک پائے جاتے ہیں، پھر ان اوصاف کی وضاحت کر دی جائیگی جو ہر قسم کے ساتھ خصوصیت رکھتے ہیں، اس طرح علم نفسیاتِ جماعت علم طبیعیات کے پہلو بہ پہلو رہے گا،

لیکن جب ہم جماعتوں کے اوصاف کی باریک اور دقیق تشریح کرنا چاہتے ہیں، تو چند مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے، بڑی مشکل تو یہ ہے، کہ جماعت جن افراد پر مشتمل ہوتی ہے، انہی کے اوصاف عمومی اور کیرکٹر کو متعین کرنا بڑا دقت طلب کام ہی، حالت یہ ہے کہ خود افراد کی زندگی کچھ اس طرح بے ثبات واقع ہوئی ہی، کہ افسانوں اور قصوں کے اندر تو خیر ان کے کیرکٹر میں ہمیں کوئی تغیر نہیں نظر آتا، لیکن چونکہ انسان کے قوائے مدرکہ میں یہ استعداد موجود ہی کہ ماحول اور گرد و پیش میں تغیر واقع ہونے پر اسکے کیرکٹر میں

تغیر ہو جائے، اس لئے اس کی زندگی بے ثبات اور ناپائدار حوادث اور کیریکٹر کا مجموعہ ہوتی ہے اور ماحول میں کسی نئے تغیر کے وقوع پذیر ہونے پر اس کے کیریکٹر میں ایک انقلاب ہو جاتا ہے، انقلابِ فرانس کے موقع پر ہم نے بہت سے لوگوں کو دیکھا ہے، جو حالت امن میں نہایت صلح پسند تھے، لیکن وہ اس موقع پر خوفناک درندوں کے مانند ہو گئے، پس جب افراد کے کیرکٹر کی ناپائداری کا یہ حال ہے، تو جماعت کے کیرکٹر کو متعین کرنا تو بہت مشکل ہے، بالخصوص جب کہ جماعت کے نظام میں ان قبائل اور خاندانوں کے اختلاف کی بنا پر جن سے جماعت کی تشکیل ہوئی ہے، اختلاف ہوتا ہے، نیز یہ قبائل جن موثرات سے اثر پذیر ہوتے ہیں، وہ بھی مختلف قسم کے ہوتے ہیں،

پس چونکہ یہ نا ممکن ہے، کہ ہم جماعت کے اوصاف اور کیرکٹر کی ایسی تشریح کریں جو ہر قسم کی جماعت پر صادق آسکے، اسلئے ہم ان جماعتوں کو لے کر جن کا نظام تکمیل ہو چکا ہی، جماعتوں کے اوصافِ عمومی سے بحث کریں گے، اور گو اس صورت میں صرف انہی اوصاف کا حال معلوم ہو سکے گا، جو جماعتوں میں کبھی کبھی پائے جاتے ہیں، اور ان اوصاف کا حال معلوم نہ ہو گا، جو غیر تغیر پذیر ہیں، لیکن اگر یہ پیش نظر کر لیا جائے کہ وہ جماعت جس کا نظام مکمل ہو چکا ہی، اس میں ان اوصافِ عمومی کیساتھ ساتھ جو تمام جماعتوں میں پائے جاتے ہیں، بعض خاص اور نئے اوصاف بھی ہوتے ہیں، جو دیگر جماعتوں میں نہیں ہوتے، اور یہی جماعت "ناموسِ وحدتِ فکری" کے تابع ہوتی ہے، غرضکہ مکمل صورت میں جماعت کا اطلاق اسی جماعت پر ہو سکتا ہے، تو اس وقت یہ بالکل صاف ہو جائیگا، کہ ہم نے اس قسم کی مکمل جماعت کو دیگر جماعتوں کے اوصافِ عمومی کی تشریح کرنے کے لئے نظیر کیوں قرار دیا ہی،

پھر جماعت کے اوصافِ عمومی میں بعض وہ اوصاف ہیں، جو جماعت کیساتھ ساتھ افرادِ منتشرہ میں بھی پائے جاتے ہیں، اور بعض ایسے ہیں جو جماعت کے ساتھ خاص ہوتے ہیں، اور افراد میں نہیں پائے جاتے، لیکن چونکہ جماعت کے ان اوصاف کو جو اسی کیساتھ خاص ہوتے ہیں، اہمیت حاصل ہے، اسلئے ہم پہلے انہی اوصاف کو بیان کریں گے،

جماعتوں کو جن باتوں میں امتیاز ہوتا ہے، اُن میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ جماعت میں ایک عام روح ایسی پائی جاتی ہے، جس کی بدولت اس کے ہر ہر فرد سے جو اعمال سرزد ہوتے ہیں، یا ہر ہر فرد اس حالت میں جو کچھ سمجھتا بوجھتا ہے، وہ اسکے خلاف ہوتا ہے، جو حالتِ انفراد میں وہ سمجھتا بوجھتا یا کرتا تھا، غرض افراد کے بعض مشاعر اور خیالات ایسے ہوتے ہیں، جو صرف اس وقت قوت سے فعل میں آتے ہیں، جب وہ جماعت کے اندر شامل ہو کر جماعت میں اپنے تئیں فنا کر دیتے ہیں، اور یہ مشاعر و خیالات ان مشاعر و خیالات سے بالکل الگ ہوتے ہیں، جن کا ظہور حالتِ انفرادی میں ہوتا ہے، پس مختصر طور پر جماعت اُس ذات کا نام ہے، جو مختلف عناصر و افراد سے اسطرح مرکب ہوتی ہو، کہ اس کا کوئی جز اپنی حالت پر برقرار رہا ہو، بالفاظ دیگر جماعت اس نفس ذاتی کا نام ہے، جس کا نظام طبعی مختل ہو گیا ہو، لیکن اگر جماعت کی اس حالت کو کسی تشبیہ سے سمجھنا چاہو، تو اپنے جسم کے ان خلایا اور جراثیم کی حالت پر غور کرو، جن کی باہمی ترکیب سے تمہارا جسم پیدا ہو گیا ہے، دیکھو ان جراثیم اور خلایا میں سے ہر ہر خلیہ اپنی انفرادی حالت میں کس طرح ایک دوسرے سے مختلف تھا، لیکن باوجود اس کے جب یہ باہم مخلوط ہو گئے، تو اُن کی باہمی ترکیب سے تمہارا جسم متشکل طور پر پیدا ہو گیا، جس کے ذاتی اوصاف ان خلایا کے اوصاف سے بالکل مختلف ہیں، پس ھربرٹ اسپنسر جیسے نکتہ رس عالم کی رائے کے خلاف، ہماری رائے یہ ہے کہ وہ عناصر و افراد

جن سے جماعت کی تشکیل ہوتی ہے، ان میں کوئی قدر مشترک وصف ایسا نہیں ہوتا، جو سب پر غالب آجاتا ہو، بلکہ جماعت میں جو کچھ ہوتا ہے، وہ یہ ہے کہ ایک مخلوط کیفیت اور جدید اوصاف پیدا ہو جاتے ہیں، یعنی ہمارے نزدیک جماعت کی حالت جواہر کیمیاویہ کی ایسی ہے، کہ جب دو جوہروں کو باہم مخلوط کر دو، تو ان کے اجتماع سے ایک نیا جسم پیدا ہو جائیگا، جس کے خواص ان خواص سے بالکل مختلف ہونگے، جو ہر ہر جوہر کے تھے پس جماعت میں بھی افراد کے مخلوط ہونے کی وجہ سے اسی قسم کے نئے اوصاف اور خواص پیدا ہو جاتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ کسی فرد کی اجتماعی اور انفرادی حیات کا فرق آسانی سے نظر آجاتا ہی، البتہ اس بات کا سبب ذرا مشکل سے سمجھ میں آتا ہو کہ یہ فرق کیوں پیدا ہو گیا،

لیکن اگر قاعدۂ ذیل کسی شخص کے پیشِ نظر رہے، تو اس فرق کا سبب بھی دریافت کرنا مشکل نہیں، وہ قاعدہ جس کو زمانۂ حال کے علمائے نفسیات نے مشاہدہ سے ثابت کیا ہے، وہ یہ ہے کہ جس طرح جسمانی حیات کیفیاتِ نیم شعوری کے ایک بڑے حصہ پر مشتمل ہوتی ہے اسی طرح انسان کی حیاتِ نفسی کا بھی بڑا حصہ کیفیاتِ نیم شعوری کے ماتحت ہوتا ہے اور انسان کی حیاتِ نفسی کیفیاتِ نیم شعوری کے مقابل میں کیفیاتِ شاعرہ پر بہت کم مشتمل ہوتی ہے، بلکہ ہمارے وہ اعمال و افعال جن کے متعلق ہم یقین کرتے ہیں کہ ہمارے ارادہ سے صادر ہوئے ہیں، وہ بھی درحقیقت ان کیفیاتِ نیم شعوری کے معلول ہوتے ہیں، جو ہم میں تاثیر وراثت سے پیدا ہوتی ہیں، اور کیفیاتِ نیم شعوری کا یہ مجموعہ ہمارے آبائی روایات و تقلیدات پر مشتمل ہوتا ہی، جن سے روحِ جماعت کی ترکیب ہوتی ہی، پس ہمارے ارادی افعال کے پیچھے ایسے اسباب ہوتے ہیں، جنمیں ہمارے ارادہ کو بالکل دخل نہیں ہوتا، اور ان کی آڑ میں بہت سے ایسے اسباب ہوتے ہیں جو ہماری نظر سے پوشیدہ رہتے ہیں، غرض ہمارے وہ افعال و اعمال جو ہم سے

روزمرّہ بالقصد و بالارادہ صادر ہوتے ہیں، وہ بھی ایسے مخفی اسباب کے معلول ہوتے ہیں جو بالکل ہماری نظر و فہم سے دور رہتے ہیں،

پس ایک قبیلہ اور ایک قوم کے تمام افراد اُن کیفیاتِ نیم شعوری میں برابر کے حصہ دار ہوتے ہیں، جن سے اس قوم یا قبیلہ کی روح کی تکوین ہوتی ہی، لیکن ان افراد کو باہم امتیاز جو ہوتا ہے، وہ ان کیفیاتِ شعوری کی بنار پر ہوتا ہی، جو کسی مخصوص تربیت و تعلیم یا استثنائی وراثت کی وجہ سے پیدا ہو گئی ہوں، یہی وجہ ہے کہ ایک قوم کے وہ افراد جو عقل و فہم اور دماغی خصوصیات میں مختلف درجہ کے ہوتے ہیں، یعنی جن کی حیاتِ شعوری ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہوتی ہے، ان کے میلانات، جذبات اور مشاعر میں ہمرنگی پائی جاتی ہی، یعنی انکی حیاتِ نیم شعوری میں کسی طرح کا تفاوت نہیں ہوتا ہی، بلکہ قوم کا وہ طبقہ بھی جو بلحاظ علم و فضل کے ممتاز ہوتا ہی، طبقہ عوام سے ان امور میں جن کا تعلق شعور سے ہے، (مثلاً دین اور سیاست وغیرہ) بالکل مختلف نہیں ہوتا، ایک ریاضی داں اور ایک بوٹ فروش کے مابین گو عقلی حیثیت سے کتنا ہی تفاوت ہو لیکن ان کے طبائع، میلانات اور جذبات میں یا تو بالکل تفاوت نہیں ہوتا، یا بہت کم ہوتا ہی،

افراد کی طبیعتوں کا یہ حصہ جو نیم شعوری کیفیت کا محکوم ہوتا ہی، پوری جماعت پر حاوی ہوتا ہی، اور اس کے تمام حرکات و سکنات میں پیش پیش رہتا ہی، اسی کی بدولت جماعت میں آکر افراد کی عقلی خصوصیتیں ماند پڑ جاتی ہیں، اُن کی شخصیتیں جماعت کی روح کے آگے فنا ہو جاتی ہیں جماعت کی عمومی خصوصیتوں کے آگے افراد کی انفرادی خصوصیتیں شکست کھا جاتی ہیں اور حیاتِ شاعرہ پر حیاتِ نیم شعوری کا غلبہ ہو جاتا ہی،

پس چونکہ جماعت سے جو افعال سرزد ہوتے ہیں، وہ اسکی حیاتِ نیم شعوری کے معلول ہوتے ہیں اسلئے یہ راز بھی ہم پر کھل جاتا ہی، کہ جماعت سے کسی وقت وہ کام نہیں ہو سکتے، جن کیلئے

فکر بلند اور عقلِ راجح کی ضرورت ہوتی ہے، یہانتک کہ وہ جماعت جو عقلمند لوگوں پر مشتمل ہوتی ہی، اور وہ جس میں غیر تعلیمیافتہ اور احمق لوگ شامل ہوتے ہیں ان دونوں جماعتوں سے کسی امر کے متعلق جو فیصلے صادر ہوتے ہیں، ان میں باہم کوئی فرق نظر نہیں آتا، اور اسکی وجہ یہی ہی کہ جماعت میں شامل ہوکر ان عقلمند اور تعلیمیافتہ لوگوں سے جو افعال سرزد ہوتے ہیں وہ جماعت کے اوصافِ عامہ اور کیفیتِ نیم شعوری کے معلول ہوتے ہیں جنمیں وہ اور عام لوگ دونوں مساوی اور برابر کے حصہ دار ہیں، اسلئے جماعت پر جس چیز کا غلبہ ہوتا ہی، وہ ذکاوت اور علم نہیں ہی، بلکہ جہالت اور حماقت ہی، اور عموماً یہ جو سمجھا جاتا ہی کہ والٹر سے زیادہ ایک مجمع کی رائے صائب ہوگی، غلط ہے، بلکہ تنہا والٹر کی رائے مجمع کی رائے سے صائب ہوتی ہی، مجمع عقلمند نہیں ہوتا، بلکہ والٹر اس مجمع سے زیادہ عقلمند ہے، جس کا وہ ایک فرد ہی،

لیکن اب یہ سوال پیدا ہوتا ہی، کہ اوپر کی تقریر سے تو یہ معلوم ہوا کہ جماعت کے ہر فرد سے جو اعمال صادر ہوتے ہیں، وہ کیفیتِ نیم شعوری اور جماعت کے اُن اوصاف سے متاثر ہوکر سرزد ہوتے ہیں، جو کل افراد میں مشترک طور پر یکساں پائے جاتے ہیں، اور اس کا صاف نتیجہ صرف یہی ہے کہ جماعت میں کوئی نئے اوصاف نہیں ہوتے، بلکہ ایک مشترک وصف ہوتا ہے، جو تمام افراد میں یکساں طور پر پایا جاتا ہی، جیساکہ اسپنسر کا مذہب ہے، پھر یہ جدید اوصاف جن کا تذکرہ بار بار اوپر ہو چکا ہی، کہاں سے اور کیونکر پیدا ہوتے ہیں؟ یہی سوال ہے جس کا جواب میں ذیل میں نہایت تفصیل کے ساتھ دونگا،

بات یہ ہے کہ یہ جدید اوصاف جو جماعت کی تشکیل کے وقت افراد میں پیدا ہو جاتے ہیں اور جن کا وجود حالتِ انفرادی میں نہیں ہوتا، جماعت میں انکے پیدا ہو جانے کے متعدد اسباب ہوتے ہیں :-

ا۔ سب سے پہلا سبب یہ ہے کہ کوئی فرد جب جماعت میں شامل ہوتا ہے، تو اس میں اس قسم کی شجاعت اور دلیری پیدا ہو جاتی ہے، کہ جن افعال کے ارتکاب سے وہ حالتِ انفرادی میں ہچکچاتا ہے، اب ان کے کر بیٹھنے کی نہ صرف وہ جرات کرنے لگتا ہے، بلکہ چونکہ جماعت میں داخل ہو کر افراد سے اُن کے اعمال و افعال کی مسئولیت بالکل اُٹھ جاتی ہے، اسلئے جماعت کا ہر ہر فرد مسئولیت سے بے خوف ہو کر ایسے افعال کے ارتکاب کی جرأت کر بیٹھتا ہے جن سے مسئولیت کا خوف، حالتِ انفرادی میں اسکو باز رکھتا تھا،

۲۔ دوسرا سبب جس کی بدولت جماعت میں جدید اوصاف پیدا ہوتے ہیں، یہ ہے کہ جس اثر سے کوئی ایک فرد متاثر ہوتا ہے، اس کا تعدیہ تمام افراد میں یکبارگی ہو جاتا ہے اور اس اثر سے تمام افراد یکدم اثر پذیر ہو جاتے ہیں، تعدیۂ اثر ایک ایسی چیز ہے، جس کے علل و اسباب کا بتانا مشکل ہے، ہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ تعدیۂ اثر مسمریزم کی طرح ایک عجیب موثر شے ہے، کہ ہر فرد اُس سے اثر پذیر ہو کر اپنے ذاتی اور شخصی مصالح کو اجتماعی مصالح پر قربان کرنے کے لئے تیار ہو جاتا ہے، اور یہ ایسی بات ہے، جو انسانی فطرت کے خلاف ہے، اور انفرادی حالت میں کوئی انسان اس جذبہ کا محکوم نہیں ہو سکتا،

۳۔ تیسرا سبب جو سب سے زیادہ اہم ہے، اور جسکی بدولت جماعت میں جدید اوصاف پیدا ہوتے ہیں، اثر پذیری کی استعداد ہے، جو ہر انسان میں پائی جاتی ہے،

اس استعداد اور قابلیت کی حقیقت کو سمجھانے کے لئے ہمیں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں وظائفِ اعضاے انسانی کے متعلق بعض اُن اکتشافات کا ذکر کریں جو حال میں تحقیق کیے گئے ہیں، ایک بڑی تحقیق جو حال میں ظاہر ہوئی ہے، یہ ہے کہ

ا۔ ہر انسان میں یہ استعداد پائی جاتی ہے، کہ مختلف ذرائع سے اگر اسکے شعور اور

حس پر اثر ڈالا جائے، تو اس کے اعصابِ حسی گویا سُن ہو جاتے ہیں، اور وہ ہر اُس بات کی تعمیل کرنے لگتا ہی، جس کا اُسے حکم دیا جائے، یہی استعداد ہی جس کی بنا پر ہر انسان سے بعض اوقات ایسے افعال صادر ہونے لگتے ہیں جو اس کے معمولی کیریکٹر کے خلاف ہوتے ہیں،

۲- لیکن تجربہ سے تحقیق کیا گیا ہے، کہ نیم شعوری اور اثر پذیری کی یہ استعداد جو انسان کی انفرادی زندگی کا ایک خاصہ ہی، اُس وقت زیادہ قوت پکڑتی ہی، جب کوئی فرد جماعت میں شامل ہو جاتا ہی، یہانتک کہ اس وقت اسکی حالت قریب قریب اس شخص کے مماثل ہوتی ہی جو مسمریزم کے عمل سے معمول کیا گیا ہو مسمریزم کے عمل کا اثر معمول پر جو کچھ ہوتا ہی، وہ یہی ہی کہ معمول کے دماغی اعصاب سُن ہو جاتے ہیں، اور وہ حیاتِ نیم شعوری کے تابع ہو کر عامل کی تعمیل کرنے لگتا ہے، اسکی حیاتِ شعوری پر حیاتِ نیم شعوری کا غلبہ ہو جاتا ہے، اور ارادہ مفقود، اور تمیز و حس کی قوت معدوم ہو جاتی ہی، اور اسکے افکار و مشاعر اس خاص دائرہ کے اندر محدود ہو جاتے ہیں جو عامل نے اس کے لئے کھینچ دیا ہو،

قریب قریب یہی حالت افراد کی اُس وقت ہوتی ہی جب وہ جماعت میں شامل ہو جاتے ہیں، اس وقت ان کو اپنے افعال کا شعور بالکل نہیں باقی رہتا، اور چونکہ وہ اپنے بعض مخصوص اوصاف سے معرا ہو جاتے ہیں، اسلئے اب اُن میں اُن کی جگہ پر بعض دوسرے اوصاف پیدا ہو جاتے ہیں، جماعت میں افراد کی حالت ایسی ہوتی ہے، کہ گویا اُن پر مسمریزم کا عمل کر دیا گیا ہی، اور اب وہ ان احکام کی تعمیل کر رہے ہیں، جو جماعت کی جانب سے ان کو دئے جائیں، بلکہ اطاعت و انقیاد اور اثر پذیری کا یہ مادہ جو جماعت کے اندر شامل ہو کر افراد میں پیدا ہو جاتا ہی، اس مادہ سے بہت زیادہ ہوتا ہی، جو مسمریزم کے معمول میں

ہوتا ہی، جماعت کا ہر فرد جماعت کے طلسم سے مسحور ہو کر اپنے دوسرے ساتھی پر وہی اثر کرتا ہے، جو خود اس پر ہوا ہی، یہانتک کہ اس باہمی تفاعل سے ہر فرد پر ایک بیخودی کی کیفیت طاری ہو جاتی ہی، اور بڑھتے بڑھتے یہ اثر اُس اثر سے بڑھ جاتا ہے، جو مسمریزم کے معمول پر پڑتا ہی؛ اور یہ اثر اتنا قوی ہوتا ہی کہ بہت کم لوگ اسکی مقاومت کر سکتے ہیں، البتہ اگر اسکی مقاومت ہوتی بھی ہی، تو اس وقت جب کہ ایک غرض سے دوسری غرض کی جانب جماعت کو ملتفت کرنا منظور رہو، چنانچہ اکثر ایسا ہوتا ہی کہ دفعتہً کوئی مبارک خیال جماعت کے ذہن میں آیا، اور یکایک جماعت افعالِ شنیعہ کے ارتکاب سے باز آگئی،

حاصلِ کلام یہ ہی کہ حیاتِ شاعرہ کی شکست اور حیاتِ نیم شعوری کا غلبہ، اثر پذیری کی بدولت تمام افکار و مشاعر کا ایک مرکز پر اتحاد و اجتماع، اور عمل کیجانب فطری رغبت، یہ اوصاف ہوتے ہیں جو جماعت میں شامل ہو کر ہر ہر فرد میں پیدا ہو جاتے ہیں، اس حالت میں انسان اپنے ارادہ سے کچھ نہیں کرتا، بلکہ اسکی قوتِ ارادی بالکل سلب ہو جاتی ہی،

یہی سبب ہی کہ جماعت میں داخل ہوتے ہی انسان تہذیب و تمدن کے اس درجہ سے گر جاتا ہی، جس پر حالتِ انفرادی میں تھا، اگر حالتِ انفرادی میں اس کے اخلاق پاکیزہ اور اسکی عقل پختہ تھی، تو اب حالتِ اجتماع میں آکر اسکے برعکس وہ سادہ لوح اور شہوات و جذبات کا فرمانبردار بنجاتا ہی، اب اس میں وحشی انسانوں کی طرح قساوت، شجاعت اور دلیری، یہ تمام اوصاف پیدا ہو جاتے ہیں، اگر پہلے وہ الفاظ کے اثر سے مرعوب نہ ہوتا تھا، تو اب اسمیں نہ صرف یہی بات پیدا ہو جائیگی، کہ وہ الفاظ کے اثر سے جلد مرعوب ہونے لگے گا، بلکہ اب وہ مرعوب ہو کر ایسے افعال کا ارتکاب کر بیٹھے گا، جو اسکے ذاتی منافع کے خلاف اور اسکے معمولی کیرکٹر کے عکس ہونگے، غرضکہ جماعت کے اندر انسان کی حالت ریگ کے ذروں کی مشابہ ہوتی ہے،

کہ ریگ کے ذروں کو ہوا جہاں چاہتی ہے اڑا لیجاتی ہے،

یہی تمام اسباب ہیں، جن کے باعث ججوں اور جیوریوں کی جماعتوں سے ایسے ایسے فیصلے صادر ہوتے ہیں، جو اگر ان میں سے الگ الگ ہر ہر فرد کے سامنے پیش کئے جائیں تو وہ اُنکی مخالفت کرے، اور یہی وجہ ہے کہ نیابی مجالس ایسے ایسے قوانین پاس کرتی ہیں، جنکو حالتِ انفرادی میں مجالسِ نیابی کا کوئی ممبر تسلیم نہیں کرتا،

انقلابِ فرانس کے لیڈروں کو دیکھو کہ ان میں سے ہر ایک حالتِ امن میں اپنی اپنی جگہ پر کیسا روشن خیال اور سلیم الطبع تھا لیکن جب سب یکجا ہو کر ایک جماعت بن گئے، تو افعالِ شنیعہ کا ارتکاب کرنے لگے، بہت سے ایسے لوگوں کو پھانسی پر چڑھایا جو بالکل بے قصور تھے، یہاں تک کہ آخر میں ان لوگوں نے اپنے ذاتی منافع کا بھی لحاظ نہ کیا، اور اپنی عزت اور نیک نامی کے حق سے بھی تنزل اختیار کیا،

پس حاصل یہ ہے کہ جب افراد جماعت میں شامل ہو جاتے ہیں، تو صرف یہی نہیں ہوتا، کہ ان کا ذاتی استقلال فنا ہو جاتا ہو، بلکہ ان کے افکار و مشاعر میں بھی سرے سے انقلاب عظیم ہو جاتا ہے، بخیل اسراف پسند، متشکک زود اعتقاد، پرہیزگار بدکار، اور بزدل شیر دل بنجاتے ہیں، ۴ اگست ۱۷۸۹ء کو جب امرائے اپنے امتیازات اور حقوق سے تنازل اختیار کیا ہے تو اسوقت یہی انقلاب تھا، جو انکے جذبات میں پیدا ہو گیا تھا، اور جس کے اثر سے وہ مسحور ہو گئے تھے حالانکہ اگر حالتِ انفرادی میں ان سے اسکی درخواست کیجاتی تو شاید جراغ پا ہو جاتے،

غرض تقریر بالا سے معلوم ہوا کہ افراد کی قوتِ ادراکی گو جماعت کی قوتِ ادراکی سے بڑھتی ہوئی ہوتی ہے، لیکن افکار و مشاعر اور ان اعمال و افعال کے لحاظ سے جو جماعتوں سے صادر ہوتے ہیں، جماعت کی حالت افراد سے مختلف ہوتی ہے، کبھی جماعتیں افراد سے زیادہ

نیک اور کبھی اُن سے زیادہ بد ہوتی ہیں، اور یہ اختلاف یا اُن افراد کے طبائع سے پیدا ہوتا ہے، جن سے انکی تشکیل ہوئی ہے، اور یا ان مختلف مہیجات اور عوامل سے جو جماعت پر موثر ہوتے ہیں، یہی حقیقت ہی جس کو ان مصنفین نے نظر انداز کر دیا ہے جو جماعت پر صرف اسکی مجرمانہ حیثیت سے نظر ڈالتے ہیں، یہ بلاشبہ صحیح ہے، کہ جماعتیں اکثر اوقات جرائم اور افعالِ شنیعہ کا ارتکاب کرتی ہیں، لیکن دوسرے وقت اُن سے دلیری اور شجاعت کے اوصاف بھی ظاہر ہوتے ہیں،

جماعت کے قائدین جس جانب جماعت کو مائل کریں گے اُسی جانب جماعت مائل ہوگی، اگر تم جماعت کو مجد و فخر، نصرتِ دین اور اعلاے کلمۃ اللہ کی جانب بلاؤ، تو وہ اسی طرح تمھاری صدا پر لبیک کہے گی، جس طرح وہ ۱۷۹۳ءمیں "حمایتِ وطن"، کی صدا پر لبیک کہکر برسرِ پیکار ہوگئی تھی، پس جماعت کو کسی خیال پر آمادۂ عمل کر دینا تمھارا فرض ہی اگر تاریخ کے صفحات میں جماعت کے اُن کارناموں کو تلاش کرو، جو اُس نے حالتِ سکون و اطمینان میں انجام دیئے ہیں، تو تمھیں اس قسم کا واقعہ ایک بھی نہ ملے گا، سکون و اطمینان کو بالاے طاق رکھکر ایک بار نفوسِ جماعت میں اضطراب و ہیجان پیدا کر دو، پھر دیکھو جماعت کیا کیا گل کھلاتی ہے،

فصل دوم

جماعت کے حسیات، اخلاق، جذبات

۱۔ جماعت کی اثر پذیری، تلون مزاجی اور غیظ و غضب

جماعت مہیجات اور عواملِ خارجیہ کے قابو میں ہوتی ہے اور وہی اس کے تغیرات کے باعث ہوتے ہیں، وہ مہیجات جن سے جماعت اثر پذیر ہوتی ہے، اس قدر قوی ہوتے ہیں، کہ اُن کے مقابلہ میں منفعتِ ذاتی کا جذبہ فنا ہو جاتا ہے، جماعت کا کوئی فعل غور و فکر اور ارادہ پر مبنی نہیں ہوتا، جماعت پر قومی عادات کا اثر،

۲۔ جماعت کی اثر پذیری اور زود اعتقادی

چند عواملِ خارجیہ کے اثر کی بنا پر جماعت بعض خیالی باتوں کو حقیقت سمجھنے لگتی ہے، تمام افراد جماعت کے ذہنوں میں ایک قسم کی خیالی اشباح کیوں پیدا ہوتی ہیں، اور ان کو عالم و جاہل سب یکساں طور پر کیوں تسلیم کر لیتے ہیں، ان اشباح کی بعض مثالیں جن سے افراد جماعت اثر پذیر ہوتے ہیں، یہ بحث کہ جماعت جو شہادتیں پیش کرتی ہے، وہ قابلِ قبول

نہیں ہوتیں، یہ بحث کہ کسی واقعہ کی صحت پر متعدد شہادتوں کا اتفاق اس واقعہ کی صحت کی دلیل نہیں ہو سکتا، کتب تاریخی کی قدر و قیمت،

۳۔ جماعت کی مبالغہ پسندی اور سادہ لوحی

جماعت شک و تردد سے نابلد ہوتی ہے، اور ہمیشہ یک طرفہ رائے قائم کرتی ہے، جماعت کے احساسات اور جذبات ہمیشہ نہایت قوی اور حد سے متجاوز ہوتے ہیں،

۴۔ جماعت کا تعصب اور قدامت پسندی

جماعت کے مذکورۂ بالا اوصاف کے پائے جانے کی وجہ، جماعت ہمیشہ اپنے سے قوی شخص کے آگے سر تسلیم خم کرتی ہے، فتنہ پردازی کا میلان جو کبھی کبھی جماعت سے ظاہر ہوتا ہے، وہ اس بات کی دلیل نہیں ہے، کہ وہ قدامت پسند نہیں ہوتی، جماعت کے احساسات ترقی اور انقلاب کے مانع ہوئے ہیں،

۵۔ جماعت کے اخلاق و عادات

جماعت کے اخلاق و عادات کبھی افراد کے اخلاق و عادات سے ترقی یافتہ اور کبھی انحطاط پذیر ہوتے ہیں، اس کے مختلف اسباب اور امثلہ، یہ بحث کہ جماعت کسی منفعت ذاتی کے خیال پر آمادۂ عمل نہیں ہوتی، حالانکہ افراد کے اعمال کا بیشتر حصہ اسی خیال پر مبنی ہوتا ہے، تہذیب اخلاق میں جماعت کی حالت اور درجہ،

فصل سابق میں ہم نے بالاجمال نفس اجتماعی کے خصوصیات کا ذکر کیا تھا، اب

اوراقِ ذیل میں ہم انہی سابق بیانات کو کسی قدر تفصیل اور وضاحت کیساتھ بیان کریں گے، جماعت کی بہت سی خصوصیتیں، مثلاً قابلیتِ غیظ و غضب، ضعفِ عقلی، فقدانِ ملکۂ انتقاد، اور غلبۂ جذبات وغیرہ، اکثر ان افراد میں بھی پائی جاتی ہیں، جن کا نشو و نما مکمل نہیں ہوتا، مثلاً عورت، بچہ، مجنون وغیرہ، لیکن یہ بحث کہ یہ اوصاف جو عورتوں، بچوں، اور ناقص الشعور افراد میں پائے جاتے ہیں، جماعت میں ان کا پایا جانا کن اسباب کی بنا پر ہے، دائرۂ کتاب سے خارج ہے، اس لئے میں اس کو یہاں چھیڑنا نہیں چاہتا، علاوہ بریں ان اسباب کے دریافت کرنے کی، ان لوگوں کو تو بالکل حاجت نہیں، جو فطری اور ناقص الشعور افراد کے نفسانی حالات سے بخوبی واقف ہیں، اور جن کو اس قسم کے افراد کی نفسانی حالتوں کا بالکل علم نہیں، وہ اس بحث سے کوئی مفید نتیجہ نہیں اخذ کر سکتے، پس اب ہم ذیل میں اُن اوصاف کی تشریح کرتے ہیں، جو اغلباً تمام جماعتوں میں پائے جاتے ہیں،

(۱)

جماعت کی تلون مزاجی، قابلیتِ غیظ و غضب

ہم نے پہلے جہاں جماعت کے خصوصیاتِ امتیازی کا ذکر کیا تھا، وہاں یہ بھی بیان کیا تھا کہ اس کے اعمال کا بیشتر حصہ کیفیاتِ نیم شعوری کا معلول ہوتا ہے، اور اس کے اعمال و افعال میں نخاع کی تاثیر دماغ کی تاثیر سے بہت زیادہ ہوتی ہے، یعنی حالتِ اجتماع میں افراد پر بجائے کیفیتِ شعوری کے کیفیتِ نیم شعوری کا غلبہ ہوتا ہے، اور یہ خصوصیت ایسی ہے، جس میں جماعت کے ساتھ وحشی انسان اور ناقص الشعور افراد بھی شریک ہیں، اسی بنا پر

وہ افعال جو جماعت سے صادر ہوتے ہیں، بعض اوقات گو تنقیدی حیثیت سے کامل ہوتے ہوں، مگر چونکہ عقل کو اسکی رہنمائی میں بالکل دخل نہیں ہوتا، اس لئے افراد جماعت کے دائرہ میں آکر اُن موثرات کی اطاعت کرنے لگتے ہیں، جو ان کو عمل کی جانب مائل کر رہے ہیں، پس جماعت ہمیشہ ان مہیجات وعوامل کی قید میں مقید رہتی ہی، اور اُن موثراتِ خارجیہ کے سامنے سرِ نیاز جھکاتی ہی، جو وقتاً فوقتاً اس پر اپنا اثر ڈالتے اور اس کے تقلبات وتغیرات کے باعث ہوتے ہیں، ہاں اگرچہ افراد کی حیات میں بھی اکثر یہی سانحہ پیش آتا ہے، اور وہ بھی موثرات کے حلقہ میں چاروں طرف سے گھر جاتے ہیں، لیکن انکی عقل ان کو مضرات سے آگاہ کرتی رہتی ہی، اسلئے وہ کبھی موثرات کے دام میں نہیں پھنستے یہی بات ہے، جس کی بنا پر علم وظائفِ اعضا کے ماہرین نے کلیہ قائم کیا ہی کہ افراد اپنے اعصاب کو قابو میں رکھ سکتے ہیں، اور جماعت نہیں رکھ سکتی،

لیکن وہ موثرات اور عواملِ خارجیہ جن سے جماعت اثر پذیر ہوتی ہی، چونکہ ہمیشہ بدلتے رہتے ہیں، اس لئے جماعت کے اعمال وافعال میں بھی تنوع ہوتا رہتا ہی، موثرات کے اسی اختلاف وتنوع کے باعث کبھی جماعت مجسمۂ رحمت بنجاتی ہی، اور کبھی پیکرِ قہاریت، کبھی بزدلی کا اظہار کرتی ہے، اور کبھی میدانِ عمل میں شجاعت کے ساتھ اقدام کرتی ہے، لیکن باوجود اس کے وہ ہمیشہ اس طرح حد سے گذر جاتی ہے کہ کبھی منافع ذاتیہ حتیٰ کہ حفظِ ذات کے جذبہ سے بھی متاثر نہیں ہوتی، اور چونکہ جماعت کے موثرات مختلف قسم کے ہوتے ہیں، اور وہ ہر ایک سے برابر اثر پذیر ہوتی ہے، اس لئے اس کے اعمال وافکار میں ہمیشہ انقلاب ہوتا رہتا ہے، یہی وجہ ہی کہ اکثر تم نے دیکھا ہوگا کہ جماعت دردناک سے دردناک کام چھوڑ کر یکبارگی شفقت آمیز کام کو انجام

دینے لگتی ہے۱۔ایک وقت جماعت سے قساوتِ قلبی اور بے رحمی کے افعال ظاہر ہوتے ہیں، تو دوسرے وقت وہ نہایت نرم دل اور انصاف پسند بنجاتی ہی، دنیا میں جب کبھی مذاہب کی تائید کے لئے خونریزی ہوئی ہی، تو جماعت ہی نے اس کا بیڑا اٹھایا ہی جماعت کی اس قوی طاقت کا اندازہ کرنے کے لئے ہمیں دور جانے کی ضرورت نہیں، کچھ زمانہ پیشتر ایک بغاوت کے دوران میں جماعت نے جو جو کار ہائے نمایاں انجام دیئے ہیں، اور جن کی بدولت یکبارگی ایک جنرل نے ایک نمایاں شہرت حاصل کی ہی وہ ابھی کی بات ہے، اگر یہ جنرل اپنی صدا بلند کرتا، تو لکھوکھا آدمی اس کی مدد کے لئے جان دینے پر آمادہ ہوجاتے،[۱]

یہی بات ہے کہ جماعت سے کوئی فعل بالقصد و ارادہ صادر نہیں ہوتا، اور گو اس کا میلان متناقض مشاعر کی جانب ہر دم ہوتا رہتا ہی لیکن ہمیشہ وہ اسی شعور سے اثر پذیر ہوتی ہے جس نے وقت فعل کے اس پر غلبہ پا لیا ہو، اس بارے میں جماعت کی حالت درختوں کے پتوں سے کس قدر ملتی جلتی ہے، کہ جب تند ہوا چلتی ہے تو پتے پراگندہ ہوجاتے ہیں، اور جب فضا میں سکون طاری ہوتا ہے، تو پھر وہ ٹھہر جاتے ہیں، ہم آگے چل کر جہاں جماعت کی اثر پذیری سے بحث کریں گے وہاں اس قسم کی مثالیں بکثرت پیش کریں گے،

---

[۱] غالباً مؤلف کا اشارہ جنرل بولنگر کی جانب ہی، جو گذشتہ صدی میں ایک مشہور فرنچ کمانڈر تھا، لوگ اس قدر اس کے شیفتہ ہو گئے تھے، کہ آخر کار وہ فتنہ و فساد کے خوف سے تمام عام مجامع اور مجالس سے کنارہ کش ہوگیا، اگر وہ کچھ زمانہ اور زندہ رہتا، تو ایک بار نپولین کے زمانہ کا نقشہ لوگوں کی آنکھوں میں پھر جاتا، اور فرنچ افواج اس کی ماتحتی میں ایک بار پھر اندازہ سے زیادہ کار ہائے نمایاں انجام دیتیں، (مترجم)

جماعت کی اس تلون المزاجی کی بدولت اس پر قابو پانا، اور اسکی قیادت کرنا سخت مشکل ہے خصوصًا اس حالت میں جب اس کو تھوڑا سا تسلط حاصل ہوگیا ہو، یہانتک کہ اگر روزانہ زندگی کے ضروریات پوشیدگی کے ساتھ نظام قائم نہ رکھیں، تو نیابی حکومتوں کا قیام بھی دشوار ہو جائے، کیونکہ جس طرح جماعت سرعت سے کسی بات کا ارادہ کرلیتی ہے، اسی طرح سرعت کیساتھ اس ارادہ سے عدول بھی کر جاتی ہے اور جس طرح وہ طویل مدت تک غور وفکر کی زحمت نہیں برداشت کرسکتی، اسی طرح اسکا ارادہ بھی وقتی اور آنی ہوا کرتا ہے،

لیکن جماعت کا خاصۂ امتیازی صرف یہی نہیں ہے، کہ وہ ازحد متلون مزاج اور اثر پذیر ہوتی ہے، بلکہ باوجود ان اوصاف کے وہ ایک وحشی انسان کی طرح اپنے ارادہ کے درمیان کسی چیز کا حائل ہونا بھی گوارا نہیں کرتی، اور اس ناگواری کے احساس میں جو بات اس کی مساعدت کرتی ہے، وہ یہ ہے کہ کثرتِ افراد کی بنا پر اس کو بے انتہا طاقت کا شعور پیدا ہوجاتا ہے، اور جماعت میں شامل ہوکر افراد کے ذہنوں سے "ناممکن" اور "محال" کا خیال بالکل نکل جاتا ہے، انفرادی حالت میں ایک شخص کسی محل میں آگ لگا دینے کے خیال سے ہچکچائیگا، اور اگر وہ اس فعل پر مجبور کیا جائے، تو وہ اسکی مقاومت کریگا، اور اُس سے اس فعل کا کبھی صدور نہ ہوگا، بخلاف اس کے جب وہ جماعت میں شامل ہوجاتا ہے، تو پہلے سے بے انتہا طاقت کا احساس کرنے لگتا ہے، اور کثرتِ تعداد کے خیال سے شجاع بنجاتا ہے، یہانتک کہ وہ اپنے ارادہ میں اس قدر مضبوط ہوجاتا ہے، کہ اگر اسکے راستہ میں مشکلات حائل ہوتی ہیں، تو وہ سختی سے اُن کا مقابلہ کرتا ہے، انسان کی جسمانی حالت اگر ابدی غصہ کی متحمل ہوتی تو ہم کہتے، کہ جماعت کی طبعی حالت دائمی غصہ ہے،

لیکن باوجود اس کے یہ بھی خیال رکھنا چاہئے، کہ جماعت کے مذکورۂ بالا اوصاف یعنی تلون مزاجی، اثر پذیری اور قابلیتِ غیظ وغضب وغیرہ پر قبائل کے اُن موروثی خصائص کا بہت بڑا اثر ہوتا ہے جو ہمارے تمام اعمال وافعال کی بنا ہوتے ہیں، اور گو یہ ضرور ہے کہ ہر جماعت میں کم وبیش اثر پذیری اور تلون مزاجی کی قابلیت پائی جاتی ہے، لیکن اقوام کے موروثی خصائص کے اختلاف وتنوع کی بنا پر جماعت کی ان خصوصیتوں میں بھی تفاوتِ درجات ہوتا ہے، بعض قومیں اپنے موروثی خصائص کی بنا پر بے انتہا متلون مزاج ہوتی ہیں، اور بعض قوموں میں تلون کا اثر کم پایا جاتا ہے، مثال کے طور پر لاطینی اور سیکسن انگلش قوموں کو لو، لاطینی قوم عورتوں کی طرح اس قدر متلون مزاج اور اثر پذیر واقع ہوئی ہے، کہ ایک ذرا سی بات پر ساری قوم میں غیظ وغضب کی بجلی دوڑ جاتی ہے، بخلاف انگریز قوم کے کہ اس کا پائے ثبات مشکل سے مشکل وقت میں بھی بہت کم لغزش کھاتا ہے، ہمیں وہ واقعہ خوب یاد ہے، جب ایک ٹیلیگرام کی بنا پر جس میں ہمارے سفیر کی فرضی اہانت کا واقعہ مندرج تھا، ہماری قوم میں اس قدر ہیجان پیدا ہوا، کہ فوراً ہولناک جنگ برپا ہوگئی، اور پھر جب لانگسون میں ہماری فوج کو شکست ہوئی، تو اس وقت کے جوش کا کیا پوچھنا تھا، فوراً وزارت میں انقلاب ہوگیا، حالانکہ اسی زمانہ میں انگریزوں کو بمقام خرطوم سخت شکست ہوئی، لیکن انگریزوں کے ثبات وعزم کو دیکھو کہ اس واقعہ سے انگریزی رائے عام میں نہ کوئی ہیجان پیدا ہوا، اور نہ وزارت میں کوئی تغیر واقع ہوا،

غرض یوں تو ہر جماعت عورتوں اور ناقص الشعور افراد سے مشابہ ہوتی ہے، لیکن لاطینی قوموں میں یہ خصوصیت دنیا کی تمام قوموں سے زیادہ پائی جاتی ہے، اسی وجہ سے جو شخص ان قوموں کا اعتماد حاصل کرتا ہے، وہ تھوڑی سی مدت میں ترقی پا جاتا ہے،

لیکن ہمیشہ اسے یہ خوف لگا رہتا ہے، کہ ایک معمولی قصور کے سرزد ہونے پر اسکی یہ تمام ترقی ملیامیٹ ہو جائے گی، اور وہ اوجِ رفعت سے گر جائیگا،

(۲)

اثرپذیری اور زود اعتقادی

جماعت کی تعریف کرتے ہوئے ہم نے بیان کیا تھا، کہ اس کا مخصوص وصف یہ ہے کہ اس میں نہایت شدت کے ساتھ اثر پذیری کی استعداد پائی جاتی ہی، اور یہ بھی بیان کیا تھا، کہ حالتِ اجتماع میں تعدیۂ اثر کس طرح وقوع پذیر ہوتا ہے، نیز ہم یہ بھی بیان کر چکے ہیں کہ جماعت کے تمام احساسات و مشاعر کا ایک مرکز پر جو اتحاد و اجتماع ہوتا ہے، اس کا کیا سبب ہے، غرض گذشتہ بیانات سے خوب اچھی طرح واضح ہو چکا ہے کہ جماعت پر گو اطمینان و سکون کے کتنے ہی آثار طاری ہوں تاہم وہ اپنے خاصۂ اثر پذیری کی بدولت ہمیشہ اس بات کے لئے آمادہ رہتی ہی، کہ ادھر کوئی موثر اس پر اپنا اثر ڈالے، اور وہ اس کا اثر قبول کرے، اور صرف یہی نہیں بلکہ جوں ہی اس اثر کا تعدیہ تمام افراد پر ہو چکتا ہے، تمام افراد اس اثر سے متاثر ہو کر مشغول کار ہو جاتے ہیں، پھر افراد کو اس سے غرض نہیں رہتی، کہ یہ مقصد جس کے حاصل کرنے کیلئے وہ ایک متاثرانہ شان سے بیتاب نظر آتے ہیں، کس قسم کا ہے، بلکہ وہ اس اثر سے اس قدر مسحور ہو جاتے ہیں کہ اپنی جان تک کی پروا نہیں کرتے اور جان، مال، دولت غرض ہر عزیز سے عزیز شے کی قربانی کرنے کے لئے آمادہ ہو جاتے ہیں، یہاں تک کہ افراد میں اس آمادگی اور مستعدی کے پیدا کرنے کے لئے اس کی ضرورت

بھی نہیں ہوتی، کہ عقلی استدلال سے اس مقصد کی برتری اور اباحت یا اُس کی قباحت اور حرمت کو ثابت کیا جائے، جیسا کہ انفرادی حالت میں ہوتا ہے، بلکہ اس آمادگی اور مستعدی کے پیدا کرنے کا اصلی دار مدار اس موثر کی ذات اور کیفیت تاثیر پر ہوتا ہے، جس نے افراد کو اس مقصد کے حاصل کرنے کے لئے آمادہ کیا ہے،

لیکن چونکہ جماعت ہمیشہ احساسات نیم شعوری کے تابع ہوتی ہے، یعنی یہ کہ بسہولت تمام موثرات کے اثر کو قبول کر لیتی ہے، اور ان افراد کے مثل جو عقل سے اثر پذیر نہیں ہوتے، مغلوب الحس اور ملکۂ انتقاد اور قوت ممیزہ سے بے بہرہ ہوتی ہے، اس لئے اسکی شان سے یہ ہے کہ زود اعتقادی اور سریع التصدیق ہو، اس قانون کو ذہن میں رکھنے سے اس بات کا سبب جلد سمجھ میں آجاتا ہے، کہ ناممکن اور غیر معقول قصے اور خرافات اس قدر جلد لوگوں میں کیوں منتشر ہو جاتے ہیں، اور قبولیت عام کیوں حاصل کر لیتے ہیں[1]؟

پھر ان خرافات کے اختراع و انتشار کا اصلی سبب صرف یہی نہیں ہے، کہ جماعت زود اعتقاد اور سریع التصدیق ہوتی ہے، بلکہ ان قصوں کی مقبولیت کا ایک سبب نفس اجتماعی کا ایک یہ خاصہ بھی ہے، کہ جماعت جب کسی واقعہ کا ادراک کرتی ہے،

---

[1] جو لوگ محاصرۂ شہر پیرس کے زمانہ میں موجود تھے، ان کو جماعت کی زود اعتقادی اور سرعت تصدیق کی بہت سی مثالوں کا علم ہوگا، چنانچہ ایک واقعہ یہ ہے کہ ایک شب اتفاق سے ایک مکان کی کھڑکی سے لوگوں کو چراغ کی روشنی نظر آئی، لوگ یہ سمجھے کہ اس مکان میں کوئی جاسوس ہے، اور وہ روشنی کے ذریعہ سے جرمنوں کو راہ بتا رہا ہے، باوجودیکہ ادنیٰ توجہ سے یہ بات ہر شخص سمجھ سکتا تھا کہ غنیم جو کوسوں دور ہے اس چراغ کی روشنی کو کیونکر دیکھ سکتا ہے لیکن لوگوں نے اس افواہ پر یقین کر لیا، (مولف)

تو ہمیشہ اس کا اعتقاد صورِ خیالی کے ذریعہ سے ہوا کرتا ہے، جو جماعت کے ذہن میں پیدا ہوتے
ہی واقعات کی اصلی حقیقت کو کچھ سے کچھ کر دیتی ہیں، ایک واقعہ جو نہایت سادہ ہوتا ہے،
جماعت کے مخیلہ میں آکر اسکی صورت بالکل بدل جاتی ہے، اور اسکی اصل وجہ یہ ہوتی ہے،
کہ جماعت صرف انہی واقعات کا ادراک کر سکتی ہے، جو تمثیلی رنگ میں اس صورت سے
اس کے سامنے پیش کئے جائیں، کہ شدتِ مبالغہ کی بدولت اُن واقعات کی ذہنی صورت
اور اصل حقیقت کے مابین کوئی ادنیٰ علاقہ بھی باقی نہ رہا ہو، اس حالت کا ادراک
ہم بخوبی اُس وقت کر سکتے ہیں جب ہم اپنے ذہن میں اُن اجنبی ذہنی اشکال وصور کی
یاد تازہ کریں جو کبھی کسی واقعہ کی تصور کرتے وقت ہمارے ذہن میں پیدا ہوئی تھیں
البتہ ہمارے اور جماعت کے مابین جو فرق ہوتا ہے، وہ یہ ہے کہ ہماری عقل ہمکو اس مناسبت
اور تفارق سے آگاہ کرتی رہتی ہے، جو ان مذہبی صور اور اصل واقعات کے درمیان
ہوتا ہے لیکن چونکہ جماعت کی قدرت سے یہ تمیز باہر ہوتی ہے، اور جو کچھ اُس کے ذہن میں
آتا ہے اسے وہ بلا نقد کئے ہوئے اصل حادثہ کی جانب کرنے کی عادی ہے، اسلئے وہ
خود کسی شے اور اسکی ذہنی صورت کے باہمی فرق کا ادراک نہیں کر سکتی، بلکہ تمام اُن خیالات
اور ذہنی صورتوں کو جذب و ہضم کر لیتی ہے، جو اس کے ذہن میں پیدا ہوں، حالانکہ اغلباً
ان ذہنی صور کو اصلی واقعات سے کوئی نسبت نہیں ہوتی،

پھر چونکہ وہ افراد جن سے جماعت کی تشکیل ہوتی ہے، ان کے امزجہ باہم بالکل
مختلف اور متبائن ہوتے ہیں، اس لحاظ سے ہونا تو یہ چاہئے، کہ ذہنی اشباح جو کسی واقعہ
کے تصور کے وقت جماعت پیدا کر لیتی ہے، افراد کے اختلافِ طبائع کی بنا پر مختلف قسم
کی ہوں، لیکن تجربہ سے اس کے خلاف یہ معلوم ہوتا ہے کہ بجائے اسکے کہ یہ ذہنی صورتیں

مختلف ہوں، بالکل یکساں ہوتی ہیں، بلکہ ہوتا یہ ہے کہ پہلے جماعت کے کسی ایک فرد کے ذہن میں کسی واقعہ کا تصور کرتے وقت ایک ذہنی صورت پیدا ہوتی ہی، جو مثل خمیر کے ہوتی ہے، اور اس کے بعد قانونِ تعدیہ کی بنا پر اسی خمیر کے آب و گل سے باقی افراد کے ذہنوں کے اندر بھی یہی ذہنی پیکر اور یہی خیالی مرقع تیار ہو جاتا ہے، مثال کے طور پر ہم کہتے ہیں کہ قبل اس کے کہ تمام صلیبیوں کو بیت المقدس کی چار دیواری پر سینٹ جارج کی صورت نظر آتی فطری بات تھی کہ سب سے پہلے کسی ایک فرد کے تخیل میں یہ تصویر آئی ہوگی، اسکے بعد جماعت کی اثرپذیری اور تعدیۂ اثر کی خصوصیتوں نے اس تخیل کو ایک جسم مرئی کی صورت میں لاکر تمام افراد کے پیشِ نظر کر دیا ہوگا،

یہی حالت ان تمام ذہنی صورتوں کی ہوتی ہی، جن کو تاریخ نے روایت کے ذریعہ سے ہم تک پہنچایا ہی، اور جن پر اس وجہ سے حقیقت کا ملمع چڑھا ہوا ہی، کہ لکھوکھا آدمیوں نے بیک وقت اپنی آنکھوں سے ان کا مشاہدہ کیا،

لیکن اب یہاں پر یہ سوال قدرتی طور پر پیدا ہوتا ہے، کہ آخر جماعت میں بہت سے افراد ایسے بھی ہوتے ہیں، جو عقل و ذکاوت سے بہرہ مند ہوتے ہیں، وہ کس طرح ان ذہنی اشکال و اشباح کی حقیقت کو تسلیم کر لیتے ہیں؟ اس کا جواب یہ ہے، کہ جماعت کی اس خصوصیت یعنی اثرپذیری اور زود اعتقادی میں عقل و ذکاوت بالکل کام نہیں دیتی، اور عالم و جاہل دونوں کی حالت اس بارہ میں یکسان ہوتی ہی کہ وہ جب تک جماعت میں شامل رہتے ہیں، تعقل و تمیز کی قدرت نہیں رکھتے، اور اگرچہ معترض یہ کہہ سکتا ہی، کہ یہ خیال کہ جماعت میں عالم و جاہل دونوں مساویانہ حیثیت سے تعقل و تمیز کی صلاحیت نہیں رکھتے سفسطۂ محض ہے، گو اس میں بھی شک نہیں کہ اپنے

دعویٰ کے اثبات کے لئے ہمیں بہت سے تاریخی واقعات دہرانا پڑیں گے، جن کے لئے ایک دفتر کی حاجت ہے، لیکن چونکہ ہم ناظرین کو غیر مدلل قضایا کے سامنے تاریکی میں نہیں چھوڑنا چاہتے، اسلئے اپنے دعوی کے ثبوت میں متعدد شہادتیں سپرد قلم کرتے ہیں، سب سے پہلے ہم وہ واقعہ نقل کرتے ہیں، جو ہمارے دعوی کی جلی شہادت ہے؛ کیونکہ اس واقعہ میں خیالی صورت جن افراد کے ذہنوں میں پیدا ہوتی ہے وہ مختلف قسم کے لوگ تھے، ان میں جاہل بھی تھے اور عالم بھی، یہ واقعہ ایک بحری لفٹنٹ جولین نیلکس نے اپنی کتاب "بحری سفرنامہ" میں درج کیا ہے، اور اس سے قبل مجلہ علمیہ (سائنٹفک میگزین) میں بھی شائع ہوچکا ہے، وہ لکھتا ہے:-

"آہن پوش جہاز بیل پول سطح آب پر جہاز لیر سو کو جو ایک سخت طوفان کے باعث گم ہوگیا تھا، تلاش کر رہا تھا، موسم خوشگوار اور آفتاب نور افگن تھا کہ ناگاہ چلتے چلتے ایک جھنڈی دکھائی دی، جو ایک غرق ہونے والی کشتی کی جانب اشارہ کر رہی تھی، جہاز پر جتنے آدمی تھے سب نے دیکھا کہ ایک جہاز جو آدمیوں سے پُر ہے، غرق ہو رہا ہے، اور لوگ شور وغل مچا رہے ہیں، یہ سب کچھ تخیل تھا، لیکن کپتان نے فوراً ایک کشتی ان ناامیدوں کے بچانے کے لئے سمندر میں چھوڑ دی، ہم جتنا قریب ہوتے جاتے، آدمیوں کی چیخ پکار زیادہ سنائی دیتی، لیکن جب منزلِ مقصود پر پہونچے تو وہاں بجز درختوں کے جو برگ وبار سے لدے ہوئے تھے، اور کچھ نہ تھا، نہ کوئی جہاز غرق ہوا تھا، اور نہ کسی آدمی کا پتہ تھا، جوں ہی اصل حقیقت آشکارا ہوئی تخیل رفوچکر ہوگیا"

اس واقعہ سے بڑھکر کیا کوئی دوسری مثال پیش کیجا سکتی ہے، جو جماعت کی اس خلاقی قوتِ مصورہ کے وجود پر کافی ضمانت ہو سکے، اور جس سے یہ پتہ چلتا ہو کہ جماعت کس عجیب و غریب طریقہ سے ایک خیالی صورت اپنے ذہن میں پیدا کر لیتی ہے، اور اسکی صحت پر اس شدومد سے یقین کرتی ہے کہ اس کے متعلق شک و ابہام کی گنجائش ہی نہیں رہتی، دیکھو اس واقعہ میں ایک طرف ایک جماعت حالتِ انتظار و استعداد میں محو تھی اور دوسری جانب شاہد مقصود کی ایک جھلک اُسے دکھائی دی، خیال تو کرو کہ یہ کتنا قوی موثر تھا، جس کے اثر سے جہاز پر جتنے لوگ تھے سب مسحور ہو گئے، اور سب نے اس خیالی صورت کو واقعہ سمجھ لیا،

پھر جماعت کا اشیاء کی اصلی حقیقت کو نہ سمجھنا، اور واقعات کو غیر مربوط تخیلات کی شکل میں منتقل کرنا، اس کے لئے کچھ اسکی بھی ضرورت نہیں کہ جماعت کی تشکیل ایک جم غفیر سے ہوئی ہو، بلکہ جب چند افراد اکٹھا ہو جاتے ہیں، تو گو یہ سب کے سب اکابر علماء سے ہوں لیکن جماعت کی تشکیل ہوتے ہی ان میں بھی وہ اوصاف پیدا ہو جاتے ہیں، جو عموماً جماعتوں میں پائے جاتے ہیں، ان میں کا ہر فرد ایسے اوصاف کا جامہ پہن لیتا ہے، جو اگرچہ اسکی خصوصیت علمی کے بالکل خلاف ہوتے ہیں لیکن تشکیلِ جماعت کیلئے ضروری ہیں اور انہیں کا ہر فرد فی الفور محروم التمیز اور مسلوب العقل ہو جاتا ہے، اس حقیقت کی ایک عجیب و غریب مثال ایک وہ واقعہ ہی جو ایک مشہور ماہرِ نفسیات موسیو ڈیوی کے حیرت انگیز طلسمی اعمال کے متعلق مشہور ہے جسے ہمارے زبان کے مشہور رسالہ روزنامہ "علم النفس" نے اپنی ایک قریبی اشاعت میں شائع کیا ہے، وہ واقعہ یہ ہے کہ ایکبار موسیو ڈیوی نے یورپ کے سائنسداں ماہرین کو جنمیں انگلستان کا مشہور عالم مسٹر ولیس بھی تھا، اس بات کی دعوت دی کہ ایک جگہ جمع ہو کر اس کے حیرت انگیز طلسمی اعمال

کا مشاہدہ کریں، جب سب لوگ جمع ہو گئے، تو موسیو ڈیوی نے انکے سامنے کچھ چیزیں پیش کیں
اور ان کو اجازت دی کہ ان اشیاء پر جہاں جہاں چاہیں مہر لگا دیں، پھر ان کے سامنے موسیو ڈیوی
نے تمام وہ طریقے استعمال کئے جو فن استخدام ارواح اور فن تجسیم ارواح میں استعمال کئے
جاتے ہیں، یہ اعمال اس قدر حیرت انگیز تھے کہ ان کو دیکھکر سارے مجمع نے جو اکابر علماء پر مشتمل
تھا، موسیو ڈیوی کو اس مضمون کے سارٹیفکٹ دیئے، کہ جو باتیں اسوقت ہمارے سامنے گذریں
وہ طاقت بشری سے بالاتر تھیں، لیکن جب یہ سارٹیفکٹ موسیو ڈیوی کے ہاتھ میں آگئے تو اسوقت
اس نے مجمع کے سامنے اقرار کیا کہ یہ سارے کا سارا کھیل صرف ایک شعبدہ تھا، اس واقعہ کا
راوی کہتا ہے کہ موسیو ڈیوی کے حیرت انگیز اعمال کے مشاہدہ کرنے سے جس بات پر حیرت
ہوتی ہے، وہ اس کی مہارت اور صفائی نہیں ہے، بلکہ حیرت اس بات پر ہوتی ہے، کہ ان
لوگوں نے اس کو سارٹیفکٹ کس طرح دیدیئے، اور اس بات پر کہ سارٹیفکٹ
دینے والوں نے ایسے بہت سے واقعی افسانے بیان کئے، جو سب کے سب جھوٹے تھے جو باتیں
ان لوگوں نے اپنے روایت کردہ واقعات کے متعلق بیان کیں، وہ اگر صحیح مان لیجائیں، تو پھر ان
واقعات کو شعبدہ کہنا غلط ہوگا، نیز اس بات پر سخت حیرت ہوتی ہے، کہ موسیو ڈیوی کو اس
قسم کے اعمال کی کس طرح جرأت ہوئی، حالانکہ وہ محض شعبدہ تھے، اور ایک مجمع پر ان کا
اس قدر شدید اثر پڑا، کہ جو اس وقت تم نہیں دیکھ سکتے، وہ اُنھوں نے دیکھ لیا، یہ کون سا
اثر تھا؟ یہ اسی قسم کا اثر تھا، جو مسمریزم کا عامل معمول پر ڈالتا ہے، پھر جب کہ مذکورۂ بالا واقعہ سے
یہ معلوم ہو گیا، کہ اس قسم کا اثر روشن دماغ لوگوں پر بھی ڈالا جا سکتا ہے، تو اب جماعت
کی معمولی عقلوں میں اس تاثیر کے عمل سے کون انکار کر سکتا ہے،

غرض مذکورۂ بالا دعوے کے ثبوت میں ہمارے پاس متعدد شہادتوں کا ایک انبار

موجود ہیں، جن کا نقل کرنا موجب تطویل ہوگا، البتہ ذیل کے واقعہ کا ذکر کردینا ضروری معلوم ہوتا ہے،

مصنف کتاب کو مرتب کررہا تھا کہ اخبارات میں زور وشور کے ساتھ یہ خبر شائع ہوئی کہ دو لڑکیاں دریائے سین میں غرق ہوگئیں، اوران کی لاش دریا سے نکال کے مجمع کے سامنے رکھی گئی، تو متعدد شاہدوں نے ان کی شناخت کی، یہ شہادتیں اس قدر زبردست تھیں کہ آخر کارججوں کو بھی ان شہادتوں کا یقین آگیا، اور اُنھوں نے دونوں کے دفن کئے جانے کی اجازت دیدی، لوگ دفن کا سامان کرہی رہے تھے کہ وہ لڑکیاں جن سے یہ لاشیں مشابہ تھیں اور جن کے شبہہ پر شاہدوں نے گواہی دی تھی، اتفاقیہ طور پر آگئیں، اور اب یہ معلوم ہوا کہ تمام شاہدوں کو شبہہ ہوگیا تھا، حالانکہ ان لاشوں اور زندہ لڑکیوں کے مابین کچھ یوں ہی سی مشابہت تھی، جو مغالطہ شاہدوں کو یہاں ہوا وہ بعینہ وہی ہے جس کا اوپر کی مثالوں میں تذکرہ کیا جاچکا ہے اور وہ یہ ہے کہ پہلے شاہد اول کے ذہن میں ایک معمولی تشابہ کی بنا پر یہ خیال گذرا کہ یہ غرق شدہ لاشیں غالباً فلاں اور فلاں کی بیٹیوں کی ہیں اور محض اس خیال کے پیدا ہوتے ہی اُس نے گواہی دیدی، پھر بقیہ شاہد بھی تعدیۂ اثر کی بنا پر اسکے اثر سے متاثر ہوگئے، اور اُنھوں نے بھی اپنی شہادتوں سے شاہد اول کی تائید کی،

ان واقعات میں جماعت کی اثر پذیری کا پہلا درجہ یہ ہوتا ہے، کہ پہلے ایک شخص کے ذہن میں چند مبہم مشابہتوں کی بنا پر ایک خیال پیدا ہوتا ہے، اور اس شدت سے اُس کے ذہن میں گھر کرتا ہے، کہ معلوم ہوتا ہے کہ اس شخص کی رائے یہی ہے، پھر اس کے بعد اسی خیال سے کچھ لوگ اور اثر پذیر ہونا شروع ہوتے ہیں، پس اب اگر وہ پہلا شخص جس کے سامنے پہلے واقعہ گذرا ہے، سریع التاثر ہے، تو بس اس کے لئے اتنی ہی بات کافی ہوتی ہے، کہ لاش میں جو اسکے سامنے پیش کی گئی ہے، کوئی علامت ایسی پائی جاتی ہو، جو کسی

دوسرے زندہ شخص کے جسم میں بھی پائی جاتی ہے، اور جیسے یہ شخص پہلے دیکھ چکا ہی بس اتنے سے تشابہ پر اس شخص کو یقین ہو جائیگا کہ یہ جسم وہی پہلا جسم ہی خواہ واقع میں ان دونوں جسموں میں کوئی مشابہت بھی ہو یا نہ ہو، اور اب اس تخیل کا اثر اس قدر قوی ہو جاتا ہی، کہ حد ادراک میں اس کے قدم رکھتے ہی قوت ممیزہ بالکل مسلوب ہو جاتی ہی، اور ملکۂ انتقاد بالکل فنا ہو جاتا ہے، اس حالت میں یہ شخص وہ نہیں دیکھتا جو اسکی نظر کے سامنے ہوتا ہے، بلکہ وہ دیکھتا ہی جو اس کے تخیل کے اندر ہوتا ہی،

اسی واقعہ سے ملتا جلتا ایک دوسرا واقعہ اور ہے اور اس میں بھی شاہدوں نے اسی قسم کی غلط شناخت کی جیسی کہ اس واقعہ میں کی تھی، بلکہ اس واقعہ میں حیرت انگیز امر یہ ہے کہ ایک عورت اپنے بیٹے کی غلط شناخت کرتی ہے، یہ واقعہ گو کسی قدر پرانا ہو گیا ہی، تاہم اخبارات میں اب اس کا ذکر آیا ہی، وہ واقعہ حسب ذیل ہی:۔

"شہر پیرس میں کسی مقام پر کسی بچہ کی لاش پڑی ہوئی ملی، اتفاقاً ایک دوسرا لڑکا ادھر آ نکلا، اور اُس نے بیان کیا، کہ یہ میرے ایک ہمدرس دوست کی لاش ہی، دوسرے دن اُس کی ماں طلب کی گئی، وہ لاش کو دیکھتے ہی چلا اُٹھی کہ یہ میرا بچہ ہے، جو ماہ جولائی سے لاپتہ ہو گیا تھا، لوگ اُسے پکڑلے گئے اور اب اسے قتل کر کے اس مقام پر چھوڑ گئے، اس عورت کا نام چاونڈریٹ تھا، اس کے بعد اسکی ماں کے بہنوئی کو اطلاع ہوئی جس نے آکر بیان کیا، کہ ہاں یہ میرے بھانجے فلیبر کی لاش ہی اس کے بعد ججوں نے مزید شہادتیں اور طلب کیں، جن میں اس لڑکے کے اسکول ماسٹر کی شہادت بھی تھی، اسکول ماسٹر نے لاش کی گردن میں سونے کا تمغہ دیکھ کر کہا کہ ہاں یہ لڑکا اسی عورت کا ہے، اور اس کی شناخت یہ ہے کہ اس لاش کے گلے میں

جو تمغہ پڑا ہوا ہی یہ وہی ہے، جو اس بچہ کو اسکول سے انعام میں ملا تھا، کیا کسی دعویٰ کی تائید میں اسے سے زیادہ قطعی الدلالت شہادت آسانی سے تصور میں آسکتی ہی، لیکن واقعاتِ مابعد سے ثابت ہوگیا، کہ یہ تمام ذخیرۂ شہادت مجموعۂ خرافات تھا، چھ ہفتہ کے بعد پتہ لگا، کہ واقعۃً جس لڑکے کی یہ لاش تھی، وہ پیرس کا تھا ہی نہیں، اور یہ لاش شہر بورڈو کے ایک لڑکے کی ہے، جسے ایک کمپنی شہر پیرس میں اٹھا لائی ہے، چنانچہ بالآخر خالو، استاد، کلاس فیلو اور دیگر معزز گواہوں میں سے سب نے اپنی غلط شناسی کا اعتراف کیا۔[1]

لیکن واقعاتِ بالا کے متعلق یہ پیشِ نظر کر لینا بھی ضروری ہی کہ اس قسم کی غلط شہادتیں عموماً عورتیں اور بچے اور وہ افراد پیش کرتے ہیں جو دوسروں سے زیادہ سریع التاثر اور زود اعتقاد ہوتے ہیں،

اس حقیقت کو پیشِ نظر رکھکر ہمیں اس قسم کی تمام شہادتوں کی قدر و قیمت کا اندازہ ہو جائیگا جو عموماً عدالتوں میں پیش ہوتی ہیں، عام طور پر تمام ججوں کی متفقہ شہادت ہے، کہ سنِ طفولیت میں آدمی جھوٹ نہیں بولتا، حالانکہ میں کہتا ہوں کہ یہ لوگ اگر نفسیات سے کسی قدر واقف ہوتے تو ان کو معلوم ہو جاتا کہ آدمی اس عمر میں ہمیشہ جھوٹ بولتا ہے، گو اس کا جھوٹ معصومانہ ہوتا ہے، لیکن وہ جھوٹ ضرور بولتا ہی،

ہاں تو ہم پھر اپنے گذشتہ بیان کی طرف رجوع کرتے ہیں، ہم کہہ یہ رہے تھے کہ جماعت کے اقوال اور شہادتیں عموماً سب سے زیادہ غلط ہوتی ہیں، اور جماعت کی شہادت کا مطلب یہ ہوتا ہے، کہ شہادت جو جماعت پیش کر رہی ہے، ایک فرد کا

[1] اخبار "اکلیر"، ۱۲ اپریل ۱۸۹۵ء،

خیال ہے، جو تمام افراد کے ذہنوں میں متعدی ہو گیا ہے، اس قسم کی مثالیں کہانتک پیش کی جائیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ جماعت کی شہادت پر یقین کرنے سے ہمیں احتراز کرنا چاہئے، اس کلیہ کی ایک بڑی مثال یہ ہے کہ سب جانتے ہیں کہ واٹرلو کے واقعہ میں کس قدر لوگ شریک تھے، لیکن ابتک اختلاف آرار کے باعث یہ پتہ نہ چلا کہ اس حملہ کا کمانڈر کون تھا، یہانتک کہ مشہور انگریز جنرل لارڈ ولزلی نے اب جو کتاب شائع کی ہے، اس میں تصریح کی ہے کہ راویوں نے واقعات کی روایت میں سخت دھوکے کھائے ہیں، حتیٰ کہ جنگ سیڈان کے ان واقعات کی روایت میں بھی جن کی صحت پر ہزاروں آدمیوں کا اجماع ہو چکا ہے[1]،

[1] اس میں بالکل شک نہیں کہ ہمیں کسی جنگ کی اصلی حقیقت کا کچھ علم نہیں ہوتا، اور اس بارے میں جو کچھ ہمارے معلومات ہوتے ہیں، وہ یہ ہوتے ہیں، کہ غالب کون اور مغلوب کون ہوا، اور اسکے علاوہ ہمیں کسی بات کا علم نہیں ہوتا، میرے خیال میں ڈی ہارکوٹ نے جنگ سولفرینو کی بابت جو کچھ لکھا ہے، وہ ہر جنگ پر صادق آتا ہے، وہ لکھتا ہے :-

"قائدین عساکر اپنی اپنی رپورٹیں متعدد سپاہیوں کے اقوال کی بنا پر پہلے تحریر کرتے ہیں، اب انہی رپورٹوں کو سامنے رکھ کر ذمہ دار افسر احکام جاری کرتے ہیں، اور آخری رپورٹ تحریر کرتے ہیں، لیکن یہ تحریر جب قائد عام (فیلڈ مارشل) کے سامنے پیش کیجاتی ہے، تو وہ جھلا کر کہتا ہے کہ یہ رپورٹ تم نے غلط لکھی ہے، اسکے بعد وہ خود اس رپورٹ کے بجائے اپنی رپورٹ مرتب کرتا ہے جس میں اصلی حقیقت کچھ سے کچھ ہو جاتی ہے" جنگ بنے کورر کے متعلق ڈیوک ہارکوٹ نے یہ واقعہ اس غرض سے تحریر کیا ہے کہ اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ مشہور واقعات کی اصلی حقیقت دریافت کرنا بہت مشکل ہے، حتیٰ کہ ان واقعات کی حقیقت بھی جو فوراً ضبط تحریر میں لے آئے جائیں، (مولف)

غرض جماعتوں کی شہادتیں جس قسم کی ہوتی ہیں، واقعات بالا سے انکی قدر و قیمت کا خوب اچھی طرح اندازہ ہوسکتا ہے لیکن باوجود اس کے یہ عجیب بات ہی کہ منطقیین نے متعدد اشخاص کے کسی مسئلہ پر متفق ہو جانے کو اُن قطعی دلائل میں سے شمار کیا ہی، جو کسی امر کے ثابت کرنے کے لئے کافی ہوتے ہیں، بخلاف اس کے نفسیات سے جو بات ہمیں انکے متعلق معلوم ہوتی ہی، اور علم النفس جس جانب ہمیں ہدایت کرتا ہی، وہ یہ ہے کہ شک اور اصلی شک کی گنجائش انہی وقائع میں ہوتی ہے، جن کو ایک جم غفیر نے روایت کیا ہو، اور اس بنا پر منطقیین کی خدمت میں ہمارا مشورہ یہ ہی، کہ وہ ذرا تکلیف کر کے متواترات کی بحث پر ایک عمیق نظر اور ڈالیں، تاکہ اس بحث کی اچھی طرح تنقیح ہو جائے، یہ کہنا کہ اس واقعہ کو بیک وقت متعدد لوگوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہی، یا فلاں واقعہ کے متعلق شہادتِ عینی کا یہ بیان ہی، اس کا اغلباً دوسرے الفاظ میں یہ مطلب ہوتا ہی کہ جماعت جو شہادت پیش کر رہی ہی، اصل میں واقعہ اس سے بہت مختلف ہی،

غرض اس پوری بحث کا نتیجہ یہ نکلتا ہے، کہ تاریخی کتابوں کو صرف اس نگاہ سے دیکھنا چاہئے کہ گویا ان کو وہم وخیال نے تصنیف کیا ہی، اور بہت سے ایسے خرافات اور خیالی واقعات ان میں مندرج ہیں، جن کا وقوع مشکوک ہی، اور جن پر بعد کو بہت سے حاشئے چڑھائے گئے ہیں، اس بنا پر میرا خیال یہ ہی کہ واقعاتِ تاریخی کی ترتیب و تدوین میں اپنے وقتِ عزیز کے خون کرنے سے یہ بہتر ہے، کہ انسان کسی دوسرے ذلیل کام کرنے میں مشغول رہے، صفحاتِ تاریخ میں جن اعاظم رجال کے کارنامے درج ہیں، انکی حالت یہ ہی کہ قوموں کے وہم وخیال نے انکی اصلی حقیقت کو کچھ سے کچھ کر دیا ہی، ہیرکلیز، بدھ، اور دیگر تاریخی اشخاص کے کارنامے صرف قوموں کے وہم وخیال کے نتائج ہیں، انکی اصلی زندگی

کچھ اس قدر زیادہ اہم نہ تھی جتنی بعد کو کردی گئی، اور حقیقت یہ ہے کہ چونکہ بڑے سے بڑا شخص بھی جماعت کو اثر پذیر کرنے میں اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتا، تاوقتیکہ وہ اپنی زندگی کو ایک مافوق العادۃ صورت میں دنیا کے سامنے پیش نہ کرے، اسلئے اسکی زندگی کے واقعات کا بعد کو کچھ سے کچھ ہو جانا ایک ناگزیر امر ہوتا ہے،

پھر ان مراحل کو طے کرنے کے بعد دوسری نحوست یہ پیش آتی ہے کہ باوجودیکہ یہ قصے اور کارنامے کتابوں کے اندر محفوظ کر دیئے جاتے ہیں، لیکن جماعت کا بدقسمت تخیل یہاں بھی اُن کا پیچھا نہیں چھوڑتا، اور وہ برابر ان میں تحریف کرتا رہتا ہے، مثال میں دیکھو کہ وہ خونخوار یہواہ جس کا تذکرہ توراۃ میں ہے، اور وہ یہواہ جو محبت کا دیوتا ہے اور جس کا ذکر سینٹ پیٹر نے کیا ہے، ان دونوں میں کتنا فرق ہے، پھر دیکھو کہ وہ گوتم بدھ جسکی پرستش چین میں ہوتی ہے، اور وہ بدھ جس کی پرستش جاپان اور ہندوستان میں ہوتی ہے، ان دونوں میں اب کون سی مشابہت باقی رہی ہے،

اعاظمِ رجال کے حالات و واقعات میں جماعت کا بدقسمت وہم و تخیل جس طرح تحریف سے کام لیتا ہے، اسکے لئے کچھ زیادہ مدت گذرنے کی بھی ضرورت نہیں ہوتی، بلکہ اکثر یہ ہوتا ہے کہ یہ انقلاب چند سالوں کے اندر اندر دیکھتے ہی دیکھتے ہو جاتا ہے، ہم نے اعاظمِ رجال میں سے ایک بڑے شخص کی تاریخ پڑھی ہے، جس نے پچاس برس سے بھی کم مدت میں مختلف صورتیں بدلیں، آل بوربون کے زمانہ میں نپولین کی تصویر لوگوں کے ذہنوں میں یہ تھی کہ وہ ایک محبِ انسانیت، آزاد منش اور بیکسوں کا غمگسار ہے، اور اگر شاعروں کا قول درست ہو تو وہ ایسا شخص ہے کہ جسکی یاد بیکسوں کی جھونپڑیوں میں مدتوں تازہ رہے گی، پھر تیس برس کے بعد وہی نپولین ایسا پلٹا کہ اب وہ لوگوں کو استبداد کا دیوتا ظالم و

جفاکار اور لوگوں کی آزادی سلب کرنے والا نظر آنے لگا، لیکن اسکے بعد ہم نپولین کو
ایک دوسرے ہی رنگ میں پاتے ہیں، یوں ہی انقلاب ہوتے ہوتے ایک زمانہ وہ آئیگا کہ
اس زمانہ کے لوگ متناقض خیالات و آرار سے گھبرا کر سرے سے اس کے وجود ہی سے
انکار کرنے لگیں گے، جیسا کہ اس وقت بعض لوگ گوتم بدھ کے وجود میں شک کرتے ہیں،
اور یہ سمجھتے ہیں، کہ وہ بھی یونانی پہلوان ہیرکلیز کی طرح ایک خیالی انسان تھا، البتہ لوگ ان
کے احوالِ جماعت کی واقفیت کی بدولت جتنا جتنا یہ معلوم ہوتا جائیگا، کہ تاریخ صرف خرافات
اور توہمات اور خیالی واقعات کے باقی رکھنے کی کوشش کرتی ہے، اسی قدر وہ کسی امر کے
متعلق شک ظاہر کرنے اور اصلی حقیقت کے پوشیدہ رکھنے کی وجہ سے عمیق حزن و غم زیادہ
محسوس کرتے جائیں گے،

(۳)

جماعت کی مبالغہ پسندی سادہ لوحی

مشاعر جماعات، خواہ کسی طرح کے ہوں، یعنی مفید ہوں یا غیر مفید، مضرت رساں
ہوں یا فائدہ رساں، نیک ہوں یا بد، ہر صورت میں انکے دو مخصوص اوصاف ہوتے ہیں
نہایت سادگی اور بے انتہا مبالغہ آمیزی، لیکن جس طرح اور دیگر خصائص کے اعتبار
سے افراد جماعت اور وحشی انسانوں کے مابین بہت کم فرق ہوتا ہے، اسی طرح ان دو
خصائص میں بھی افراد جماعت اور وحشی انسان بہت کچھ ایک دوسرے سے مشابہ ہوتے
ہیں، وحشی انسانوں کے افراد جماعت بھی فاقد التمیز ہوتے ہیں، ان کی نظر تمام اشیار پر
یکساں پڑتی ہے، اور اشیار کے باہمی فروق کا ادراک نہیں کر سکتے، جماعت اپنے مشاعر و

احساسات میں مبالغہ پسند کیوں واقع ہوئی ہے؟ اس کا بڑا سبب یہ ہے کہ ہر احساس جو اسمیں پیدا ہوتا ہے، جماعت کے خاصۂ اثر پذیری کی بدولت تمام افراد میں پھیل جاتا ہے، اور پھر تمام افراد جو ایک دم اسکو قبول کر لیتے ہیں، تو اس وجہ سے اور اسے قوت حاصل ہو جاتی ہے،

جماعت کی مبالغہ پسندی اور سادہ لوحی کا ایک نتیجہ یہ بھی ہے، کہ جماعت شک و تردد سے ناآشنائے محض اور عورتوں کی طرح بہت زیادہ انتہا پسند ہوتی ہے، جماعت کو اول تو کسی امر کے متعلق شک و شبہہ لاحق ہی نہیں ہوتا، لیکن جب کسی امر کے متعلق اسکے ذہن میں شک پیدا ہوتا ہے، تو نہایت قوت کے ساتھ پیدا ہوتا ہے، حالتِ انفرادی میں گو انسان کبھی کسی امر کا اقرار کرتا، اور کبھی کسی بات سے نفرت کا اظہار کرتا ہے، کبھی کسی بات کو مانتا اور کبھی کسی بات کے متعلق شک کرتا ہے، لیکن جماعت میں شامل ہو کر اسے جب کسی بات سے نفرت پیدا ہوتی ہے، تو نفرت حقدِ شدید، شک انکارِ شدید اور رغبت نفرت کی صورت اختیار کر لیتی ہے،

یوں تو تمام جماعتیں مبالغہ پسند اور انتہا پسند ہوتی ہیں، لیکن خصوصیت سے یہ وصف اُن جماعتوں میں زیادہ نمایاں نظر آتا ہے، جن کی ترکیب مختلف اصناف کے افراد سے ہوتی ہے، چونکہ ان جماعتوں میں توازنِ اعمال مفقود ہوتا ہے، اسلئے ان جماعتوں سے وہ اعمال سرزد ہوتے ہیں، جن کا صدور ایک فرد سے بالکل محال ہوتا ہے، کیونکہ ہر شخص یہ جانتا ہے کہ نتیجۂ بد میں وہی اکیلا مبتلا نہ ہوگا، پھر جماعت جس قدر زیادہ افراد سے مرکب ہوتی ہے، اسی قدر اس میں یہ اعتقاد شد و مد سے پیدا ہوتا ہے، یہاں آکر بزدل، نامرد، جاہل اور حاسد اپنے اپنے انحطاط اور ضعف کو فراموش کرکے ایک وقتی خیال کی بنا پر وحشی اور خونخوار بن جاتے ہیں،

لیکن بدقسمتی یہ ہے کہ جماعت کا غلوِ مشاعر عموماً بد اخلاقی میں زیادہ نمایاں ہوتا ہی اور یہی وصف (یعنی بد اخلاقی) ہے، جو اس زمانہ کے لوگوں نے اپنے اجداد سے ورثہ میں پایا ہے، یہی بد اخلاقی کے مشاعر ہیں جنکو افراد حالتِ انفرادی میں عقاب اور سزا کے خوف سے اپنے ذہنوں سے نکالنے کی کوشش کرتے ہیں، لیکن جماعت میں اگر اسی قسم کے مشاعر کا زیادہ زور ہوتا ہے، اور یہی وجہ ہی کہ بُرے سے بڑے کام اور بد اخلاقی کی جانب جماعت کو مائل کرنا زیادہ آسان ہوتا ہی،

لیکن اگر ہوشیاری کے ساتھ اسکی قیادت کیجائے، تو اکثر اس سے عمدہ اور بہترین افعال بھی سرزد ہوتے ہیں، بلکہ عظائم اعمال کے انجام دینے کی صلاحیت اس میں افراد سے کچھ زیادہ ہی پائی جاتی ہی، ہم عنقریب اس مسئلہ کے متعلق اس مقام پر بحث کریں گے، جہاں جماعت کے اخلاق کا ذکر آئیگا،

چونکہ جماعت اپنے مشاعر و احساسات میں حد درجہ مبالغہ پسند ہوتی ہی اس لئے اس پر انہی مشاعر و احساسات کا اثر ہو سکتا ہے، جو مبالغہ سے پُر اور حدِ اعتدال سے متجاوز ہوں، اور اسی لئے خطبا جو قوم کے قلوب کو اپنی جانب مائل کرتے ہیں، انکا کام یہ ہوتا ہی کہ وہ پہلے غیر معتدل اور مبالغہ آمیز تاکیدات اور تمثیل بیانی کے ذریعہ سے جماعت کے جذبات کو مشتعل کردیں، کیونکہ جماعت کے جذبات میں اگر اشتعال پیدا کیا جا سکتا ہی تو صرف اسی ذریعہ سے کہ مبالغہ آمیز تاکیدات کا استعمال کیا جائے اور عقلی استدلال سے کسی بات کے ثابت کرنے کی کوشش نہ کیجائے، یہی اور صرف یہی ذرائع ہیں جن سے خطبا جماعت کے جذبات کو مشتعل کر سکتے ہیں،

لیکن جماعت کے جذبات کو مشتعل کرنا تو ایک طرف جماعت اپنی مبالغہ پسندی

کی وجہ سے خود رہنمایوں اور قواد سے بھی اس بات کی منتظر و متوقع رہتی ہی، کہ ان سے بھی جماعت ہی کے ایسے افعال صادر ہوں، نیز یہ کہ ان کے القاب مفخم اور ان کے معنوی اور صوری فضائل میں زور اور عظمت ہو، اسی کا نتیجہ ہے، کہ جماعت تھیٹر اسٹیج پر ناٹکوں کے ہیروز (ابطال) کی بابت شجاعت اور ایسے محاسنِ اخلاق کی متوقع رہتی ہی، جو ابتک عالمِ وجود میں نہ آئے ہوں،

لیکن اکثر لوگ جماعت کے اس جذبہ اور میلان کو جس کا اظہار جماعت سے تھیٹر ہال میں ہوتا ہے، تھیٹر کے اُن خصوصیات کیجانب منسوب کرتے ہیں، جن کی وجہ سے تماشہ بینوں میں یہ جذبہ پیدا ہوتا ہے، بلا شبہہ اسٹیج کی تنظیم و ترتیب بھی ایک مخصوص فن ہی، جس کے آئین وضوابط مرتب ہیں، تاہم وہ ایسے قواعد ہیں، جو ذوقِ سلیم اور قوانینِ منطقیہ سے جوڑ نہیں کھاتے، اور واقعہ یہ ہے کہ گو فنِ خطابت عام لوگوں میں بہت انحطاط پذیر اور گرا ہوا ہی، لیکن جماعت کو مخاطب کرنا کوئی معمولی فن نہیں ہے، اسکے لئے بھی مخصوص اوصاف کی ضرورت ہوتی ہے، اکثر انسان جب کسی ڈراما کو اُٹھا کر دیکھتا ہی تو اُسکی مقبولیت کو دیکھ کر حیرت میں آجاتا ہے، یہاں تک کہ تھیٹر کے منیجر بھی جن کی خدمت میں یہ ڈرامے پیش کئے جاتے ہیں، خود ان کی مقبولیت کے بابت سوچ میں پڑ جاتے ہیں، بات یہ ہوتی ہے کہ یہ لوگ خود ڈراموں کی بابت کوئی حکم نہیں لگا سکتے، تاوقتیکہ یہ ڈرامے تماشہ بینوں کی ایک جماعت کے سامنے کئے نہ جائیں،[1]

---

[1] مذکورہ بالا بیان سے ہمیں اس بات کا سبب بھی معلوم ہوتا ہی، کہ کیا وجہ ہی کہ بعض اوقات تقریبًا تمام تھیٹر کی کمپنیاں جس ڈرامے کے کھیلنے سے انکار کر جاتی ہیں، وہی ڈراما پھر کچھ عرصہ کے بعد جب کھیلا جاتا ہی، تو مقبولیت کا درجہ حاصل کر لیتا ہی، موسیو کوبی کے ڈرامے تاج و تخت کی قربانی کی مقبولیت عام سے ہر شخص واقف ہے، باوجودیکہ دس سال تک تمام تھیٹر کمپنیاں اس کے کھیلنے سے انکار کرتی رہیں اور اور باوجودیکہ اس کے مصنف کی ادبی قابلیت ہر شخص پر روشن تھی، یہی حال (باقی ص۵۸ پر)

اگر اس بحث پر گفتگو کرنے کا موقع ہوتا، تو میں قومی اخلاق و عادات کی شدت تاثیر کے بابت بھی بہت تفصیل سے گفتگو کرتا، جماعت کے جذبات و احساسات میں قومی اخلاق وحیات کو جو اہمیت حاصل ہے، اس کا ایک نتیجہ یہ ہے کہ بعض اوقات اگر ایک ڈرامے کو کسی شہر میں مقبولیت حاصل ہو جاتی ہے، تو وہی ڈراما جب دوسرے شہر میں کھیلا جاتا ہے، تو اس کی جانب کوئی توجہ بھی نہیں کرتا، اس کا سبب یہی ہوتا ہے، کہ چونکہ قومی عادات وحیات کو جماعت کے جذبات وحیات میں بہت بڑا دخل ہوتا ہے، اس بنا پر دوسرے شہر میں جب یہ ڈراما کھیلا گیا، تو شاید حیاتِ قومی کے اختلاف کی وجہ سے وہ اس شہر کے تماشہ بینوں کے جذبات کو مشتعل کرنے میں جو اسکی کامیابی کا راز تھا، ناکام رہا، اور اس لئے اسے کسی نے پسند نہ کیا،

اب آخر میں مجھے یہ بیان کرنے کی تو شاید حاجت نہ ہوگی، کہ جماعت کی مبالغہ پسندی کا اثر صرف اس کے مشاعر و احساسات تک محدود رہتا ہے، اور قوتِ عاقلہ تک متعدی نہیں ہوتا، اسلئے کہ میں اوپر بیان کر چکا ہوں کہ افراد کی قوتِ عاقلہ جماعت میں شامل ہو کر بہت جلد

لہ (بقیہ حاشیہ صفحہ ۵۶) دوسرے ڈرامے لاماریین دی شادل کا بھی ہوا، ایک بار تمام کمپنیوں نے اس کے کھیلنے سے انکار کر دیا تھا، لیکن پھر جب ایک ایجنٹ نے زرِ کثیر خرچ کر کے اس کا ساز و سامان مکمل کیا، تو پھر وہ ایسا مقبول ہوا، کہ تقریباً دوسو بار فرانس میں اور ہزار سے زیادہ مرتبہ لندن میں کھیلا گیا، اگر ہم نے پہلے یہ نہ بیان کر دیا ہوتا، کہ تھیٹر کمپنیوں کے منیجروں کی نظر تماشہ بینوں پر پڑی رہتی ہے، تو اس بات کا سبب آسانی سے سمجھ میں نہ آسکتا کہ بعض اوقات تھیٹر کی کمپنیاں کسی ڈرامے کے کھیلنے سے پہلے ہی سے کیوں انکار کر دیتی ہیں اور اتنی فاش غلطی ان سے کس طرح سرزد ہوتی ہے، حالانکہ وہ ادبیات کے بڑے ماہر ہوتے ہیں اور پھر ڈراموں کے ایکٹ کرنے میں ان کے بہت سے مقاصد بھی مضمر ہوتے ہیں، جس کا نتیجہ تو یہ ہونا چاہئے تھا، کہ وہ اس قسم کے احکام لگانے میں عجلت نہ کرتے، اس عنوان پر میں مکمل بحث نہیں کر سکتا، کیونکہ اس موضوع پر صرف وہ شخص بحث کر سکتا ہے، جو موسیو کوبی کی طرح نفسیات اور ایکٹنگ دونوں فنون میں مہارت رکھتا ہو،

(مولف)

انحطاط پذیر ہو جاتی ہی، اور اسی باعث افرادِ اپنی قوت عاقلہ سے کسی طرح کا کام نہیں لے سکتے، اور اب ان کے افعال پر صرف ان کے جذبات و احساسات کا اثر پڑتا ہی، (یہ بات ایک بہت بڑے فاضل جج موسیو ٹارڈ کے تجربہ میں بھی آئی ہی، جب کہ وہ جماعت کے مجرمانہ افعال کی تفتیش و تحقیق کر رہے تھے) اور یہی وجہ ہوتی ہی، کہ جماعت ہمیشہ مشاعر و احساسات ہی کے دائرہ میں رہ کر ترقی یا تنزل اختیار کرتی ہی،

(۴)

جماعت کی قدامت پسندی و تعصب

ہم بیان کر چکے ہیں کہ جماعت کے مشاعر و احساسات میں ہمیشہ سادہ لوحی، اور انتہا پسندی کا اثر بہت زیادہ ہوتا ہی، اسی بنا پر جماعت کو جو عقائد یا خیالات تلقین کئے جاتے ہیں، ان کو یا تو وہ بالکل تسلیم کر لیتی ہی، یا سرے سے انکار کر دیتی ہی، انکار و اقرار کے متضاد جلوے یا تردد و شک کے آثار جو اکثر انفرادی حالت میں نظر آتے ہیں جماعت میں ان کا پایا جانا محال ہی، یہ حقیقت کسی شہادت کی محتاج نہیں، ہر شخص جانتا ہے کہ دینی متعقدات اپنے اپنے مخالف پہلو کے ابطال میں کس قدر زور دار اور قلوب پر غلبہ حاصل کرنے میں کس قدر طاقتور ہوتے ہیں،

لیکن چونکہ کسی امر کی حقیقت یا بطلانِ اعتقاد کی بابت جماعت کے سامنے باب شک مسدود ہو جاتا ہی، اور اس کے ساتھ ہی جماعت اپنی طاقت و قوت کے متعلق شعور تام رکھتی ہی، اسلئے اظہارِ تعصب کے ساتھ ساتھ، اس کا تسلط اور غلبہ بھی اسقدر قوت پکڑتا جاتا ہی کہ اُسے کسی قسم کے مناظرہ یا بحث مباحثہ کی تاب نہیں رہتی، افراد مناظرہ اور

مجادلہ کی طاقت رکھتے ہیں، لیکن جماعت نہ صرف یہ کہ ہمیشہ مناظرہ کے وقت سپر انداز ہوجاتی ہی، بلکہ غیظ و غضب کا اظہار کرنے لگتی ہی، یہانتک کہ اگر کوئی خطیب کسی مجمع کو مخاطب کرتے ہوئے مباحثہ یا مناظرہ شروع کرنا چاہتا ہی، تو سامعین کی جانب سے فوراً اس پر طعن وتشنیع شروع ہوجاتی ہے اور سبّ وشتم اور غصہ کی آوازیں بلند ہونا شروع ہوتی ہیں، پھر اگر وہ اس پر اور مصر ہوتا ہی، تو بلا کسی تاخیر کے مستوجب عتاب ہوجاتا ہے اور اگر اس مجمع کو پولیس کا خوف نہ ہو تو شاید وہ اس کے قتل کرنے میں بھی دریغ نہ کرے،

متعصبانہ جوش اور تسلط حاصل کرنے کا شوق، گو یہ دونوں اوصاف جماعت میں یکساں پائے جاتے ہیں، لیکن قومی اخلاق و عادات کا اثر جس طرح جماعت کے دیگر اوصاف میں ہمیشہ نمایاں رہتا ہے، اسی طرح قومی اخلاق و عادات کے اختلاف کی بنا پر ہر قوم میں یہ دونوں اوصاف بھی ہمیں مختلف درجہ کے نظر آتے ہیں، اور قوموں کے یہ اوصاف بھی دیگر اوصاف کی طرح موروثی مؤثرات کے تابع اور زیر اثر رہتے ہیں، لاطینی جماعتوں میں یہ دونوں جذبے اپنے موروثی مؤثرات کے ماتحت اس قدر اعلیٰ مرتبۂ کمال پر پہنچ گئے ہیں، کہ افراد کی روحِ استقلالی جو انیگلو سیکسن قوم کا ایک ممتاز خاصہ ہی، قوم کے شوقِ تسلط کے آگے بالکل پژمردہ ہوگئی ہی، یہانتک کہ اب لاطینی جماعتیں افراد کے استقلال کو برقرار رکھنے کے بجاے صرف جماعت ہی کے مجموعی استقلال کو برقرار رکھنے کی کوشش کرتی ہیں اور چونکہ استقلال کی اس نوع کا ایک اہم اور ممتاز خاصہ یہ ہوتا ہی، کہ قوموں میں اپنی مخالف رائے کے فنا کرنے اور اپنی مخالف جماعت کو بجبر اپنے موافق بنانے کا جذبہ اور میلان

پیدا ہو جاتا ہے، اسلئے حریت و استقلال کی یہی صنف ہے، جسے عموماً ہر زمانہ میں مخصوص خیالات کے جذبہ داروں اور معتقدوں نے دنیا میں رواج دینے کی کوشش کی ہی، لاطینی قوموں میں جب محکمۂ انکویزیشن (محکمۂ تفتیشِ جرائم) قائم ہوا تھا، اُس وقت سے لیکر ابتک ہمیشہ یہ قومیں لفظ حریت کا یہی مفہوم سمجھتی رہی ہیں اور ہمیشہ ان قوموں نے انفرادی استقلال کے بجائے جماعت کے مجموعی استقلال کی پرستش کی ہے،

غرض شوقِ تسلط اور تعصب یہ دو باتیں ہیں، جن سے جماعت خوب واقف ہوتی ہے، اور بوقتِ ضرورت ان سے کام بھی لیتی ہے، جماعت کے نزدیک قوت و طاقت ہی قابلِ احترام چیزیں ہیں، اسلئے وہ کبھی احسان سے متاثر نہیں ہوتی، کیونکہ اسکے نزدیک احسان کرنا دراصل ضعف کی علامت ہی، اور اسی بنا پر وہ ان لوگوں کی قیادت قبول نہیں کرتی، جو لینت اور نرمی کے خوگر ہوں، بلکہ ہمیشہ وہ جفاکاروں اور استبداد پسندوں کے تابعِ فرمان رہتی ہی، جماعت نے ہمیشہ جفاکاروں اور ظالموں ہی کی یاد تازہ رکھنے کے لئے ان کے اسٹیچو قائم کئے ہیں، اور جب کسی جفاکار کو اپنے پاؤں سے روندا ہی تو صرف اسلئے کہ اس کا اقتدار گھٹ گیا تھا، غرضکہ نفوس جماعت میں ہمیشہ جن لوگوں کے متعلق برتری اور عظمت کا اعتقاد پیدا ہوتا ہی، وہ وہی لوگ ہوتے ہیں، جن کا دبدبہ قیصری کی طرح زبردست ہوتا ہے، جن کی سطوت سے جماعتوں کے دلوں میں ہیبت طاری ہوتی ہی، اور جن کا رعب لوگوں کو مغلوب کر لیتا ہی، یہی وجہ ہے کہ جماعت ہمیشہ اس تہیہ میں رہتی ہی کہ ادھر حکمراں کی طاقت و قوت میں فرق آئے، اور اُدھر وہ فوراً علمِ بغاوت بلند کر دے، اور وہ اگر جھکتی بھی ہے تو اس کے سامنے جو مضبوطی سے اس پر اپنا اقتدار قائم کر لیتا ہے، اور جہاں اُسے کمزوری لاحق ہوئی، بس فوراً جماعت اپنے مخصوص مشاعر کے ماتحت بجائے سرگرم اطاعت ہونے کے

مصروفِ پیکار، اور بجائے سرِ تسلیم خم کرنے کے مشغولِ کارزار ہوجاتی ہی،

غرض جماعت کا اصلی خاصہ یہ ہے کہ وہ بجز مخصوص حالتوں کے ہمیشہ اپنے رہنماؤں کی مطیع و فرماں بردار رہے، لیکن نفس اجتماعی کے خصائص اور اُسکی حقیقت کے سمجھنے میں ان لوگوں نے سخت دھوکا کھایا ہی، جو یہ خیال کرتے ہیں کہ جماعت کی اصلی اسپرٹ انقلاب انگیزی اور شورہ پشتی ہے، اُن کو جس بات سے شبہہ لاحق ہوا وہ یہ ہے، کہ انھوں نے دیکھا کہ جماعت حد سے زیادہ قسی القلب اور سنگ دل واقع ہوئی ہی، اس لئے اُنھوں نے خیال کیا کہ انقلاب انگیزی جماعت کی سرشت میں داخل ہے، حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ جماعت سے شورہ پشتی کے زہریلے مادہ کا پھوٹ پڑنا، اعمالِ تخریب کا ظاہر ہونا محض وقتی ہوتا ہے، ورنہ جماعت سے زیادہ کوئی شے عواملِ وراثت اور آثارِ میراث پر قناعت کرنے والی نہیں پائی جاتی، اور اسی لئے جماعت ہمیشہ اپنی قدیم حالت کے بنا ہنے اور برقرار رکھنے کی بے انتہا کوشش کرتی ہے، اگر اُسے اپنے حال پر چھوڑ دیا جائے، تو وہ خود شورہ پشتی سے تنگ آجائے، اور اطاعت و فرماں برداری کرنے لگے، دیکھو نپولین کے زیرِ قیادت جس جماعت نے ہنگامۂ محشر خیز برپا کیا تھا، وہ نپولین کے تیھر سے زیادہ سخت ہاتھوں کی گرفت میں کیونکر آگئی، حالانکہ اُس سے زیادہ نشۂ جمہوریت میں بدمست اور آمادۂ پیکار کون جماعت ہوسکتی تھی،

پس اگر ہمیں اس بات کا علم نہ ہو، کہ جماعت کا اصلی میلان ہمیشہ قدامت پرستی کے جانب ہوتا ہے، تو ہمیں دنیا کی تاریخ خصوصاً خانہ جنگیوں کی تاریخ کے سمجھنے میں سخت دقت پیش آئے، یہ بلا شبہہ صحیح ہے اور واقعات سے بھی اس کی تائید

ہوتی ہے، کہ جماعت کبھی کبھی اپنے مخصوص رسوم و آئین اور ضوابط کے اسماء اور اُن کی ظاہری صورتوں میں تغیر کر دیتی ہے، یہاں تک کہ سطحی نظر میں یہ معلوم ہونے لگتا ہے، کہ قومی آئین و ضوابط میں انقلاب ہو گیا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان اصول و ضوابط کا اصلی عنصر اور خمیر، جو اقوام کی مختلف ضروریات کے مطابق ان کو وراثۃً حاصل ہوتا ہے، اس میں کسی قسم کا تغیر نہیں ہوتا، اور پیہم انقلابات و حوادث کا اثر ہمیشہ ان رسوم و آئین کی ظاہری صورتوں ہی تک محدود رہتا ہے حاصل یہ ہے کہ جذبۂ قدامت پرستی کو وحشی انسانوں کی طرح اقوام کے طریق کار میں بھی بہت بڑی اہمیت حاصل ہے، اور جماعت کبھی رشتۂ قدامت پرستی کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتی، بلکہ تقلید اور قدامت پرستی کے نشہ میں وہ اس قدر مدہوش ہو جاتی ہے کہ ہر جدید شے کیساتھ جو اُس کے احوالِ معیشت اور طرز بود و باش میں تغیر کرنا چاہے، اُسے بغض و عناد ہو جاتا ہے، موجودہ زمانہ کی طرح اگر کہیں جمہوریت کا تسلط اُس وقت بھی قوت پذیر ہو گیا ہوتا، جب میکانک دستکاریوں، کہربا، اور ریلوں کی اختراع عمل میں آرہی تھی، تو یہ مخترعات یا تو کب کی ختم ہو گئی ہوتیں، اور یا اُن کی قیمت کا بازارِ جماعت میں انسانی خون سے بہت زیادہ اندازہ لگایا جاتا اُسے موجودہ تمدن کی خوش قسمتی تصور کرو کہ جماعت کا اقتدار اس وقت ترقی پذیر ہوا ہے، جب تمام بڑی بڑی علمی اور صنعتی اختراعات دنیا میں رواج پا چکی ہیں، ورنہ ان کی کامیابی میں بے انتہا دقتیں حائل ہوتیں، اور کسی طرح دنیا میں ان کا عام رواج نہ ہو سکتا،

---

(۵)

جماعت کے اخلاق

اگر ہم لفظ اخلاق سے صرف یہ مراد لیں کہ جن باتوں کو عام لوگ اچھی نگاہ سے دیکھتے ہیں، ان کو اختیار کرنا، اور نفس کو اسکی خواہش اور ذلیل باتوں سے روکنا تو اس معنی کے لحاظ سے بیشک جماعت نہایت بد خلق ہوتی ہے، لیکن ہم اگر اخلاق کے ضمن میں یہ بات بھی داخل کر لیں، کہ وقتی طور پر بعض عمدہ باتیں اختیار کر لینا، مثلاً ایثار اور اخلاص وغیرہ، تو اس وقت ہم یہ کہہ سکیں گے، کہ جماعت خوش اخلاقی اور اعلیٰ اوصاف سے بھی مزین ہوتی ہے،

لیکن بعض ماہرین نفسیات نے جو جماعت پر صرف اسکی مجرمانہ حیثیت سے نگاہ ڈالتے ہیں، مطلقاً یہ حکم لگا دیا ہے کہ جماعت کے اخلاق ہمیشہ انحطاط پذیر ہوتے ہیں، اس کا باعث صرف یہ ہے کہ اُنھوں نے جماعت کے اخلاق پر یکطرفہ نظر ڈالی ہے، یعنی اُنھوں نے صرف یہ دیکھ لیا، کہ وہ شر و فساد کی جانب زیادہ مائل ہوتی ہے، اور اسی بنا پر اُنھوں نے کہدیا کہ جماعت ہمیشہ بد اخلاق ہوتی ہے

بلاشبہہ جماعت کے اخلاق کا زیادہ تر حصہ شر و فساد ہی پر مشتمل ہوتا ہے لیکن بات یہ ہے کہ ادوارِ گذشتہ کی سخت مزاجی اور درشتی کا بچا کھچا اثر ہم میں سے ہر ایک کے قلب میں کچھ اس طرح پیوست ہو گیا ہے، کہ گو افراد تو بعض مصائب کے خوف سے اس اثر کے اشارہ پر کام کرنے سے دہشت کھاتے اور ہمٹتے ہیں، لیکن جماعت کو تو مسئولیت اور باز پرس کا کچھ خوف نہیں ہوتا، اس لئے وہ علی الاعلان

مسئولیت کے قیود سے محفوظ و مصئون رہکر اسی گذشتہ طریق کار پر نہ صرف عامل ہوتی ہے، بلکہ اپنی خواہش کے مطابق مشغولِ کار ہونے پر اور شیر دل ہوجاتی ہی، دیکھو تو سہی، وہ ان خلافِ انسانیت اعمال کے ارتکاب کرنے پر کس قدر جری ہے، کہ جب اسے اپنے دل کی بھڑاس نکالنے کے لئے اس کے اپنے ابنائے جنس نہیں ملتے، تو کس طرح وہ جانوروں کو مختلف ایذائیں دینے کی کوشش کرتی ہے، حقیقت میں جماعت کا جذبۂ ایذار سانی اور صیادوں کا شوقِ صید و شکار دونوں یکساں اور متناسب جذبات ہیں، اسے جب غصہ آتا ہے تو بلا جذبۂ شفقت سے متاثر ہوئے وہ اپنے ابنائے جنس کو چیرنے پھاڑنے لگتی ہی، اور یہ جس وقت مبتلائے جنوں ہوتے ہیں، تو اپنے دوستوں کے مجمع کیساتھ کس سنگدلی سے بیکس ہرن کا شکار کرتے ہیں، حالانکہ ایک فلسفی کی نگاہ میں دونوں کی وقعت ایک جنگلی بھیڑیئے سے کم نہیں،

غرض باوجودیکہ جماعتیں بعض اوقات قتل و غارت، آتش زنی، جرائم اور ہر قسم کے افعالِ شنیعہ کا ارتکاب کر گذرتی ہیں، لیکن ان میں مخلصانہ اعمال، ایثار، منافعِ ذاتی اور دیگر بہترین اعمال کے انجام دینے کی بھی صلاحیت افراد سے زیادہ ہی زیادہ پائی جاتی ہے، بلکہ جماعت کو جب کبھی دین یا وطن کی خاطر قربانی کرنے کے لئے دعوت دی گئی ہی تو وہ نہایت ذوق و شوق کے ساتھ اس پر آمادہ ہوگئی ہی، تاریخ کے مطالعہ سے ثابت ہوتا ہی کہ افراد نے نہیں بلکہ جماعت ہی نے ہمیشہ نزاہت، اخلاصِ عمل اور عظائم اعمال کی مسلّم الثبوت مثالیں پیش کی ہیں، کتنی جماعتیں تھیں، جنھوں نے اپنی جانوں اور روحوں کو محض ان معتقدات کی خاطر جو انھیں تلقین کئے گئے تھے، موت کا شکار بنا دیا! بڑی بڑی جماعتوں کو جانے دو، چھوٹی چھوٹی جماعتیں بھی جو اعتصاب اور اسٹرایک کے ذریعہ سے مظاہرہ

کرتی ہیں، توان کا یہ مظاہرہ اس غرض سے نہیں ہوتا، کہ ان کی قلیل اجرت میں جو ان کے لئے ناکافی ہوتی ہی، اضافہ کر دیا جائے، بلکہ ان کا یہ مظاہرہ اس بات کی علامت ہوتا ہے کہ انھیں کہیں سے اس ایثار اور قربانی کی جانب دعوت دی گئی ہے، جو ان کے مظاہرہ کی روح رواں ہی مصلحتِ ذاتی کا خیال گو افراد کے لئے تہیج و تحریک کا باعث ہوتا ہو، لیکن جماعتیں کبھی اس خیال کی بنا، پر نہ مشغولِ پیکار ہوئی ہیں، اور نہ آسانی سے انھیں اس پر آمادہ کیا جا سکتا ہے، تاوقتیکہ انھیں مقصودِ حقیقی سے آگاہ نہ کیا جائے،

جماعت کی خوش اخلاقی اور سلامت روی کا یہ حال ہی کہ بعض اوقات کمینوں اور اوباشوں کی شمولیت سے بھی کوئی نقصان نہیں ہوتا، بلکہ ان کی شمولیت بعض اوقات جماعت کے محاسنِ اخلاق کو اور چمکا دیا کرتی ہے، موسیو ٹائن نے ماہ ستمبر کی شورہ پشت جماعت کے متعلق لکھا ہی کہ اُس نے جتنا مالِ غنیمت لوٹا تھا، وہ سب جماعت کے سامنے لاکر رکھدیا، حالانکہ وہ مال قیمتی اشیاء پر مشتمل تھا، اسی طرح جس جماعت نے قصر ٹولیری پر ۱۸۴۸ء کی بغاوت کے دوران میں حملہ کیا ہی، اسکے متعلق بھی تاریخ میں مذکور ہے، کہ اُس نے بھی قصر کی کسی نفیس شے کو ہاتھ نہیں لگایا، حالانکہ قصر میں بہت کچھ تھا، اور وہ جماعت غصہ میں بیتاب ہو رہی تھی، جماعت کی خوش خلقی بعض اوقات اس قدر ترقی کر جاتی ہے، کہ وہ جماعتیں بھی جو اوباشوں سے مرکب ہوتی ہیں، اکثر خلافِ تہذیب منظر کو دیکھ کر یا ناشایستہ الفاظ کو سنکر اپنے آپے میں نہیں رہتیں،

پس مذکورۂ بالا بیان سے ظاہر ہوا کہ جس طرح جماعتوں سے قبیح اعمال سرزد

ہوتے ہیں، اسی طرح جماعتیں اپنے اعمال سے بعض اوقات محاسنِ اخلاق کے نمونے
بھی پیش کرتی ہیں، اور اس قسم کی مثالیں دو ایک نہیں بلکہ اگر یہ کہنا صحیح ہے کہ ایک خیالی
اور وہمی محورِ نظر کے خاطر قربانی کرنے کے لئے اخلاصِ مطلق اور ایثار کی سخت ضرورت
ہوتی ہی، تو پھر یہ بھی صحیح ہوگا کہ عقلائے زمانہ سے زیادہ جماعتیں ہمیشہ قربانی کی اس
قسم کی مثالیں پیش کرتی رہی ہیں، گو ان اعمال کا ظہور جماعتوں سے قصداً نہ ہوتا ہو لیکن
قصد و ارادہ کو ہمارے دعوی سے کوئی لگاؤ نہیں، علاوہ بریں اگر سچ پوچھو، تو واقعہ
یہ ہے کہ جماعت سے غیر ارادی اعمال جو صادر ہوتے ہیں، ان کی شکایت ہمیں نہیں
کرنا چاہئے، اسلئے کہ اگر جماعتیں کہیں اپنی عقل سے کام لینے لگیں اور اپنے منافع
کا انھیں احساس پیدا ہو جائے، تو تمدن کا تختہ اُلٹ جائے، اور عالم میں سراسیمگی
اور پراگندگی پھیل جائے،

فصل سُوم

جماعت کے قوائے عقلی

قوّتِ عقلی، قوتِ فکری، تخیل آرائی

۱۔ جماعت کی قوتِ فکری، جماعت کے اساسی اور طبعی افکار کا فرق یہ بحث کہ ذہنِ جماعت میں متناقض فکروں کا اجتماع کیونکر ہوتا ہے، جماعت کسی خیال کو اس وقت تک جذب نہیں کر سکتی، تاوقتیکہ اپنے خیال کے مطابق اس میں تغیر نہیں کر لیتی ہے، جماعت پر کسی خیال کے اثر کرنے کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ خیال عقلی پہلو سے صحیح بھی ہو،

۲۔ قوتِ عقلی، جماعت عقلی استدلال سے کبھی اثر پذیر نہیں ہوتی، جماعت کی قوتِ عقلی ہمیشہ انحطاط پذیر ہوتی ہے، جماعت کا عقلی استدلال ہمیشہ قیاسِ تمثیلی پر مبنی ہوتا ہے،

۳۔ تخیل آرائی، جماعت کا شدتِ تخیل، جماعت اپنے ذہن میں ایسی صورتیں اور اشباح پیدا کر لیتی ہے، جن کو اصلی واقعہ سے کوئی نسبت نہیں ہوتی، جو چیز جس قدر عجوبہ ہو گی، اسی قدر جماعت پر زیادہ اثر کرے گی، اسی قسم کے کرامات اور نادر ہوا قصے ہر تمدن کی بنیاد ہوتے ہیں، جماعت کا تخیل ہمیشہ قوموں کے رجالِ سیاست کا دست و بازو رہا ہے، کسی حادثہ سے جماعت کو اثر پذیر

کرنے کے لئے اسکو جماعت کے سامنے کس رنگ میں پیش کرنا چاہیئے،

(۱)

جماعت کی قوتِ فکری

ہم نے اگلی تصنیف میں نہایت تفصیل سے اس مسئلہ پر بحث کی تھی، کہ قوموں کی ترقی میں افکار و خیالات کا کتنا اثر ہوتا ہے، اور اس باب میں ان کی کیا اہمیت ہے، اور یہ بھی بیان کر دیا تھا کہ ہر تمدن کی بنا چند افکار اساسی پر ہوتی ہے، جو تجدد اور تغیر کی صلاحیت نہیں رکھتے، نیز اسکی بھی تشریح کر دی تھی، کہ افکار و خیالات نفوسِ جماعت پر کیونکر تسلط حاصل کرتے ہیں، اور وہ کون سی طاقت ہوتی ہے جو نفوسِ جماعت پر اثر کرتے وقت اُن میں پیدا ہو جاتی ہے، پھر ہم نے اسکی بھی وضاحت کر دی تھی، کہ بڑے بڑے سیاسی انقلابات اس وقت واقع ہوتے ہیں جب ان اساسی افکار و خیالات میں کوئی تغیر یا انقلاب ہو جاتا ہے، سابق تصنیف میں ہم ان تمام اُمور کی بخوبی وضاحت کر چکے ہیں، اسلئے ہم یہاں پر دوبارہ ان مضامین کا اعادہ نہ کریں گے، بلکہ نہایت اختصار کے ساتھ صرف یہ بتا دیں گے کہ اس قسم کے افکار اور خیالات جماعت کے ذہن میں جب پیدا ہوتے ہیں تو کیا صورت اختیار کرتے ہیں، اور ان افکار و خیالات کا جماعت پر کتنا اثر پڑتا ہے،

جماعت جن افکار و خیالات سے عموماً اثر پذیر ہوتی ہے، ان کی دو قسمیں ہیں:۔

۱۔ ایک وہ وقتی افکار و خیالات جو بعض وقتی حوادث اور واقعات کے اثر سے جماعت کے ذہن میں پیدا ہوتے ہیں مثلاً کسی مذہب یا کسی ذات کیساتھ غلو

اعتقاد وغیرہ،

۲۔ وہ اساسی اور غیر فرعی افکار و خیالات جو مخصوص ماحول اور وراثت وغیرہ کی بنا پر جماعت کے ذہن میں پیدا ہو کر رسوخ حاصل کرتے ہیں، ان اساسی اور غیر فرعی افکار کی مثال میں ہم زمانۂ قدیم کے معتقداتِ مذہبی اور زمانۂ حال کے جمہوری اور اجتماعی خیالات کو پیش کر سکتے ہیں، جو مخصوص ماحول اور مخصوص وراثت کے نتائج ہیں،

اساسی افکار و خیالات کی حالت اُس پانی کی سی ہوتی ہے، جو دریا میں سکون کے ساتھ بہتا رہتا ہے اور فرعی افکار اُن چھوٹی چھوٹی موجوں کے مثل ہوتے ہیں جو دریا کے پانی کو تھپیڑے دے دے کر پیدا ہوتی اور مٹتی رہتی ہیں، اور جو باوجود اپنی قلت و ضعف کے آنکھ کے سامنے خود دریا سے زیادہ نمایاں ہوتی ہیں،

اب اس زمانہ میں وہ تمام اساسی افکار و خیالات جو ہمارے اجداد کے دستور العمل تھے، درجہ بدرجہ مضمحل ہو ہو کر اپنے رسوخ اور قوت کو برباد کر رہے ہیں، اور ان کے زوال کیساتھ اس نظامِ معاشرت اور نظامِ حکومت کی بنیادیں بھی ہل گئی ہیں، جو ان اساسی افکار و عقائد پر مبنی تھے، اور اُن کی جگہ پر ہر روز نئے نئے خیالات اور عقائد پیدا ہوتے جاتے ہیں جنمیں نشو و نما کی صلاحیت ہمکو بہت کم نظر آتی ہے تاہم انہی پر جماعت کے مستقبل کا مدار ہے،

پھر وہ افکار و خیالات جو جماعت کو تلقین کئے جاتے ہیں، اُسوقت تک کوئی نتیجہ خیز رسوخ نفوسِ جماعت میں نہیں پیدا کر سکتے، تاوقتیکہ ان کو ایک دلفریب اور سادہ شکل میں نہ پیش کیا جائے، اور یہ صرف اسی صورت سے ہو سکتا ہے، کہ جماعت کو جن خیالات کی تلقین کیجا رہی ہے، ان کی حقیقت تصاویر و اشباح یا تشبیہ و استعارات کے ذریعہ سے اسکو سمجھائی جائے تاکہ وہ ذہن میں خوب پیوست ہو جائیں پھر جب ان خیالی تصاویر کے ذریعہ

سے کوئی حقیقت جماعت کے ذہن نشین ہو جاتی ہے، تو باوجودیکہ ان ذہنی انشراح اور خیالی تمثیلات و تشبیہات میں کوئی باہمی تعلق ایسا نہیں ہوتا کہ ایک خیالی تصویر کے ذریعہ سے دوسری خیالی تصویر کیجانب ذہن کا انتقال ہو سکے لیکن جماعت کی حالت یہ ہوتی ہے کہ اسکے ذہن کو ایک خیالی تصویر سے دوسری خیالی تصویر کیجانب نہ صرف انتقال ہوتا ہے بلکہ وہ ان مختلف اور متناقض تصاویر سے اثر پذیر بھی ہوتی ہے، اور یہی بات ہے کہ اکثر دیکھا گیا ہے کہ جماعتیں ان متضاد اور تناقض ذہنی تصاویر سے اثر پذیر ہو کر متضاد اور متناقض افعال کا ارتکاب کرنے لگتی ہیں۔

لیکن جماعت کے افعال و اعتقادات میں جو تناقض پایا جاتا ہے، وہ صرف جماعت ہی کے ساتھ مخصوص نہیں ہے، بلکہ اس قسم کا تناقض اکثر افراد کے اعمال و اعتقاد میں بھی نظر آتا ہے، میں وحشی انسانوں کے متعلق نہیں کہتا، ان کے اعمال و اعتقادات میں اگر تناقض پایا جائے تو محلِ تعجب نہیں ہے، مجھے تو اس تناقض و تضاد کا مشاہدہ اکثر ان ہندوستانی روشن خیال لوگوں کے اعتقادات میں بھی ہوا ہے، جنھوں نے ہمارے یوروپین مدارس میں تعلیم پائی ہے، ان لوگوں کے خیالات میں میں نے یہ عجیب تناقض پایا کہ گو ہماری تربیت کے اثر سے انکے موروثی اعتقادات پر اجنبی افکار نے غلبہ حاصل کر لیا ہے لیکن ان کے موروثی اعتقادات کا استیصال نہیں ہوا ہے، یہی تناقضِ خیالات ہے جس کی وجہ سے گو بعض اوقات ہم افراد کو متضاد اعمال کا ارتکاب کرتے ہوئے تو پاتے ہیں، لیکن میرا خیال یہ ہے کہ افراد کے خیالات کے اندر اختلاف کی خلیج خواہ کتنی ہی وسیع ہو جائے، اس عملی تناقض کا اثر کبھی ظاہر سے تجاوز نہیں کرتا، بات یہ ہے کہ افراد سے جو افعال سرزد ہوتے ہیں، انکا مصدرِ حقیقی اور منبعِ اصلی صرف اُن کے موروثی خیالات ہوتے ہیں، اور اسی بنا پر افراد کے اعمال میں حقیقی تناقض صرف اسوقت نمودار ہوتا ہے جب دو موروثی طاقتیں باہم متصادم ہوتی ہیں، میں اس مسئلہ پر طویل گفتگو کرنا نہیں

چاہتا، اور اسکی وجہ یہ ہے کہ میرے خیال میں اس حقیقت کا مشاہدہ کرنے کیلئے یہ ضروری ہی
کہ مختلف ممالک میں سیر و سیاحت کر کے قوموں کے موروثی اخلاق و عادات سے واقفیتِ تامہ
حاصل کی جائے،

پھر جماعت میں کسی خیال کے پھیلانے کے لئے صرف اتنا ہی ضروری نہیں ہوتا کہ
اسکی حقیقت کو ذہنی تصاویر اور تشبیہات کے ذریعہ سے جماعت کے ذہن نشین کرایا جائے، بلکہ
جماعت میں کسی فکر و خیال کو اس وقت تک مقبولیت حاصل نہیں ہوتی تاوقتیکہ ترمیم و تغیر کر کے
اس کو ذہنِ جماعت کے قریب نہ کر دیا جائے، اس اصول کا مشاہدہ فلسفیانہ اور علمی خیالات
میں آسانی سے ہو سکتا ہی، دیکھو کسی علمی خیال کو مقبولیت کا جامہ پہنانے کے لئے اسمیں کتنا
تغیر کرنا پڑتا ہی، اور سر تا سر اسے جماعت کے مزاجِ عقلی کے مطابق بنانا پڑتا ہی، اور گو یہ ترمیم و تنسیخ
مختلف اقوام کی حالت کے اعتبار سے عمل میں لائی جاتی ہی تاہم اس کا قدر مشترک یہ ہوتا
ہے کہ خیالات کی سادگی اور سطحیت کا جامہ پہن لیں، یہی سبب ہی کہ جب ہم اجتماعی نظر سے خیالات
و افکار کو دیکھتے ہیں تو انمیں بلحاظ بلندی و پستی ہیں کوئی فرق نظر نہیں آتا، کیونکہ اب وہ جیسے
ہی ذہنِ جماعت میں پیوست ہوئے انکی عظمت تشریف لے گئی، اب اگر انکی کوئی حیثیت باقی
ہے، تو صرف یہ کہ جماعت پر ان کا کس قدر اثر پڑتا ہی،

علاوہ بریں اجتماعی نقطۂ نظر سے تو کسی فکر و خیال کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی، اجتماعی
نقطۂ نظر سے جس بات کو اہمیت ہی، وہ صرف یہ ہی کہ جماعت میں کسی فکر و خیال کے اشاعت پذیر
ہونے سے اس جماعت کی حالت پر کیا اور کتنا اثر پڑتا ہی، ذرا دیکھو کہ قرونِ وسطیٰ میں مذہبی معتقدات
کو کس قدر اہمیت حاصل تھی، اور زمانۂ حال میں جمہوری اور اجتماعی خیالات کس درجہ برتر
اور مافوق البحث خیال کئے جاتے ہیں، حالانکہ فلسفہ ان تمام خیالات کی انتہائی تغلیط کرتا ہی

اور باوجود اسکے زمانہ گذشتہ میں تو خیر ان خیالات کو جو اہمیت تھی، وہ تھی، اب بھی انکا اثر ترقی پر ہے، اور آیندہ بھی ایک عرصہ تک حکومتوں اور اقوام کی حیات و ممات میں انہی خیالات کی تہیج و تحریک کو بڑا دخل رہے گا،

لیکن اب فرض کرو کہ ہم نے کسی فکر و خیال میں اقوام کے نفسانی حالات کے مطابق تغیر بھی کرلیا، اور جماعت میں اس فکر و خیال کی اشاعت بھی ہوگئی لیکن اب بھی اس فکر و خیال کا اثر جماعت پر اُسوقت تک نہیں ہوسکتا، تا وقتیکہ وہ جماعت کے ذہن میں پیوست ہوکر مقتضیاتِ فکری اور احساسات غیر شعوری کی صف میں داخل نہ ہوجائے، اور اسکے لئے تو ظاہر ہے کہ ایک طویل مدت درکار ہوتی ہے

غرض جماعت میں کسی فکر و خیال کے اشاعت پذیر ہونے کیلئے پہلے اس فکر و خیال کو مختلف مدارج طے کرنا ہوتے ہیں، اسکے بعد پھر کہیں جاکر وہ جماعت میں اشاعت پذیر ہوتا ہے پس ناظرین کے ذہن میں یہ شبہہ نہ گذرے کہ جب کسی فکر و خیال کی صحت کا حال معلوم ہوگیا، تو کوئی وجہ نہیں کہ جماعت میں یہ خیال اشاعت پذیر نہ ہو، اور جماعت اس کا اثر نہ قبول کرے کیونکہ جماعت تو ایک طرف خود افراد کی یہ حالت ہوتی ہے کہ وہ خیال جس کی اشاعت کیجارہی ہے اسکی صحت و واقعیت کا حال معلوم کرنے کے بعد اگر سامعین روشنخیال ہوئے تو وہ گو اسکی صداقت کا اعتراف کرلیتے ہیں لیکن چونکہ افراد پر انکے موروثی خیالات کا بڑا اثر ہوتا ہے، اسلئے تھوڑے عرصہ کے بعد انکا قدیم اعتقاد ان پر پھر غالب آجاتا ہے، اور اب اگر تم ان سے کچھ مدت کے بعد پھر ملو تو وہ تمھارے سامنے اپنا وہی پہلا خیال پھر ظاہر کرینگے جس کے باطل کرنیکی تم ایکبار کوشش کرچکے ہو، وجہ یہ ہے کہ افراد ان افکار و خیالات کے پابند اور زیر فرمان ہوتے ہیں، جو امتداد زمانہ سے انکے ذہنوں میں راسخ ہوگئے ہیں، اور انہی خیالات کا اثر انکے اعمال و افعال میں نمایاں رہتا ہے پس جب افراد کی یہ حالت ہے تو جماعت کا کیا پوچھنا؟ وہ تو افراد سے زیادہ عوامل وراثت کی پرستار ہوتی

ہے، اس کا اجنبی خیالات کو جذب و ہضم کر لینا تو نہایت دشوار ہی،

لیکن جب متعدد وسائل کی مدد سے کسی خیال کو نفوسِ جماعت میں رسُوخ حاصل ہو جاتا ہی، تو پھر کوئی قوت اسکے سامنے نہیں ٹھہر سکتی، اور اسوقت جو واقعات ظاہر ہوتے ہیں انکی اطاعت اور فرماں برداری ناگزیر ہوتی ہی، فلسفیانہ خیالات جو انقلاب فرانس کے باعث ہوئے تھے، ایک مدت تک مختلف منازل طے کرتے رہے، اور اسکے بعد جو انکو رسوخ حاصل ہوا تو ان خیالات سے اثر پذیر ہو کر تمام قوم کی قوم معاشرتی مساوات حاصل کرنے اور حریت کی عظیم الشان بنیادیں قائم کرنے کیلئے یکبارگی اٹھ کھڑی ہوئی، تمام تاج و تخت اُلٹ دیئے گئے، مغرب کا طبقہ زیر و زبر کر دیا گیا، اور بیس سال کی مدت تک ایک ایسی ہولناک جنگ کے شرارے ممالک یورپ کو خاک سیاہ کرتے رہے، جس کے خیال تک سے تیمور لنگ اور چنگیز خاں کو لرزہ آتا ہوگا، —— ایک ایسا ہولناک منظر جو ہمارے دائرۂ تصور سے باہر ہے،

لیکن جس طرح نفوسِ جماعت میں کسی فکر و خیال کو ایک مدت دراز میں مختلف منازل طے کرنے کے بعد رسوخ حاصل ہوتا ہی، اسیطرح ذہنوں سے اس فکر کے ازالہ کیلئے بھی ایک مدت درکار ہوتی ہی جو خیال ایکبار ذہنوں میں راسخ ہو جاتا ہی اسکا ازالہ بھی اگر ہو سکتا ہی تو اسی صورت سے کہ جن ذرائع یا وسائل کی مدد سے اس خیال کو رسوخ حاصل ہوا تھا اسی قسم کے توی ذرائع اور عوامل وراثت کی مدد سے اس خیال کو اپنی جگہ سے ہلایا جائے یہی وجہ ہے کہ جن خیالات تک قوم کے اعلیٰ طبقہ اور علماء اور فلاسفہ کی رسائی پہلے سے ہو جاتی ہی، قوم کا ادنیٰ طبقہ ان خیالات تک ایک مدت دراز کے بعد رسائی حاصل کرتا ہی، اور گو عموماً رجالِ سیاست اپنے زمانہ کے خیالاتِ اساسی کی خطا و صواب سے واقف ہوتے ہیں، لیکن چونکہ ان کے پیشِ نظر یہ بات ہوتی ہی، کہ یہ خیال قوم کے دماغوں میں رسُوخ حاصل کر چکا ہی، اور قوم کی قیادت، بلا اس خیال کی مراعات کئے ہوئے ناممکن ہی، اسلئے فرضِ قیادت انجام دینے

کیلئے وہ ان اساسی خیالات کو چھوتے تک نہیں، گو وہ خود اُنکی صحت کا اعتقاد نہ رکھتے ہوں،

(۲)

قوت عقلی

جماعت کی قوتِ عقلی کے متعلق گو مطلقاً یہ نہیں کہا جا سکتا کہ جماعت میں قوتِ عقلی سرے سے مفقود ہوتی ہی، یا جماعت عقلی استدلال سے بالکل اثر پذیر نہیں ہوتی، البتہ یہ ضرور ہی کہ جس قسم کے دلائل وہ کسی امر کی تائید میں قائم کرتی ہے، یا جن دلائل سے وہ اثر پذیر ہوتی ہے وہ عموماً منطقی نگاہ سے گرے ہوئے ہوتے ہیں،

بلاشبہہ یہ انحطاط پذیر دلائل بھی جو جماعت کسی امر کی تائید میں قائم کرتی ہی، صحیح دلائل و براہین کی طرح اشیاء کی باہمی مماثلت پر مبنی ہوتے ہیں، لیکن اشیاء کی یہ مماثلت جو جماعت کے ذہن میں آتی ہی، وہ اسقدر سطحی ہوتی ہی، کہ اسکی بنا پر جو قیاس قائم ہوتا ہی، علمی نگاہ میں اسکی کوئی قدر و منزلت نہیں ہوتی، جماعت کے استدلالات کی شان بالکل ویسی ہی ہوتی ہی جس طرح ایک اسکیمو اپنے اس تجربہ کی بنا پر کہ برف شفاف ہی، اور منہ میں جاکر پگھلتی ہی، یہ استدلال قائم کرتا ہی کہ چونکہ شیشہ بھی شفاف ہی، اسلئے وہ بھی منہ میں جاکر پگھلے گا، یا جس طرح ایک دیہاتی یہ سمجھتا ہی کہ بہادر شخص کا کلیجہ چبانے سے ہم میں بھی بہادری پیدا ہو سکتی ہی، یا جس طرح ایک مزدور کا قصہ ہی کہ اتفاق سے ایک پروفیسر نے اسکی مزدوری نہیں دی تو اُس نے صرف اسی واقعہ کی بنا پر یہ کلیہ قائم کر لیا کہ تمام پروفیسر حقوق غصب کر لیتے ہیں،

غرض جماعت کے قیاسات اور استدلالات کی شان ہمیشہ یہ ہوتی ہی کہ وہ ہر اُن دو چیزوں کے مابین رابطۂ اتحاد یا علاقۂ علیت پیدا کر لیتی ہی جنمیں واقعۃً کوئی علاقہ اور رابطہ نہیں پایا جاتا، اس بنا پر اگر جماعت کے استدلالات کو کسی صنفِ استدلال میں داخل کیا جا سکتا ہی تو وہ استدلالِ

تمثیلی ہی، اور چونکہ جماعت پر صرف اسی صنفِ استدلالات کا اثر پڑتا ہی، اسلئے وہ لوگ بھی جو جماعت
کی قیادت کرتے ہیں، اسی قسم کے دلائل و براہین اسکے سامنے پیش کرتے ہیں، بخلاف منطقی دلائل کے
کہ اول تو یہ دلائل اسکے فہم و ادراک سے بالاتر ہوتے ہیں، پھر اگر کسی طرح جماعت کو انکا ادراک
ہو بھی جائے تو وہ ان استدلالات سے ذرہ برابر اثر پذیر نہیں ہوتی ہیں اگر ان وجوہ کی بنا پر یہ کہا جائے
کہ جماعت کی قوتِ عقلی اور قوتِ استدلالی کمزور نہیں ہوتی ہی تو بجا ہے لیکن اکثر یہ ہوتا ہی کہ جب ہم ان
خطبوں کو اٹھا کر دیکھتے ہیں، جو اپنی بے نظیر موثرانہ اور ساحرانہ طاقت کے لئے مشہور ہوتے ہیں
تو ہمکو رکاکتیں اور نقائص دیکھ کر یہ خیال پیدا ہوتا ہی، کہ اس مجموعۂ خرافات نے بھلا جماعت پر کیا اثر
ڈالا ہوگا، اسمیں تو صدہا نقص ہیں، پھر کیا یہ ممکن ہی کہ ان نقائص کے باوجود جماعت اس سے
اثر پذیر ہوئی ہو؟ لیکن بات یہ ہی کہ جماعت پر کسی خطبہ کا موثر ہونا، اور غیر معقول دلائل و براہین پر
کسی خطبہ کا مشتمل ہونا، یہ دونوں علٰحدہ علٰحدہ باتیں ہیں، یہ کوئی ضروری نہیں کہ جس خطبہ سے جماعت
اثر پذیر ہوئی ہی، وہ معقول دلائل و براہین پر بھی مشتمل ہو بلکہ اکثر تو اسکے خلاف یہ ہوتا ہی کہ جو خطبہ اپنے اندر
جس قدر زیادہ غیر معقول دلائل کا ذخیرہ مخفی رکھتا ہی، اسی قدر زیادہ اسکے مخفی اثر سے جماعت پر بے شعوری
کی کیفیت طاری ہوتی ہی، خطبوں اور لکچروں کی غرض یہ نہیں ہوتی، کہ علماء انکے مطالعہ سے محظوظ ہوں
اور اپنے معلوماتِ عامہ میں انکے ذریعہ سے اضافہ کریں، بلکہ ان کی غرض صرف یہ ہوتی ہی کہ جسطرح
بن پڑے مجمع پر اثر ڈال کر اسکو مدہوش کر دیا جائے، اگر خطیب اسمیں کامیاب ہو گیا تو خواہ اس کے
دلائل کیتنے ہی غیر معقول ہوں اسکی غرض حاصل ہو گئی، اور اگر اب تم یہ چاہو کہ اس خطبہ کے مطالعہ
سے وہی اثر اپنے میں پھر پیدا کر لو تو یہ ناممکن ہی، صدہا بار بھی اس کے پڑھنے سے وہ اثر نہ پیدا ہو گا جو خطیب
نے خطبہ دیتے وقت پیدا کر دیا تھا،

پس جب تقریر بالا سے خوب یہ بات ذہن نشین ہو گئی، کہ جماعت کی قوتِ استدلالی ضعیف

ہوتی ہے، تو اب اسکے بعد مجھے یہ بتانے کی حاجت نہیں رہی، کہ جماعت حق و باطل اور غلط و صحیح کی تمیز کرنے سے بھی قاصر ہوتی ہے، اور جن افکار و خیالات کو وہ قبول کرتی ہے وہ کسی واقعیت پر مبنی نہیں ہوتے، بلکہ ان کا دار و مدار اپنی موثرانہ طاقت پر ہوتا ہے جو انکے اندر مخفی ہوتی ہے، اور چونکہ جماعت کی قدرت سے یہ باہر ہے، کہ اپنے کسی ذاتی خیال کی بنا پر وہ کوئی خاص نتیجہ اخذ کرے، بالفاظ دیگر جماعت کا اپنا کوئی خاص خیال نہیں ہوتا اسلئے عموماً وہ بعض خیالات کو نہایت آسانی کے ساتھ قبول کر لیا کرتی ہے،

(۳)

قوتِ تخیل

جماعت میں ان وحشی انسانوں کی طرح جو غور و فکر کی صلاحیت نہیں رکھتے تخیل رائی اور وہم پرستی کی قوت بہت زیادہ ہوتی ہے، اور اس کے ذہن میں کسی واقعہ یا کسی ذات کی جو تصویر آتی ہے، وہ اس سے اتنا اثر پذیر ہوتی ہے، کہ اگر اس تصویر کے بجائے خود وہ شے اسکی نظر کے سامنے آجائے تو شاید وہ اس سے اسقدر اثر پذیر نہ ہو جیسا کہ ہم بار بار بیان کر چکے ہیں، جماعت کی حالت مسمریزم کے معمول سے بہت کچھ مشابہ ہوتی ہے، مسمریزم کے معمول کیطرح وہ کچھ دیر کے لئے فاقد العقل ہو کر اپنے ذہن کی اُن پیدا کردہ تصاویر و اشباح سے اثر قبول کرتی ہے، جو ذرا سے غور و تامل میں غیر معقول اور مہمل ثابت ہو سکتی ہیں لیکن چونکہ جماعت غور و فکر کی صلاحیت سے عاری ہوتی ہے، اسلئے اسکو یہ پتہ نہیں لگتا، کہ ان تصاویر و اشباح میں کون سی غیر معقولیت ہے، بلکہ اسکے خلاف جو ذہنی تصویر معقولیت سے جتنی زیادہ دور ہوتی ہے، اس سے اسی قدر وہ زیادہ اثر پذیر ہوتی ہے،

یہی وجہ ہے کہ کسی واقعہ کے وہ حیثیات جن پر قصہ اور خرافات کا رنگ زیادہ چڑھا

ہوتا ہی، جماعت پر انہی کا زیادہ اثر ہوتا ہی، اگر ہم کسی تمدن کے عناصر کی دقیق تشریح کریں تو ہمیں نظر آئے، کہ بے بنیاد قصوں، اور بے معنی خرافات کا اس تمدن کے مظاہر پر کتنا اثر تھا، یہ کچھ تمدن کے ساتھ مخصوص نہیں، بلکہ تاریخ کی بھی یہی حالت ہی، واقعاتِ تاریخی میں بھی خیال کو واقعہ پر اور وہم کو حقیقت پر بڑا غلبہ ہوتا ہی،

لیکن چونکہ جماعت کسی بات کا ادراک ان ذہنی تصاویر کے بغیر نہیں کر سکتی، اسلئے اسکو متاثر اور مشتعل کرنے کا اگر کوئی ذریعہ ہو سکتا ہی، تو یہی ذہنی تصاویر ہیں، وعدہ و وعید ترہیب و ترغیب، تحریص و تخویف، غرض اشتعال انگیزی کے تمام مظاہر کے مطابق جماعت اگر کاربند ہو سکتی ہی، تو اسی صورت سے کہ ذہنی تصاویر کے ذریعہ سے اسکو سبز باغ دکھایا جائے لیکن تخیل کو متاثر کرنے کا سب سے بہتر طریقہ یہ ہی، کہ تھیٹروں، ناٹکوں اور تماشوں کے ذریعہ سے کسی خیال کو مجسم شکل میں جماعت کے سامنے پیش کیا جائے، یہ ایسا بہترین طریقہ ہی کہ افکار مجردہ جو جماعت کے فہم و ادراک سے باہر ہوتے ہیں، اس ذریعہ سے انکی تصویر جماعت کی آنکھوں میں پھر جاتی ہی، اور جماعت کو اس فکر و خیال کی حقیقت کا نہ صرف پورا اندازہ ہو جاتا ہی، بلکہ مجسم تصاویر نفوسِ جماعت میں ایک عمیق اثر چھوڑ جاتی ہیں، رومن قوم نے جو دنیا کی تمام قوموں سے زیادہ نباضِ فطرت تھی، اس اصول کو یہانتک مرعی رکھا تھا کہ تھیٹر اسٹیج اسکی بزمِ تمدن کا زیب و زینت بن گیا تھا، اور امن و سعادت کا جلوہ اسکو تھیٹر اسٹیج ہی پر نظر آنے لگا تھا، رومیوں کے بعد بھی یہ اصول ہمیشہ مہذب دنیا کے پیشِ نظر رہا، اور آج اس اصول کو جو ترقی دی گئی اسکو ہم خود اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں، تخیل کو متاثر کرنے کا ذریعہ اسقدر کارگر ہوتا ہی کہ سارے کا سارا مجمع ان مناظر اور مجسم تصاویر سے ایکدم متاثر ہو جاتا ہی اور گو ناٹک کے پلاٹ کیجانب سے ناظرین کتنی ہی بے لطفی کا اظہار کر رہے ہوں، مگر اسوقت تخیل کی بلند پروازی کا یہ عالم ہوتا ہی کہ بعض اوقات ناظرین اس خیالی دنیا

کے واقعات و حوادث سے متاثر ہو کر بیخودی کے عالم میں آ پڑتے ہیں، اور کبھی یہ اثر اتنا ترقی کرتا ہے کہ لوگ غیر معمولی جذبات سے بے قابو ہو جاتے ہیں، اور ان سے بعض غیر معمولی افعال کا صدور ہونے لگتا ہے، ایک تھیٹریکل کمپنی ٹریجڈی کا پلاٹ اکثر کھیلتی تھی، اسکی بابت اکثر یہ سننے میں آیا ہے کہ جس ایکٹر نے "بدمعاش خائن" کا پارٹ کیا تھا وہ جب تھیٹر ہال سے باہر آیا تو پولیس اسکو گھیرے ہوئے تھی اس خوف سے کہ چونکہ اسنے ایک مجرم کا پارٹ کیا ہے، مبادا مجمع جوشِ غضب میں اس پر ٹوٹ پڑے، ناٹکوں اور تماشوں میں جماعت کی یہ اشتعال پذیری اس بات کو بتاتی ہے کہ جماعت کے قوائے عقلی کسقدر کمزور ہوتے ہیں اور جماعت کو مشتعل کر دینا کسقدر آسان ہے، غرض جماعت میں ایک بہت بڑا نقص یہ بھی ہے کہ وہ کسی واقعہ اور اسکی ذہنی تصویر کے باہمی فرق کا ادراک نہیں کر سکتی ہے اور یہی اسکے ضعفِ عقلی اور اشتعال پذیری کی بنا ہے،

پس چونکہ جماعتیں اس وقت تک آمادہ عمل نہیں ہوتیں، تا وقتیکہ مختلف ذرائع سے ان کے تخیل کو بیدار نہ کیا جائے، اسلئے فاتحین اپنے اثر و غلبہ کی توسیع اور سلطنتیں اپنی قوت و سطوت کو ترقی دینے میں ہمیشہ جماعت کے تخیل سے کام لیتی رہی ہیں، اور قوموں کے تخیل ہی نے ہمیشہ روئے زمین کا کایا پلٹ کیا ہے، بڑے بڑے تاریخی واقعات جو وقوع میں آئے ہیں، مثلاً بدھ مذہب کا ظہور، عیسائیت، اسلام، اور پروٹسٹنٹ مذاہب کی ترویج یا گذشتہ زمانہ کے سیاسی انقلابات اور زمانۂ حال کے اشتراکی فرقے، یہ سب واقعات ان مختلف تاثیرات کی قریب یا بعید مثالیں ہیں جو وقتاً فوقتاً انسانی تخیل پر اثر کرتی رہی ہیں،

یہی بات ہے کہ ہر زمانہ اور ہر قوم کے سیاست داں حتی کہ وہ لوگ بھی جو سب سے زیادہ استبداد پسند ہوئے ہیں اپنی اپنی قوموں کے تخیلات و اعتقادات کا ہمیشہ احترام کرتے ہیں، اور انکے خلاف عمل پیرا ہونے سے گریز کرتے ہیں انکے اندیشہ میں بھی کبھی یہ بات نہیں آتی کہ وہ ان اعتقادات کو پس پشت ڈالکر فرضِ قیادت انجام دیں اور اگر وہ ایسا کریں تو انکی ساری عزت خاک میں ملجائے، نپولین نے ایکبار حکومت کی مجلسِ شوریٰ میں کہا تھا

"تم جانتے ہو میں نے جنگ وِنڈین میں کب فتح حاصل کی اسوقت جب میں نے کیتھولک بنے

اختیار کر لیا، پھر مجھے مصر میں اسوقت کامیابی حاصل ہوئی جب میں نے جامع ازہر میں اپنے اسلام کا اعلان کیا، اسی طرح اٹلی میں اس وقت کامیاب ہوا جب میں عصمتِ پوپ کے مسئلہ کا قائل ہوگیا، اور اگر میرے زیر سایہ کوئی یہودی خاندان بھی آباد ہوتا، تو یقیناً میں عبادتگاہ سلیمان کی بھی جاروب کشی کرتا۔"

مجھے ایسا معلوم ہوتا ہی کہ سکندر اعظم اور قیصر کے بعد سے ابتک عظمائے رجال میں بجز نپولین کے کوئی ایسا شخص نہیں پیدا ہوا جو اعتقادات پر اثر ڈالتا، اور اس سے کام لینا جانتا ہو، نپولین کے فتوحات اس کے خطبات، اسکے مکاتبات، غرض اسکے ہر ہر عمل سے یہ مترشح ہوتا ہی کہ وہ قلوبِ انسانی پر فتح حاصل کرنے کا مقصد ہمیشہ اپنے پیشِ نظر رکھتا تھا، یہانتک کہ جب وہ بسترِ مرگ پر پڑا ہوا کروٹیں بدل رہا تھا، اس وقت بھی یہی مقصد اس کے پیشِ نظر تھا،

جماعت کے اعتقاد و تخیل کو جن جن طریقوں سے متاثر کیا جا سکتا ہی، انکو تو ہم آگے چل کر بیان کرینگے، البتہ یہاں پر صرف اتنا بتا دینا ضروری ہی کہ جماعت موثرات کے آگے کبھی دلائل و براہین کے پھیر میں آکر سر تسلیم خم نہیں کرتی، دیکھو انٹونی جبتک محض اپنے ساحرانہ کلام اور خطیبانہ انداز کے ذریعہ سے مجمع پر اثر ڈالنے کی کوشش کرتا رہا، کامیاب نہ ہوا لیکن اُس نے جوں ہی مقتول قیصر کی وصیت کو جیب سے نکال کر پڑھنا شروع کیا، اور مجمع کے سامنے قیصر کی لاش کو رکھکر زخموں کے نشان دکھانا شروع کئے، بس فوراً ہی جماعت اس حیرت انگیز منتر سے مسحور ہو گئی،

غرض جماعت کے تخیل پر جس چیز کا اثر پڑتا ہی، وہ اس ذہنی تصویر کا جو ایک مبہم انداز سے حیرت انگیز معجزانہ رنگ میں ایک خوش آیند امید کیساتھ یا عقاب کا خوف دلا کر جماعت کے سامنے پیش کیجاتی ہی، وہ سرتاسر راز ہی راز ہوتی ہی لیکن باوجود اسکے جماعت کا رشتۂ امید اس سے منقطع نہیں ہوتا ہی، ذریعہ ہی جو مختلف زمانوں کے پیغمبرانِ مذاہب اور انسانی فطرت کے نبض شناسوں نے اختیار کیا ہی،

جماعت کے تخیل کی حالت یہ ہے کہ بعض اوقات صد ہا مجرمانہ افعال کا جماعت کے تخیل پر اتنا اثر نہیں ہوتا جتنا ایک جرم کا ہوتا ہے، یا اکثر متعدد چھوٹے چھوٹے واقعات سے وہ جتنا اثر پذیر ہوتی ہے اتنا کسی ایک سخت واقعہ سے بھی نہیں ہوتی، وجہ یہ ہے کہ انبوہ کے دماغ پر کثرت و قلت یا ضعف و قوت کا اثر نہیں ہوتا، بلکہ اسکے دماغ پر کسی واقعہ کا اثر محض اس وجہ سے ہوتا ہے کہ اس واقعہ کے اندر کوئی ندرت یا کوئی حیرت انگیز بات اسکو نظر آجاتی ہے، جس سے وہ متاثر ہو جاتی ہے، مثال میں دیکھو ابھی کچھ سال ہوئے پیرس میں جب وبا پھیلی ہے، اور پانچہزار نفوس ایک ہفتہ کے اندر نذر اجل ہو گئے تو یہ جماعت کی نگاہ میں کتنی چھوٹی سی بات تھی، چونکہ لوگوں کو اس کا حال تھوڑا تھوڑا کر کے ان شمار و اعداد کے ذریعہ سے معلوم ہوتا تھا، جو ہفتہ وار شائع ہوتے تھے، اسلئے ان کو اسکی چنداں پروا بھی نہیں ہوتی تھی لیکن اگر اسکے بجائے کوئی ایسا حادثہ پیش آجاتا کہ ایک دن کے اندر اور ایک ہی شاہراہ پر بجائے پانچہزار آدمیوں کے صرف پانچ جانوں کا نقصان ہو جاتا، یا مثلاً برج ایفل ایکدم آرہتا، تو دیکھتے کتنا شور و غل مچتا اور کتنا بڑا انقلاب ہو جاتا، ایکمرتبہ بحر اٹلانٹک کے بیڑے کا ایک جہاز لاپتہ ہو گیا تھا، جب ایک عرصہ تک اس کا پتہ نہ لگا تو عام طور پر یہ گمان غالب ہو گیا کہ یہ جہاز غرق ہو گیا، اس خیال کا اتنا سخت اثر ہوا کہ تقریباً آٹھ روز تک پبلک میں انتشار کی کیفیت طاری رہی لیکن اسکے بعد ایکبار دسمبر ۱۸۹۴ء میں، سرکاری اعداد میں جب یہ خبر شائع ہوئی کہ ۵۰۰ بادبانی کشتیاں اور ۲۰۳ دخانی جہاز ایکبارگی غرق ہو گئے اور جانوں اور غلہ کا جو نقصان ہوا وہ شمار میں نہیں آسکتا تو اس خبر پر لوگوں نے کچھ خیال بھی نہ کیا، حالانکہ یہ نقصان پہلے نقصان سے بہت زیادہ تھا، اس سے معلوم ہوا کہ تخیل جماعت پر خود واقعات کا اثر نہیں پڑتا بلکہ جس بات کا اثر پڑتا ہے، وہ یہ ہے کہ فلاں واقعہ کسطرح وقوع پذیر ہوا، نیز کسی واقعہ کو اگر رنگ آمیزی کیساتھ اسطرح بیان کیا جائے کہ اسکی مجموعی کیفیت سے تنگدل جماعت مرعوب ہو جائے تو یہ پیرایۂ ادا بھی جماعت پر بہت زیادہ اثر کرتا ہے، پس اگر جماعت کی قیادت کرنا چاہو تو سب سے زیادہ جماعت کو پہلے اشتعال پذیر کرنا سیکھو، اگر تمھیں یہ نہیں آتا تو جماعت کی قیادت بھی نہیں کر سکتے،

فصل چہارم

جماعت کے افعال پر مذہب کا اثر

مذہب سے کیا مراد ہی، جماعت جو مذہب قبول کرے، اسکے لئے یہ ضروری نہیں کہ وہ کسی معبود کی عبادت اور پرستش پر مبنی ہو، شعور مذہبی کے خصائص، جماعت کے مذہبی اعتقادات کی قوت اور غلبہ سابق بحث کی چند مثالیں، جماعت جن معبودوں کی پرستش کرتی ہی، وہ کبھی فنا نہیں ہوتے، بلکہ ہمیشہ نئی نئی صورتوں میں نمودار ہوتے ہیں، الحاد و دہریت کا دینی شکل میں کس طرح ظہور ہوتا ہے، تاریخی نقطۂ نظر سے مذہبی معتقدات کی کیا اہمیت ہے، یہ بحث کہ واقعۂ اصلاحِ مذہب، واقعۂ سینٹ بارتھولیمو، واقعۂ ہول درین آف ٹیر، اور تمام اسی قسم کے واقعات جماعتوں کے مذہبی مشاعر و احساسات کے نتائج ہوتے ہیں، اور کبھی انکا ظہور افراد سے بالارادہ نہیں ہوتا۔

ہم ابواب سابق میں بیان کر چکے ہیں کہ جماعت کی قوتِ عقلی نہایت ضعیف ہوتی ہی، اسلئے جو خیالات اسکو تلقین کیئے جاتے ہیں، ان کو یا تو وہ بجنسہ قبول کر لیتی ہی یا انکا سرے سے انکار کر دیتی ہے، نیز یہ کہ جو عوامل اسکی تہییج و تحریک کے باعث ہوتے ہیں اُن سے جماعت اثر پذیر ہوتے ہی آمادۂ عمل ہو جاتی ہے اور اگر ہوشیاری کیساتھ اسکو متاثر کیا جائے تو وہ اپنے پیشِ نظر مقصد کے خاطر قربانی کرنے پر بھی تُلجاتی ہی، نیز ہم یہ بھی بیان کر چکے ہیں کہ اسکو اپنے معتقدات اور اپنے مشاعر و احساسات کے ساتھ الفت بلکہ ایک قسم کا تعصب

ہوتا ہے اور اسکی الفت اور میلان کا ظہور عبادت کے رنگ میں اور نفرت کا اظہار بغض و تعصب کے پردے میں ہوتا ہے، غرض ان گذشتہ بیانات سے جماعت کے معتقدات اور حیات پر کافی روشنی پڑ چکی ہے، لیکن جماعت کے ان تمام احساسات و جذبات کی دقیق تعلیل کرنے کی غرض سے اگر ہم ان تمام بڑے بڑے سیاسی اور مذہبی انقلابات پر غائر نظر ڈالیں جو ابتک دنیا میں موقوع پذیر ہو چکے ہیں نیز ان انقلابات کی آڑ میں جو مختلف عوامل پوشیدہ ہوتے ہیں اُن کی بھی جستجو کریں، تو ہمکو نظر آئیگا کہ ان حالات کے دوران میں جماعت ہمیشہ خیالات کا ایک مخصوص جامہ پہن لیتی ہے اور اس دوران میں اس پر مخصوص خیالات کا غلبہ ہوتا ہے، جن سے وہ اثر پذیر ہوتی ہے اور وہی اسوقت اسکے اعمال کے محرک ہوتے ہیں لیکن یہ مجموعۂ خیالات جو اس وقت جماعت پر حاوی ہوتا ہے اسکی تعبیر اگر ہو سکتی ہے، تو لفظ "مذہب" یا "شعور دینی" سے،

جماعت کا یہ شعورِ مذہبی جو اس وقت اسکے تمام اعمال و افعال کا باعث ہوتا ہے ہمیشہ چند سیدھے، سادے اعتقادات پر مشتمل ہوتا ہے، جو حسب ذیل ہیں:۔

۱۔ کسی ایسی ذات کی عبادت کا خیال جو تمام افراد سے برتر تصور کی گئی ہو،

۲۔ اس پوشیدہ ذات سے خوف کرنا اور اسکی کورانہ اطاعت و فرمانبرداری کرنا،

۳۔ اس قوت کی تعلیمات و احکام کو بحث و مباحثہ سے مافوق سمجھنا،

۴۔ ان تعلیمات کی اشاعت و ترویج کی جدوجہد کرنا،

۵۔ جو لوگ ان تعلیمات کو نہ مانیں اُن سے دشمنی اور عداوت کا اظہار،

لیکن کبھی ایسا ہوتا ہے کہ جماعت کو کسی ان دیکھے معبود کے ساتھ اعتقاد پیدا ہوتا ہے اور وہ اسکی پرستش کرتی ہے کبھی وہ کسی حجر یا شجر کو پوجنے لگتی ہے، اور کبھی اسکا معبود کوئی محیر العقول سیاسی یا مذہبی خیال ہوتا ہے، جو اس کے اعتقاد کو اپنی جانب جذب کر لیتا ہے مگر ان تمام صورتوں

میں مذہبی شعور کی حالت یکساں رہتی ہے، اور جماعت ان سب سے یکساں متاثر ہوتی ہے بشرطیکہ جماعت کو اپنے ان معبودوں کے اندر کوئی مخفی معجزہ یا خرق عادت نظر پڑا ہو، جماعت کا خیال اسقدر پست ہوتا ہے کہ وہ ہر اس محیر العقول خیال یا اس رہنما کو مافوق العادہ تسلیم کرتی ہے جو اسکی توجہ کو اپنی جانب جذب کرلے یا جسکی کامیابی اس کے نزدیک ایک راز ہو،

حقیقت یہ ہے کہ انسان کی اصلی دینداری یہ نہیں ہے کہ وہ کسی معبود کی پرستش کرتا ہے، بلکہ انسان میں اصلی دینداری کا ظہور اس وقت ہوتا ہے جب وہ اپنے ارادہ، اپنی مرضی اور اپنی ذات کو اس معبود کی مرضی اور اس کے ارادہ پر چھوڑ دیتا ہے اور اپنی مرضی کو اسکی مرضی کیلئے بالکل فنا کردیتا ہے، جب یہ اعتقادی کیفیت انسان میں پیدا ہوجاتی ہے تو اس وقت تمام دوسرے خیالات کے گرد و غبار سے اسکا شیشۂ دل پاک و صاف ہوجاتا ہے، اور اسکے تمام اعمال و افعال کا محور اور مرجع وحید صرف وہی ذات ہوتی ہے جسکی رضاجوئی اور ذات پر اُس نے اپنی مرضی اور شخصیت کو نثار کردیا ہے،

لیکن جب دینی عقیدہ اور مذہبی خیال کا غلبہ ہوتا ہے تو چونکہ اس غلبہ کیساتھ تعصب اور غلوے دینی کا پایا جانا بھی ضروری ہے، اسلئے ہر اُس جماعت میں جو کسی مذہبی عقیدہ کی محکوم ہوتی ہے یہ دونوں اوصاف بھی نمایاں طور پر پیدا ہوجاتے ہیں، واقعۂ انقلاب فرانس میں جب چندروزہ جمہوری حکومت قائم ہوئی ہے، تو اس وقت یعقوبی فرقہ کے عیسائیوں پر اسی قسم کا سودا سوار تھا اور تعصب اور غلوے دینی کا اثر انکے ہر ہر فعل و عمل سے نمایاں ہوتا تھا، اور یہ تعصب کسی طرح اس مذہبی تعصب سے کم نہ تھا جو کیتھولک فرقہ کے عیسائیوں سے محکمۂ انکوئزیشن کے قائم کرانے کا باعث ہوا تھا،

غرض جب جماعت پر کسی خیال کا غلبہ ہوتا ہے، تو وہ دیوانگی، کورانہ اطاعت و انقیاد، اور وحشیانہ تعصب کیساتھ مصروف عمل ہوجاتی ہے، لیکن چونکہ کورانہ تقلید اور وحشیانہ تعصب کا رنگ جماعت کے اعمال و افعال پر اسوقت تک نہیں چڑھ سکتا، تاوقتیکہ جماعت کے معتقدات مذہبی جامہ نہ پہن لیں،

اسلئے جماعت کے متعلق عام طور پر یہ کہا جاتا ہی کہ اسکے افعال کا صدور ہمیشہ مذہبی پردے میں ہوتا ہی لیکن اس سودائے مذہبی کے پیدا ہونے کے لئے کچھ یہ ضروری نہیں کہ جماعت کو کسی خاص خیال یا کسی معبود ہی کیساتھ اعتقاد پیدا ہوا ہو، بلکہ کبھی ایسا ہوتا ہی کہ جماعت جس حکمراں کے آگے سرِ تسلیم خم کرتی ہی، وہ بھی اسکی نگاہ میں معبود کا رتبہ حاصل کر لیتا ہی، اور جماعت اسوقت بھی وحشیانہ تعصب کیساتھ اس حکمراں کی فرمانبرداری کرنے لگتی ہی، نپولین کو دیکھو کہ تقریبًا پندرہ برس تک جس خلوص کے ساتھ اسکی پرستش کی گئی ہی، کیا اسکی نظیر کسی معبود یا کسی حکمراں کے حالات میں اب تک دیکھنے یا سننے میں آئی ہی؟ جو نفوذ قلوبِ انسانی پر اسکو حاصل ہوا، کیا اس کی کوئی مثال صفحاتِ تاریخ میں مل سکتی ہی؟

قدیم زمانہ میں مختلف مذاہب اور حکومتوں کے جتنے بانی گذرے ہیں انھوں نے اپنی اپنی قوموں میں اسی طرح نفوذ پیدا کیا، کہ جماعت کے ذہن میں تعصب کے جو دبے دبائے شرارے پہلے سے موجود تھے انکو بھڑکا دیا، اور اس کے ذہن میں تعصب کی آگ کچھ اسطرح سے سلگا دی کہ آخر کار جماعتوں کو بھی اپنی سعادت، عبادت و اطاعت ہی سے وابستہ نظر آنے لگی، موسیو واسٹل دی کولنج نے رومی ممالک گال (فرانس) پر جو کتاب لکھی ہی، اسمیں کیا خوب کہا ہی کہ ممالکِ گال میں رومی سلطنت کو قوت و طاقت کے بل پر استحکام نہیں حاصل ہوا، بلکہ اُسے صرف اسلئے استحکام حاصل ہوا کہ اُسنے لوگوں کے ذہنوں میں اپنی بابت ایک دینی اعتقاد پیدا کر دیا، وہ لکھتا ہی:-

"تاریخ میں ہمیں کوئی مثال کسی ایسی سلطنت کی نہیں نظر آتی جس سے اسکی رعایا نالاں ہو، اور باوجود اس کے اسکا ستارۂ اقبال عروج پر رہا ہو، بلکہ اس کے خلاف تاریخ سے ہمیں جو بات معلوم ہوتی ہی، وہ یہ ہی کہ ایسی حکومتیں کبھی دیرپا نہیں ہوتیں، اگر گال کے باشندے رومن حکومت کو ناپسند کرتے ہوتے تو کیا یہ ممکن تھا کہ رومی شہنشاہ،

کی ۳۰ پلٹنیں ایک لاکھ باشندگانِ گال کو زیر کر لیتیں۔"

حقیقت یہ ہے کہ رومی نشان کے آگے بیکس اقوام سپر انداز جو ہو گئیں، تو اسکی وجہ یہ تھی کہ شہنشاہِ روم اُن کی نگاہ میں ایک معبود کے رتبہ پر پہنچ گیا تھا، اور چھوٹے سے چھوٹے گاؤں میں اسکے نام کی محرابیں اور طاق تعمیر کئے جاتے تھے، اور رومی حکومت میں ایک سرے سے لیکر دوسرے سرے تک ایک جدید مذہب کی اشاعت کی گئی تھی جسکی بنا قیاصرۂ روم کی پرستش تھی، یہانتک کہ مسیحیت کے ظہور سے کچھ مدت پیشتر سرزمینِ گال میں شہر لیون کے قریب قیصر اگسٹس کے نام کا ایک ہیکل تعمیر کیا گیا تھا، جس کے مجاوروں کی سطوت اور ہیبت باشندگانِ گال کے دلوں میں بیٹھی ہوئی تھی، اسے دیکھو اور سوچو کہ کیا یہ ہیبت کسی خوف کے باعث پیدا ہوئی تھی، اگر اس کا باعث خوف تھا تو ساری قوم میں یہ ہیبت کس طرح پیدا ہو گئی؟ پھر یہ خوف متواتر تین صدیوں تک کس طرح برقرار رہا، اصل یہ ہے کہ اس کا باعث خوف نہ تھا بلکہ یہ کچھ اور ہی بات تھی جس کے سبب سے سارا ملک گال بلکہ شہر روم، ملک اسپین، یونان اور ایشیا یہ تمام ممالک قیاصرۂ روم کے ناموں کا کلمہ پڑھتے تھے،

زمانہ قدیم کو جانے دو، اپنے زمانہ کو دیکھو، اس زمانہ میں گو نفوس پر غلبہ حاصل کرنے والوں کے نام کے ہیکل اور عبادتخانے نہیں تعمیر کئے جاتے ہیں لیکن تم دیکھتے ہو کہ وہ لوگ جو اس زمانہ میں نفوذ حاصل کر لیتے ہیں، کس کثرت سے قومیں انکے مجسمے جابجا گذرگاہوں پر نصب کرتی ہیں، کس کثرت سے انکے فوٹو لئے جاتے ہیں اور کس ذوق وشوق سے انکی تصویریں جابجا ہاتھوں ہاتھ بکتی ہیں، اور پھر یہ سنتیں جو طریقے آجکل رائج ہیں وہ میرے خیال میں عبادت کے ان طریقوں سے بدرجہا زیادہ مؤثر ہیں جو اگلے زمانہ میں رائج تھے، حیاتِ اجتماعی کا یہی اعتقادی پہلو ہے، جسکو پیش نظر کر لینے سے تاریخی واقعات کے سمجھنے میں جو دقتیں واقع ہوتی ہیں، وہ رفع ہو جاتی ہیں، ان لوگوں کے مقابلہ میں جو جماعت

اعتقادی پہلو کو سرسری نگاہ سے دیکھتے ہیں، تاریخ کی یہ بیّن شہادت ہے کہ جماعتوں کو ہمیشہ سب سے پہلے ایک معبود کی تلاش ہوتی ہے جس کے لئے وہ ہر وقت سرگرداں رہتی ہے لیکن جب اس شاہد خیالی کا وصال نصیب ہو جاتا ہے، تو اس سے دیوانگی کے عالم میں عجیب غریب اور محیر العقول حرکات صادر ہونے لگتے ہیں، یہ ہے تاریخ کا وہ زبردست حکیمانہ دعویٰ جس کے ثبوت کی شہادت تاریخ کے ایک ایک صفحہ سے ملتی ہے،

لیکن اس مسلم الثبوت تاریخی حقیقت کو فراموش کر کے بعض لوگ اس دعوی کی عمومیت سے انکار کرتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ جماعت کے افعال پر مذہب کا جو اثر تھا وہ صرف زمانۂ قدیم کیساتھ مخصوص تھا معبود اور عبادت یہ سب چیزیں زمانۂ قدیم کے خرافات ہیں، جن کو اس زمانہ کی ترقی یافتہ عقلیں باور نہیں کر سکتیں، اسلئے مذہب کا اثر جماعت پر اب نہیں پڑ سکتا، اور نہ اب جماعت کسی معبود کی پرستش کر سکتی ہے، اب مذہب کا دور ختم ہو گیا، اور مذہب کے معبود جو زمانۂ سابق میں لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل رہنے کے باعث جماعت کو اپنے دام میں پھنسا لیا کرتے تھے اب بے نقاب کر دیئے گئے ہیں، اسلئے جماعت اب زمانۂ سابق کی طرح ان معبودوں کے پھیر میں نہیں آئیگی، یہ ان لوگوں کا خیال ہے جو سمجھتے ہیں کہ اس ترقی یافتہ دور میں علم کو مذہب پر اور عقل کو جذبات پر فتح حاصل ہو گئی ہے اور علم کی روشنی کے سامنے توہمات کی تاریکی غائب ہو گئی ہے، یہ خیال قائم کرتے وقت شاید ان لوگوں کو نفس انسانی کا یہ عالمگیر قانون یاد نہیں رہا، کہ جب عقل اور شعور کا باہم تصادم واقع ہوتا ہے، تو عقل کو شعور پر کبھی فتح حاصل نہیں ہوتی تم اپنی عقلوں کو علم کے تیزاب سے خواہ کتنا ہی صیقل کرو مگر جب عقل اور جذبات کا مقابلہ ہوگا تو جذبات کی تاریکی کے آگے عقل کی تیز روشنی ہمیشہ مدھم رہے گی، عقل پر جذبات کا رنگ جو چڑھ جاتا ہے اسکا صیقل کسی تیزاب سے ممکن نہیں، پس علم کی ترقی مذہب کے اس اثر کو کبھی نہیں مٹا سکتی جو مذہب کو

جماعت پر زمانۂ دراز سے حاصل ہی، یہی وجہ ہے کہ جماعت کو جو رجحان اپنے معبودوں کی جانب زمانۂ قدیم میں تھا، اسمیں اب بھی کوئی فرق نمودار نہیں ہوا، اور جماعت اب بھی سابق کیطرح اپنے معبودوں کے نام پر قربان ہونے کے لئے تیار ہی، البتہ معبودوں کی جو کثرت زمانۂ سابق میں تھی، اسمیں ضرور فرق آگیا ہے، لیکن مذہبی اثر وغلبہ کا مدار معبودوں کی کثرت وقلت پر نہیں بلکہ جماعت کے ان مذہبی جذبات اور اسکے اس رجحانِ قلبی پر ہی جس کا اظہار وہ اپنے معبودوں کیساتھ کرتی ہی اور اس قلبی رجحان اور مذہبی جذبہ میں کسی قسم کا ضعف نمودار نہیں ہوا ہی، دیکھیو جب جنرل بولنگر کا فتنہ اٹھا ہی، تو اس وقت جماعت کا مذہبی جذبہ کس سہولت سے مشتعل ہو گیا تھا اور ایک ایک دیہات اور قصبہ میں اس جنرل کے مجسمے اور بت نصب کیئے گئے تھے، یہانتک کہ عام طور سے لوگوں کے ذہنوں میں اسکی جانب سے یہ اعتقاد راسخ ہو گیا تھا کہ اسکو ردِّ مظالم اور مصائب و آلام سے نجات دینے پر قدرتِ تامہ حاصل ہی، پھر اس اعتقاد میں یہانتک ترقی ہوئی تھی، کہ لکھوکھا آدمی اسکے ساتھ جان دینے پر آمادہ ہو گیا تھا، اور اگر کہیں اسکے اخلاق وعادات اسکی بڑھتی ہوئی شہرت کیے مددو معاون ہوتے تو وہ تاریخ میں ایک عالیشان مرتبہ حاصل کر لیتا اور اس کا نام لوحِ تاریخ پر سنہرے حروف میں کندہ کیا جاتا،

پس اب ہمکو اس بات کا بار بار دہرانا کچھ بیکار سا معلوم ہوتا ہی، کہ جماعت کو ایک دین اور مذہب کی ہمیشہ ضرورت رہتی ہی، اور جب تک کوئی مذہبی عقیدہ اسکے دماغ پر غلبہ حاصل نہیں کر لیتا اسوقت تک اسکے قوائے عمل شل، اور اسکے اعضا بے حس وبے حرکت رہتے ہیں، پھر یہ بھی کوئی ضروری نہیں کہ اس مذہبی عقیدہ میں بھی ان عقائد کی طرح جو الہامی مذاہب نے دنیا کو تلقین کیئے ہیں روح و خدا، جزا و سزا وغیرہ کی حقیقت تسلیم کی گئی ہو، اور یہ مذہب بھی دیگر مذاہب کیطرح اسی قسم کے عقیدوں پر مشتمل ہو، بلکہ اگر الحاد و دہریت کو بھی مذہبی رنگ میں لا کر جماعت کے سامنے پیش

کیا جائے تو اس مذہب کو بھی اسی جوش و خروش کیساتھ قبول کریگی جس طرح وہ دیگر الہامی مذاہب کو بلا چون و چرا تسلیم کر لیتی ہے، ایک جدید مذہب جو فلسفۂ ایجابی کے نام سے فرانس میں اب شایع ہوا ہے اسکے معتقدین جس کثرت کیساتھ پیدا ہوتے جاتے ہیں وہ ہمارے دعوی کا ایک نہ بردست ثبوت ہے اسکے علاوہ نہاسٹ فرقہ کے ایک شخص کی سرگذشت جو ہم سے ایک وسیع خیال مفکر موسیو دستوئیسکی نے بیان کی وہ بھی ہمارے دعوی کی مزید شہادت ہے، اس شخص کو ایک روز یہ خیال پیدا ہوا کہ لوگوں کا گرجوں میں تصویروں اور بتوں کی پرستش کرنا قدیم زمانہ کے توہمات سے ہے، یہ خیال پیدا ہوتے ہی اس نے بزرگان دین کی تصویروں کو جو ایک گرجے میں لٹک رہی تھیں، پھینک دیا شمعوں کو جو گرجے کے اندر جابجا روشن تھیں گل کر دیا، اور ان تصاویر کی جگہ پر دہریہ فلاسفہ میں سے بوخنر اور مولیشاٹ کی تصانیف لاکر رکھدیں، اسکے بعد اسکی حالت میں پھر تغیر ہوا، تقوی کا جنون اس پر پھر سوار ہوا، اور اب اس نے انہی کتابوں کے گرد موم کی شمعیں روشن کر دیں، اس واقعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ انسان کے ان عقائد میں جو ارثاً حاصل ہوتے ہیں، کبھی تغیر نہیں ہوتا، البتہ کبھی کبھی ان عقائد کی صورت بدل جاتی ہے،

پس مذہب کو جماعت کے مشاعر و احساسات اور اعمال و افعال پر جو تسلط اور غلبہ حاصل ہے، اسکی بنا پر میرا یہ خیال ہے کہ کوئی شخص اہم تاریخی واقعات کی حقیقت کو اُس وقت تک تمام و کمال نہیں سمجھ سکتا، تاوقتیکہ وہ اُن دینی معتقدات سے واقفیت نہ پیدا کر لے، جو ان واقعات کی آڑ میں مجمع کی قیادت کرتے ہیں، پھر بعض تاریخی واقعات تو ایسے گذرے ہیں کہ جنکی توجیہ جماعت کے اعتقادی پہلو کے علاوہ کسی اور پہلو سے ہو ہی نہیں سکتی، یہی وجہ ہے کہ موسیو ٹائن نے جو ایک زبردست مورخ گذرا ہے گو واقعہ انقلاب فرانس کی تاریخ لکھتے ہوئے اس واقعہ کے تمام جزئیات پر مورخانہ اور محققانہ نظر ڈالی ہے لیکن چونکہ اس نے جماعتوں کی اس نفسانی حقیقت کو کہ جماعتیں ہمیشہ مذہبی جذبہ کی محکوم ہوتی ہیں نظر انداز کر دیا، اسلئے بعض واقعات کے اسباب دریافت کرنے میں وہ ناکام رہا،

یہانتک کہ آخرکار اُس نے یہ قطعی فیصلہ سنا دیا کہ چونکہ انقلابِ فرانس کے بڑے بڑے نامور لیڈر خودغرض اور جفاکار تھے اور ان شورشوں کے پردے میں اپنے ذاتی اغراض حاصل کرنا چاہتے تھے، اسلیے جماعت کو انھوں نے حصولِ مقاصد کا آلہ بنا رکھا تھا، حالانکہ حقیقت یہ ہو کہ موسیو ٹائن کی یہ سخت غلطی ہو اور انقلابِ فرانس کی تاریخ خونریزیوں اور وحشیانہ اعمال سے جو لبریز نظر آتی ہو اسکی وجہ یہ نہیں ہے کہ ان خونریزیوں کے ذریعہ سے اس زمانہ کے لیڈر ذاتی اغراض حاصل کرنا چاہتے تھے، بلکہ ان واقعات کی اصلی حقیقت اسوقت تک سمجھ میں نہیں آسکتی ہتا وقتیکہ پہلے یہ پیش نظر نہ کرلیا جائے کہ یہ انقلاب ایک جدید دینی عقیدہ اور مذہبی جذبہ کا نتیجہ تھا، جو اس زمانہ کی عقلوں پر غالب آگیا تھا، واقعہ اصلاح مذہب، کارزار سینٹ بارٹلمی، فرانس کے حروبِ دینیہ، محکمۂ انکویزیشن اور واقعۂ ہول، غرض اس قسم کے تمام واقعات اسوقت تک ظہور پذیر نہیں ہوتے، تاوقتیکہ جماعتوں کا مذہبی جذبہ جماعتوں کی رہنمائی نہیں کرتا، یہ مذہب ہی کی کرشمہ سازیاں ہیں کہ وہ لوگ جو پہلے نہایت امن و سکون کے ساتھ بسر کر رہے تھے، ایکبارگی درندہ خصلت بنجاتے ہیں، امن و تہذیب کا خیال بالاے طاق کر دیا جاتا ہو، اور آتش و آہن کا استعمال شروع ہوجاتا ہو، کیا کوئی ظالم سے ظالم بادشاہ بھی لوگوں کے دلوں میں ایسا زبردست اعتقاد پیدا کرسکتا ہے کہ وہ خوشی خوشی دہکتی ہوئی آگ میں کود پڑیں ؟

پس جن مورخوں نے اس قسم کے واقعات کے متعلق یہ فیصلہ کیا ہو کہ یہ فتنے چند خودغرض لیڈروں یا بادشاہوں کے ظلم وجور کی بدولت برپا ہوئے، انھیں معلوم ہونا چاہئے کہ بادشاہوں اور لیڈروں کی قدرت سے یہ باہر ہے کہ وہ انسانوں کو اپنی مرضی سے لقمۂ اجل بننے پر مجبور کرسکیں پس واقعۂ ہول کے باعث روبسپیر یا ڈانٹن یا سینٹ جوسٹ نہ تھے، بلکہ ان افراد کے پردے میں جماعت کی روح کام کر رہی تھی، جس پر ایک خاص مذہبی عقیدہ غالب آگیا تھا،

بابِ دوم
جماعت کے افکار و معتقدات

فصل اول

معتقداتِ جماعت کے عوامل بعیدہ

ان مختلف عوامل کا بیان جو معتقداتِ جماعت کو پیدا کرتے ہیں، معتقداتِ جماعت سابق محنت کا نتیجہ ہوتے ہیں، مختلف موثرات کی تجدید جو ان معتقدات کو پیدا کرتے ہیں،

۱۔ **قومیت کا اثر**:۔ معتقداتِ جماعت پر قومیت کا کیا اثر ہوتا ہی، یہ بحث کہ قومیت اجداد کی میراث ہوتی ہی، جو قوموں کو ترکہ میں ملتی ہی،

۲۔ **قومی روایات کا اثر**:۔ یہ بحث کہ قومی روایات قومی روح کا خلاصہ ہوتے ہیں۔ اجتماعی حیثیت سے قومی روایات کی کیا اہمیت ہی، قومی روایات تھوڑا عرصہ گذرنے کے بعد قوم کے لئے مضرت رساں ثابت ہوتے ہیں، قومیں اپنے قومی روایات کی بے انتہا حفاظت کرتی ہیں،

۳۔ **زمانہ کا اثر**:۔ معتقداتِ جماعت کی ترقی و تنزل میں زمانہ کو بڑا دخل ہوتا ہی،

یہ بحث کہ کسی شورش کے بعد جس سے قومی نظام درہم برہم ہوگیا ہو، زمانہ کی وساطت سے پھر قومی نظام کی کس طرح اصلاح ہوتی ہی،

۴- **نظامِ حکومت اور نظامِ معاشرت کا اثر:** - نظامِ حکومت اور نظامِ معاشرت کے اثر کے بارے میں موجودہ زمانہ کے علماء سے غلط فہمیاں ہوئی ہیں، درحقیقت جماعت پر ان کا اثر بہت ضعیف ہوتا ہی، نظامِ حکومت اور نظام معاشرت خود قومی روح کے نتائج ہوتے ہیں، قوموں کیلئے یہ کوئی آسان کام نہیں ہی، کہ جو نظامِ حکومت اور نظامِ معاشرت وہ چاہیں، اختیار کرلیں قوموں کے نظامِ حکومت اور نظامِ معاشرت کی پیدائش کس طرح ہوتی ہی، بعض نظامِ حکومت اور نظامِ معاشرت گو عقلی پہلو سے مہمل ہوتے ہیں، لیکن بعض قوموں کے لئے نہایت ضروری ہوتے ہیں،

۵- **تعلیم و تربیت کا اثر:** - تعلیم و تربیت کے بابت موجودہ زمانہ میں غلط فہمیاں ہوئی ہیں، تعلیم و تربیت کے اثر کی تائید میں چند اعدادی تفصیلات، لاطینی تربیت اخلاق کی مضعف ہے، یہ بحث کہ تعلیم سے کیا اثرات پیدا ہوتے ہیں، مختلف اقوام کی مختلف مثالیں "

ابوابِ سابق میں ہم نفس اجتماعی کے قوائے ذہنی کی تفصیل بیان کرچکے ہیں یہ بھی معلوم ہوچکا کہ اس کے مشاعر و جذبات کیا کیا ہیں، اسکے فکر کرنے کا کیا طرز ہی! اور وہ استدلال کس طرح کرتی ہے، غرض بیاناتِ سابقہ میں نفسِ اجتماعی کے مظاہر کی تشریح تفصیل کے ساتھ گذر چکی ہے، اب اس باب میں ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ جماعت کے

اعتقادات اور افکار کس طرح پیدا ہو کر نفوسِ جماعت میں رسوخ حاصل کرتے ہیں، وہ کون سے عوامل ہیں جو افکارِ جماعت کی پیدائش کے باعث ہوتے ہیں اور قوموں پر ان عوامل کا کیا اثر پڑتا ہے،؟

وہ مؤثرات وعوامل جو معتقداتِ جماعت کی پیدائش کے باعث ہوتے ہیں انکی دو قسمیں ہیں،

۱۔ موثرات وعواملِ بعیدہ،

۲۔ موثرات وعواملِ قریبہ،

عواملِ بعیدہ کی حالت یہ ہے کہ وہ جماعت میں صرف یہ استعداد پیدا کر دیتے ہیں کہ وہ بعض اعتقادات، افکار اور خیالات کو قبول کرلے اور بعض کو رد کر دے، اسکو دوسرے لفظوں میں یوں سمجھو کہ عواملِ بعیدہ کا فعل واثر ایک مخصوص آب وہوا اور مخصوص تربیت کا پیدا کرنا ہوتا ہے جسمیں نئی قسم کے افکار حیرت انگیز اثر و قوت کیساتھ پھلتے پھولتے ہیں، انکا ظہور اگرچہ دفعۃً اور اچانک ہوا کرتا ہے اور اس لحاظ سے انکی حالت بجلی کی سی ہوتی ہے، جو دفعۃً چمکتی ہے اور فوراً نظر سے غائب ہو جاتی ہے لیکن ان معتقدات و افکار کے رسوخ حاصل کرنے کیلئے مدت دراز کی محنت اور ان عواملِ بعیدہ کی تاثیر وعمل کی نہایت شدید احتیاج ہوتی ہے بعض اوقات قومی انقلاب کا منظر اچانک ہماری نگاہ کے سامنے آجاتا ہے، اور یہ منظر ہمکو حیرت و تعجب میں ڈالدیتا ہے، لیکن بات یہ ہے کہ اس انقلاب کا ظہور گو ہماری آنکھوں کے سامنے اچانک ہوا ہے، مگر اسکی تیاری مدت دراز سے عمل میں آرہی تھی، اور مختلف عوامل اپنا فعل واثر کر رہے تھے، جو ہم کو دکھائی نہیں دیتے تھے،

لیکن عواملِ بعیدہ کی کارگذاری جب ختم ہو جاتی ہے تو اسوقت عواملِ قریبہ کی تاثیر کا

وقت آتا ہی اور یہ عوامل اس کام کو جو عواملِ بعیدہ ادھورا چھوڑ گئے ہیں، انجام تک پہنچاتے ہیں، اور اس استعداد کو جو عواملِ بعیدہ ذہنِ جماعت میں پیدا کر گئے ہیں، فعلیت کا جامہ پہناتے ہیں یعنی وہ معتقدات و خیالات جو مدت سے ذہنِ جماعت میں موثراتِ بعیدہ کے زیر اثر استحکام و رسوخ حاصل کر رہے تھے' اب موثراتِ قریبہ کے زیر اثر ذہنی جامہ اتار کر میدانِ عمل میں اپنے تئیں بے نقاب کر دیتے ہیں، اور انقلاب کی عالم سوز چنگاریاں جو مدتوں سے دبی چلی آرہی تھیں اب انہیں ان موثراتِ قریبہ کی بدولت ایکدم اشتعال پیدا ہو جاتا ہی، اور آخرکار جماعت آہنی ہتھیاروں سے مسلح ہو کر میدانِ کارزار میں یکبارگی کود پڑتی ہی، شورشیں برپا ہوتی ہیں، قیامت کے فتنے نمودار ہوتے ہیں اور آدمیوں کا ایک جمِ غفیر اپنے قائد کے گرد جمع ہو کر حکومت کو پلٹ دیتا ہی،

جتنے اہم تاریخی واقعات ابتک گذر چکے ہیں، انہیں ان دو قسم کے موثرات کے فعل و اثر کو ہمیشہ دخل رہا ہی، اور دنیا میں کوئی واقعہ اور کوئی انقلاب، اُسوقت تک ظہور میں نہیں آسکتا، تاوقتیکہ ان دونوں قسم کے موثرات جماعت پر اپنا فعل و اثر مکمل نہ کرلیں، مثال میں واقعہ انقلابِ فرانس کو لو، جو انسان کی تاریخ میں انقلاب کا ایک مکمل نمونہ ہی، اسکے موثراتِ بعیدہ میں یہ چند چیزیں تھیں، فلاسفہ کی تصانیف، امرار کا ظلم و جور اور علوم و فنون کی ترقی، لیکن جب ان موثرات کا عمل تمام ہو چکا اور جماعت کی روح جو مردہ تھی زندہ ہو گئی اُسوقت موثراتِ قریبہ کا ظہور ہونے لگا، خطبار لوگوں کو اپنے دھواں دھار خطبوں سے مسحور کرنے لگے بادشاہ نے معمولی اصلاحات کے اجرا میں رکاوٹیں پیدا کرنا شروع کر دیں، یہ ہونا تھا کہ فتنہاے خوابیدہ جاگ اُٹھے اور ہنگامۂ محشر خیز برپا ہو گیا،

موثراتِ بعیدہ میں سے بعض وہ عوامل ہیں جنکا اثر عالمگیر ہوتا ہی یعنی جو ہر جماعت کے معتقدات و افکار میں یکساں اثر کرتے ہیں، اور وہ حسب ذیل ہیں: (۱) قومیت (۲) قومی روایات

(۳) قومی نظامِ حکومت اور نظامِ معاشرت (۴) زمانہ (۵) تربیت و تعلیم،
اب ہم ان میں سے ہر ایک پر علٰحدہ علٰحدہ بحث شروع کرتے ہیں،

(۱)

قومیّت کا اثر

قومیت کا جو اثر جماعت پر پڑتا ہی، اسکو دیگر موثرات کے اثر سے بہت زیادہ اہمیت حاصل ہی، کیونکہ یہ دیگر موثرات کے اثر سے زیادہ مستحکم ہوتا ہی، اور دیگر مؤثرات کا اثر جماعت پر ہمیشہ قومیت کے اثر کے تابع ہوکر ظاہر ہوتا ہی، قومیت کے اس مستحکم اثر کی بابت ہم اپنی دوسری کتاب "قوموں کی ترقی و تنزل کے قوانین نفسی"ؔ[۱] میں نہایت تفصیل سے بحث کر چکے ہیں، ہم اس کتاب میں یہ بھی بتا چکے ہیں، کہ تاریخی قوموں کی پیدائش کس طرح ہوتی ہی، قوموں پر انکی قومیت کا کیا اثر ہوتا ہی اور جب اس کا اثر درجۂ کمال کو پہنچ جاتا ہی، تو وراثت کے ذریعہ سے وہ کیونکر رسوخ و استحکام حاصل کرتا ہی، نیز یہ کہ قوموں کے مزاجِ عقلی کی تکوین کس طرح ہوتی ہی، پھر ہم یہ بھی بتا چکے ہیں کہ قومیت کا اثر اسقدر قوی ہوتا ہی کہ اس اثر کی موجودگی میں کسی قوم کے مظاہر تمدن (یعنی علوم و فنون، مذہب اور نظامِ حکومت و نظامِ معاشرت) اسوقت تک دوسری قوم میں منتقل نہیں کئے جاسکتے جبتک انہیں خود تغیر و تبدل نہ کیا جائے اس بحث کو ہم نے چار فصلوں میں پھیلایا تھا، کیونکہ ہکو خیال تھا کہ یہ ایک ایسا جدید نظریہ ہی جس پر تاریخی واقعات کی حقیقت کا سمجھنا موقوف ہی، اسکے علاوہ اس کتاب میں یہ بھی معلوم ہوگیا تھا، کہ گو عناصر تمدن کو ایک قوم سے دوسری قوم کیجانب اسوقت تک منتقل نہ کیا جاسکتا ہو تاوقتیکہ ان میں تغیر نہ کیا جائے، تاہم ماحول اور دیگر عوامل خارجی کبھی کبھی اس تغیر کو پیدا کر دیتے ہیں، لیکن باوجود اسکے بھی قومیت کا اثر اتنا قوی ہوتا ہی کہ یہ تغیر دقتی

---

[۱] انقلاب الامم جس کو دار المصنفین اعظم گڈھ نے شائع کیا ہی، (مترجم)

ثابت ہوتا ہے۔ علاوہ بریں اس کتاب میں بھی قومیت کے اس عالمگیر اثر کیجانب ناظرین کو جابجا اشارات ملیں گے، اور ہم جابجا اس بات کو واضح کردیں گے، کہ نفسِ اجتماعی کے ممیزات پر قومیت کا اثر کس قدر قوی ہوتا ہے اور یہی سبب ہے کہ ایک شہر کے باشندے دوسرے شہر کے باشندوں سے اعتقادات خیالات اور طرزِ عمل میں کس قدر مختلف ہوتے ہیں،

(۲)

قومی روایات کا اثر

قومی روایات کسی قوم کے اُن افکار، خیالات اور ضروریات سے عبارت ہیں جو زمانۂ گزشتہ سے سلسلہ وار نسلاً بعد نسلٍ منتقل ہوتے چلے آتے ہیں، اور جن سے قومی روح یا بالفاظِ دیگر قوموں کے مزاجِ عقلی کی تشکیل ہوتی ہے، اور چونکہ وراثت کے پے درپے اثر سے وہ یک گونہ رسوخ حاصل کر لیتے ہیں، اسلئے قوموں کے افکار، معتقدات اور انکے طریقِ کار کے متعین کرنے میں ان روایات کو بڑا دخل ہوتا ہے، اور قوموں کی ترقی و تنزل میں انکو بڑی اہمیت حاصل ہوتی ہے،

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے جو مختلف قوموں کی تاریخ کے مطالعہ سے مجھے معلوم ہوئی ہے اور میرا خیال ہے کہ جس طرح علم ترکیبِ اجسام کی تاریخ میں، اس تحقیق سے کہ کائنات کے تمام تغیرات میں ماضی کی تاثیر کو بہت بڑا دخل ہوتا ہے، ایک جدید دور کا آغاز ہوا تھا، اسی طرح جب یہ تاریخی حقیقت بھی عام طور پر تسلیم کر لیجائیگی، تو اس وقت علم تاریخ میں بھی ایک نمایاں انقلاب ہو جائیگا لیکن ابتک اس جدید تاریخی حقیقت کی اہمیت کا احساس لوگوں کو اس درجہ تک نہیں ہوا ہے جس درجہ تک واقعۃً اسکو اہمیت حاصل ہے اور اس زمانہ میں گذشتہ زمانہ کے سیاست دانوں کیطرح بعض سیاست دانوں کا یہ خیال ہے کہ قومیں اپنے ماضی کی پوشاک اتار کر نورِ عقل کی رہنمائی میں جدید پوشاک زیبِ تن کر سکتی ہیں، حالانکہ ان کو یہ خیال نہیں رہا

کہ قوم کیحالت بھی دیگر زندہ اجسام کے مانند ہے، جب ماضی ہی نے پیدا کیا ہے، پس دیگر اجسام کیطرح قوموں کو بھی یہ قدرت حاصل نہیں، کہ اپنے آثار میراث میں خود کسی طرح کا تغیر کر سکیں، علاوہ بریں قومیں اور جماعتیں تو برطرف خود افراد کی حالت تو دیکھو! انکی رہائش، انکا طرز بود و باش، ان کا پیشہ، ان کا کاروبار، غرض انکی زندگی کا ہر ہر لمحہ کس طرح محض دوسروں کی تقلید کرنے میں بسر ہوتا ہے، پھر جماعت جو افراد کے مجموعہ کا نام ہے، وہ کس طرح اپنی مرضی کے مطابق اپنے آثار میراث میں کوئی تغیر کر سکتی ہے، بلا شبہہ بعض اوقات قومیں اپنے موروثی نظام حکومت اور نظام معاشرت میں کچھ تھوڑی سی ترمیم و تنسیخ کرتی ہیں، لیکن جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں، اس تغیر و تبدل اور اس ترمیم و تنسیخ کا اثر ظاہر سے کبھی تجاوز نہیں کرتا، صرف ناموں میں تغیر ہو جاتا ہے، باقی اصلیت وہی رہتی ہے،

ہاں تو کیا یہ کوئی افسوسناک بات ہے، کیا جماعت کی تقلید پرستی تہذیب کی ترقی میں رکاوٹ پیدا کرتی ہے؟ اور کیا جماعت کی تقلید پرستی قوموں کی ترقی کی سد راہ ہوتی ہے؟ نہیں ایسا نہیں، بلکہ اسکے خلاف مجھکو تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر ان مختلف قومی روایات کا وجود نہ ہوتا جو قوموں کے اعمال و افعال کے حقیقی رہبر ہوتے ہیں، تو شاید کوئی قوم معراج ترقی پر نہ پہنچ سکتی، بلکہ تہذیب و تمدن بھی اس درجہ سے گر جاتا، جو اتنی محنت سے اُسنے اب حاصل کیا ہے، خیال کرنے کی بات ہے کہ انسان کا جب سے وجود ہوا ہے، اس وقت سے برابر یہی اسکا ایک مقصد رہا کہ کوئی نئی بات ایجاد کیجائے، یہانتک کہ جب کبھی پرانی قومی روایات کا اثر زائل ہو گیا، تو اُسنے فوراً انکو مٹا دیا، اور نئے سرے سے دوسری نئی نئی باتیں ایجاد کر لیں، غرض انسانی تہذیب و تمدن کی حقیقت پر اگر غور کرو تو معلوم ہوگا کہ تہذیب و تمدن کا مدعا ہمیشہ یہی رہا ہے، کہ پرانی چیزیں مٹا دیجائیں اور انکی جگہ نئی نئی چیزیں ایجاد کیجائیں، پس اگر ان پرانی چیزوں اور قدیم روایات اور قومی سرمایہ کا وجود

نہ ہوتا تو قومیں کس چیز میں اصلاح کرتیں، یہ اختراع و ایجاد کس طرح عمل میں آتی ؟ اور تہذیب کی نمود و نمایش کا جو انسان کی جدت پسندی کیساتھ قائم ہے، مصرف کہاں سے ہاتھ آتا، حاصل یہ کہ اگر کسی قومی سرمایہ اور قدیم روایات کا وجود نہ ہوتا، تو تمدن کس مصرف کا تھا ؟ تمدن کا تو مدعا ہی یہ ہے کہ قدیم روایات میں جو کمزوری پیدا ہوگئی ہے، اسکی اصلاح کرنا اور اگر ان روایات کا کوئی جزو بے مصرف اور ناکارہ ہوگیا ہے، تو اسکی جگہ پر کسی جدید جزو کا اضافہ کرنا اور ظاہر ہے کہ اسکے لئے کسی قدیم محفوظ سرمایہ کی کس قدر حاجت ہے، پس اگر تہذیب و تمدن کے نقطۂ نظر سے دیکھو تو انسان کی تمدنی ترقی میں قومی روایات کی بہت بڑی اہمیت ثابت ہوتی ہے لیکن جب ان قومی روایات کے کسی جزو کے بیکار ہوجانیکی وجہ سے تجدید و اصلاح کی ضرورت پیش آتی ہے، تو اس وقت جس بات میں دشواری کا سامنا ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ تغیر و بقا یا تجدید و تاسیس میں توازن کس صورت سے قائم کیا جائے بات یہ ہے کہ قوموں کی فطرت کچھ اس طرح کی واقع ہوئی ہے، کہ جب بعض اخلاق و عادات امتداد زمانہ سے قوم میں راسخ ہوجاتے ہیں، تو چونکہ قومیں تقلید پرست واقع ہوئی ہیں، اسلئے قوموں کے ان اخلاق و عادات کا اپنی جگہ سے ہلانا کچھ آسان کام نہیں ہوتا، اب اس وقت اگر پے در پے فتنہ انگیزیوں اور انقلابات سے کام نکالا جاتا ہے، تو دو ہی باتیں حاصل ہوتی ہیں، یا تو یہ کہ قومی عناصر کے ان اجزا میں باہم انفصال جو پیدا ہوا تھا، وہ سرے سے مفقود ہوجاتا ہے، اور ان شورشوں کی جو غرض تھی وہ بالکل فوت ہوجاتی ہے، یا یہ انفصال اس قدر کشادہ ہوجاتا ہے کہ قومی عناصر جو باہم پیوستہ تھے اور جن کی پیوستگی پر قومی نظام کا دار و مدار تھا وہ بکھر جاتے ہیں، غرض ہر صورت میں ان شورشوں کا نتیجہ یہ ہوتا ہے، کہ قومی نظام درہم برہم ہوجاتا ہے، اور تمام قوم میں سراسیمگی اور پراگندگی پھیل جاتی ہے، یہانتک کہ اس پریشان حالی کے باعث یہ خوف پیدا ہوجاتا ہے کہ کہیں زوال و انحطاط کی باد تند قومی عمارت کو ڈھا نہ دے،

پس قوموں کیلئے بیش قیمت نصیحت صرف یہ ہے کہ وہ نہایت خاموشی کیساتھ اپنے ان قومی روایات پر کاربند ہیں جو آباو اجداد سے اُن کو ورثہ میں ملے ہیں اور اگر کبھی ان کو اپنے اُن قدیم روایات میں کوئی تغیر کرنے کی ضرورت محسوس ہو تو نہایت ہوشیاری کیساتھ تھوڑا تھوڑا کرکے رفتہ رفتہ تغیر کریں، ورنہ خوف ہے کہ کہیں انتشار و بدامنی کی چنگاریاں مشتعل ہوکر قوم کے خرمن ہستی کو جلا کر خاک سیاہ نہ کردیں، لیکن چونکہ زمانہ کا ہاتھ اسقدر طاقتور اور زبردست ہے کہ قوموں کو کسی نہ کسی وقت اپنے قومی روایات میں اصلاح و تجدید کی ضرورت ضرور پیش آتی ہے اسلئے قوموں کی زندگی میں یہی ایک نازک موقع ہوتا ہے، جس میں بہت کم قوموں نے عزم و استقلال کا ثبوت دیا ہے، گذشتہ زمانہ میں رومیوں کی قوم اور موجودہ زمانہ میں انگریزی قوم صرف یہی دو حوصلہ مند قومیں ہیں، جن کا پائے ثبات نازک سے نازک موقعوں پر بھی بہت کم متزلزل ہوا ہے، باقی دنیا کی دوسری قومیں ایسے نازک وقت میں اکثر فنا ہوگئی ہیں،

یہی وجہ ہے کہ قومی روایات اور قومی سرمایہ کی حفاظت کا قوموں اور جماعتوں کو سب سے زیادہ خیال رہتا ہے، یہانتک کہ قومیں ان لوگوں سے لڑنے جھگڑنے پر تُل جاتی ہیں، جو ان کے قومی روایات میں کوئی تغیر یا ترمیم کرنا چاہتے ہیں، اور پھر جماعتوں میں بھی وہ جماعتیں اسکا زیادہ خیال رکھتی ہیں، جن کا دائرۂ اثر محدود ہوتا ہے، اور اصل یہ ہے کہ ان قوموں کی حفاظت بغیر اسکے ہو ہی نہیں سکتی، لہذا اگر یہ قومیں اپنے قدیم روایات کو محفوظ نہ رکھیں تو سب سے پہلے حوادث زمانہ کا شکار یہی ہوں، تقلید پرستی کا یہی وصف ہے جو قوموں کو اپنے قومی روایات میں اصلاح و تجدید کی اجازت نہیں دیتا، اور اگر قومیں کبھی اپنے حالات میں اصلاح کرتی بھی ہیں تو جیسا کہ میں بیان کرچکا ہوں اس اصلاح کا اثر ظاہری نمود سے کبھی تجاوز نہیں کرتا، گذشتہ صدی میں مذہب کی جانب سے جو عام نفرت پھیلی ہوئی تھی، اس سے یہ خیال ہوتا تھا کہ شاید اب مذہب کی

سطوت کا خاتمہ ہو چکا، اور آیندہ کے لئے اس قید سے نجات مل گئی لیکن تھوڑی ہی مدت گذری تھی کہ لوگوں میں مذہبی جوش نہایت سرعت سے پھر پیدا ہو گیا، اور گرجوں اور پادریوں کی حکومت پھر قائم ہو گئی، اب سلطنت نے جو یہ دیکھا تو چار و ناچار اسکو بھی ارکانِ مذہبی کی ترویج میں سہولت پیدا کرنی پڑی، ان واقعات کو ذرا فور کرائی کی زبانی سنو، جو گذشتہ انقلاب فرانس میں خود شریک تھا، اور جس کے قول کو موسیو ٹائین نے بھی نقل کیا ہے، فور کرائی کہتا ہے:-

"اب کچھ دنوں سے یہ عجیب بات دیکھنے میں آتی ہے کہ یکشنبہ کے روز گرجوں میں نمازیوں کی کثرت ہوتی ہے، اور لوگ گرجوں میں آنے جانے لگے ہیں، ان واقعات سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ فرنچ قوم اپنے قدیم عادات کی جانب پھر عود کر رہی ہے، اور قوم میں یہ میلان جو پیدا ہوا ہے، اسکو روکنا اب محال ہے، اسلئے کہ سوادِ اعظم اب اسوقت مذہب کا محتاج ہے، زمانۂ حال کے فلاسفہ کی یہ غلطی ہے جو وہ سمجھتے ہیں، کہ اگر تعلیم عام کر دیجائے گی، تو یہ مذہبی اوہام و خرافات فنا ہو جائینگے اس غلط فہمی کا سب سے بڑا سبب یہ ہے، کہ وہ یہ فراموش کر گئے ہیں کہ دنیا کے بہت سے مفلس لوگوں کے لئے مذہب تسلی اور سکون کے سامان فراہم کرتا ہے، اور اس بنا پر ہمیں قوم کیلئے گرجوں اور اس کے پادریوں کو باقی رکھنا چاہئے"

پس قومی روایات کا ہمیشہ یہی حال ہوتا ہے، کہ اگر بعض وجوہ کی بنا پر کسی وقت ان کا اثر زائل ہو گیا تو تھوڑے عرصہ کے بعد انکا غلبہ پھر عود کر آتا ہے، قومی روایات کی قوت اسقدر زبردست ہوتی ہے کہ کوئی بڑے سے بڑا انقلاب بھی انکو پوری شکست نہیں دیسکتا، یہ قسم قسم کی تصویریں جو گرجوں میں لٹکتی ہیں، انکا اثر گرجوں تک محدود نہیں، اور یہ ظالم و جفاکار لوگ جو عیش و آرام کیساتھ زندگی بسر کرتے ہیں، قلوبِ انسانی پر ان کا غلبہ نہیں ہوتا، کیونکہ انکے شاہانہ جلال و جبروت کے تخت تو چشم زدن میں الٹ دیئے جا سکتے ہیں، لیکن اربابِ ادیان کا جو غلبہ قلوبِ انسانی

پر ہوتا ہی، اُسے زمانہ ہی رفتہ رفتہ مٹا سکتا ہی،

(۳)
زمانہ کا اثر

قوموں کی ترقی وتنزل اور عروج وانحطاط میں جن عوامل و موثرات کے اثر کو دخل ہوتا ہی، انہیں زمانہ کے اثر کو بھی شمار کرنا چاہئے، زمانہ ہی کے ہاتھوں چیزیں بنتی بگڑتی ہیں، اور زمانہ ہی کی کرشمہ سازیاں ہیں، کہ بالو کے تودے ایک مدت کے بعد پہاڑوں کی شکل اختیار کرتے ہیں، غرض دنیا میں جو واقعہ ظہور پذیر ہوتا ہے، اور جو تغیرات پیدا ہوتے ہیں، انہیں زمانہ کی صنعت گری کو بڑا دخل ہوتا ہی، کسی نے کیا خوب کہا ہی کہ اگر چیونٹی کو کہیں ایک مدت کا عرصہ ملجائے، تو وہ ایک پہاڑ کو پارہ پارہ کر سکتی ہے،

زمانہ کا اثر اس قدر قوی ہوتا ہے کہ وہ اُن موثرات کے اثر پر بھی حاوی ہوجاتا ہی جن کے بغیر معتقداتِ جماعت کا پیدا ہونا ناممکن ہی، مثلاً قومیت اور قومی روایات وغیرہ زمانہ ہی معتقداتِ جماعت کو پیدا کرتا ہی، بڑھاتا ہی، نشو ونما دیتا ہی، اور پھر ان کو مٹا دیتا ہی، معتقداتِ جماعت اسی کے سہارے پر نشو ونما حاصل کرتے ہیں، اور اسی کی بدولت انکو ضعف لاحق ہوتا ہی، یہ قدرت زمانہ ہی کو حاصل ہی کہ وہ معتقداتِ جماعت کو پیدا کرتا ہی، اور اُن کی تربیت کے سامان فراہم کرتا ہی یہی سبب ہے کہ بعض معتقدات وافکار ایک زمانہ میں خوب پھلتے پھولتے ہیں، لیکن زمانہ کا رُخ بدلتے ہی اُنکی بہار پر بھی خزاں آجاتی ہی، اور اسطرح فنا ہوتے ہیں کہ اُنکا پتہ ونشان تک نہیں ملتا،

زمانہ ہی کو یہ خصوصیت حاصل ہی کہ وہ معتقداتِ جماعت کو سطح پہ سطح رکھتا ہی، اور زمانہ مستقبل کے معتقدات وافکار کے لئے راستہ صاف کرتا ہی، جماعت کے معتقدات وافکار کبھی محض بخت و

اتفاق سے نہیں پیدا ہوتے، بلکہ اُن کی ایک ایک شاخ مدت دراز میں پیدا ہوتی اور بڑھتی ہی، اور پھر محض زمانہ ہی کی کرشمہ سازی کی بدولت یہ شاخیں ایکدم پھوٹ نکلتی ہیں، معتقداتِ جماعت ماضی کے پیدا کردہ ہوتے ہیں، اور مستقبل کی آرزوئیں بھی زمانہ ہی کیساتھ وابستہ ہوتی ہیں،

غرض اس پوری تقریر کا ماحصل یہ ہی کہ ہمارے اوپر حقیقی سیادت وملکیت صرف زمانہ کو حاصل ہے، اور ہمارا فرض یہ ہے کہ زمانہ کو اپنے حال پر چھوڑ دیں، وہ خود ہر چیز میں تغیر کریگا، پس گو موجودہ زمانہ میں ان جماعتوں کے تسلط وغلبہ کی بدولت جو ہمکو روزانہ دھمکاتی ہیں، ہماری اجتماعی حالت سخت خطرہ میں پڑ گئی ہی، مگر ہمیں مستقبل کو اپنے حال پر چھوڑ دینا چاہئے، زمانہ خود ہمارے اور ان جماعتوں کے درمیان توازن پیدا کریگا، موسیو لیوسی نے کیا خوب کہا ہی:

" دنیا میں کبھی کوئی نظامِ حکومت ایک دن میں رواج نہیں پاتا، بلکہ اس کے رواج پانے کیلئے ایک مدت درکار ہوتی ہی، فیوڈل سسٹم کو گذشتہ زمانہ میں رواج پانے کیلئے کتنے منازل طے کرنا پڑے؟ اور شخصی نظامِ حکومت کے رواج دینے میں کتنی شورشوں کا مقابلہ کرنا پڑا، پس کوئی نظامِ حکومت اسوقت تک رواج نہیں پاسکتا، تاوقتیکہ وہ ایک حصہ تک مختلف منازل نہ طے کرتا رہے"

(۴)

نظامِ حکومت اور نظامِ معاشرت کا اثر

ایک زمانہ تھا جب لوگوں کے ذہنوں میں یہ خیال قائم تھا — اور اب بھی قائم ہی — کہ جو نقائص اور خرابیاں ہیئتِ اجتماعی میں پیدا ہوتی ہیں، نظامِ حکومت اور نظامِ معاشرت سے انکی اصلاح ہوسکتی ہی، نیز قوموں کی ترقی وتنزل میں انکے نظامِ حکومت اور نظامِ معاشرت کو بڑا دخل ہوتا ہی، اور نظامِ حکومت اور نظامِ معاشرت قوموں کی حالت پر بہت بڑا اثر کرتے ہیں، یہ ایک عام خیال تھا، جو انقلابِ فرانس کے زمانہ میں عام طور پر رائج تھا، اور اب بھی وہ لوگ اس خیال کی تائید

کرتے ہیں، جنھوں نے اجتماعی اور معاشرتی مسائل میں بہت کم غور و خوض کیا ہی،

یہ خیال جو لوگوں کے دماغوں میں بس گیا ہی، گو تجربہ ہی سے اسکی غلطی کا انکشاف ہوگا، مگر باوجود اسکے فلاسفہ اور مورخین نے بھی نہایت آسانی سے ثابت کر دیا ہی کہ قوموں کے عادات و اخلاق اور قوموں کی ترقی و تنزل میں انکے نظامِ حکومت و نظامِ معاشرت کو دخل نہیں ہوتا، بلکہ برعکس اسکے خود نظامِ حکومت اور نظامِ معاشرت قوموں کے اخلاق و عادات سے پیدا ہوتے ہیں، قوموں کے اخلاق و عادات میں نظامِ حکومت اور نظامِ معاشرت کے تغیر سے کوئی تغیر نہیں ہوتا، بلکہ خود قوموں کے عادات و اخلاق انکے نظامِ حکومت اور نظامِ معاشرت کے تغیرات کے باعث ہوتے ہیں، قومیں جسطرح اپنے ہوے سر کے رنگ کا اپنی مرضی سے انتخاب نہیں کرسکتیں، اسیطرح قوموں کو یہ قدرت بھی حاصل نہیں کہ وہ اپنی مرضی سے اپنے لئے کسی نظامِ حکومت اور نظامِ معاشرت کو منتخب کر سکیں، نظامِ حکومت اور نظامِ معاشرت تو قوموں کے اُس مزاجِ عقلی کا ثمرہ ہوتے ہیں، جس پر قوموں کے عناصرِ تمدن کی بنا ہوتی ہی، پس قوموں کی قسمت کا فیصلہ انکے نظامِ حکومت اور نظامِ معاشرت کے ہاتھوں میں نہیں ہوتا، بلکہ برعکس اسکے نظامِ حکومت اور نظامِ معاشرت کو خود قومیں ترتیب دیتی ہیں، اور خود مٹا دیتی ہیں، قومیں اپنی خواہش اور مرضی کی محکوم نہیں ہوتیں، بلکہ اپنے اخلاق و عادات اور اپنی فطرت کی محکوم ہوتی ہیں، اور جس طرح کسی نظامِ حکومت اور نظامِ معاشرت کے رواج دینے کیلئے مدتِ دراز کی احتیاج ہوتی ہی اسیطرح کسی نظامِ حکومت میں تغیر یا اصلاح کرنیکے لئے بھی ایک زمانہ درکار ہوتا ہی، غرض نظامِ حکومت اور نظامِ معاشرت کی خود اپنے اندر کوئی قدر و قیمت نہیں، وہ اپنی ذات سے نہ موزوں اور مناسب ہوتے ہیں اور نہ ناموزوں اور نامناسب، بلکہ کبھی ایسا ہوتا ہی کہ جو نظامِ حکومت کسی وقت کسی ایک قوم کیلئے موزوں ثابت ہوتا ہی، وہی نظامِ حکومت دوسری قوم کے لئے بالکل ناموزوں ہوتا ہی، اور چونکہ نظامِ حکومت اور نظامِ معاشرت کو خود قومیں

اپنے لئے ترتیب نہیں دیتیں، اسلئے وہ خود انمیں کوئی تغیر بھی نہیں کر سکتی ہیں، اقوام کے مقدور میں اگر کچھ ہی، تو بس یہ ہی کہ وہ نظامِ حکومت اور نظامِ معاشرت میں اگر چاہیں تو سطحی تغیر کر دیں لیکن اس سے اصلیت میں کوئی فرق نہیں آسکتا، اس تغیر کا اثر صرف یہ ہوگا کہ اس نظامِ حکومت کیلئے زبان نے جو لفظ مقرر کر دیا تھا، وہ متروک ہو جائیگا، اور اب اس کے بجائے کوئی دوسرا نام رائج ہو جائیگا، مگر اصلیت اب بھی وہی رہیگی، جو پہلے تھی، دنیا بھر میں انگریزی قوم سے زیادہ کوئی قوم ریپبلکن جمہوریت نہیں ہی لیکن دیکھو، انگلستان میں جو نظامِ حکومت رائج ہی، وہ شخصی نظامِ حکومت ہے، پھر دنیا میں سب سے زیادہ استبداد پسند امریکہ کی اسپینی نسل کی قومیں ہیں، لیکن باوجود اسکے جمہوری نظامِ حکومت کے ماتحت ہیں،

حاصل یہ کہ قومیں اپنے نظامِ حکومت اور نظامِ معاشرت کی محکوم نہیں ہوتیں، بلکہ اپنے موروثی نظامِ اخلاق کی محکوم ہوتی ہیں، پس یہ خیال کہ اگر قوموں کے نظامِ معاشرت یا نظامِ حکومت میں تغیر کر دیا جائے تو قوموں کی حالت میں انقلابِ عظیم ہو جائیگا، حقیقت سے بہت دور ہی، اور جو لوگ اس کوشش میں اپنی جان کھپاتے ہیں، وہ یاد رکھیں کہ ان کو اپنے مقصد میں کبھی کامیابی نہیں ہو سکتی، نظامِ حکومت میں تغیر کرنے کیلئے دھواں دھار خطبے دینے اور شورش برپا کرنے کی ضرورت نہیں ہی، جب تغیر کی ضرورت ہوگی، تو زمانہ خود ہی ان میں تغیر کریگا، قوموں کی ضرورتیں جب پیدا ہوتی ہیں، تو انہ خود ان ضرورتوں کے مطابق انکے نظامِ حکومت میں تغیر ہو ہی جاتا ہی، ضرورت کے مطابق نظامِ حکومت اور نظامِ معاشرت میں تغیر کرنے کا یہی حکیمانہ اصول ہی، جو لاطینی قوموں کے خلاف انگریزوں نے ہمیشہ مرعی رکھا ہی، انگریزوں کے ملک میں کوئی جدید قانون اسوقت تک نافذ نہیں ہوتا تاوقتیکہ اس کے نافذ کرنے کی ضرورت پیش نہیں آتی، مکالے نے (جو انگریزوں میں بہت بڑا مصنف گذرا ہی) اپنی ایک تحریر میں انگریزوں کے اس

حکیمانہ اصول کی تشریح کی ہے، پہلے اُس نے ان اثرات و نتائج کا تذکرہ کیا ہے جو انگریزی قوانین سے پیدا ہوتے ہیں، پھر انگریزی قوانین کا ان قوانین سے مقابلہ کیا ہے، جو امریکہ اور یورپ کے ممالک میں لاطینی قوموں نے مختلف اوقات میں وضع کئے ہیں، پھر اس بات کی وضاحت کی ہے کہ لاطینی قوموں کے برعکس انگریزی قوم کبھی بلا ضرورت اپنے قوانین میں اضافہ یا تغیر نہیں کرتی پھر آخر میں لکھتا ہے:

"انگلستان میں جتنے قوانین عہد جان سے لیکر عہد وکٹوریہ تک مختلف پارلیمنٹوں میں پاس ہوئے، انکی خصوصیت یہ نہ تھی کہ ان میں حسن ترتیب کا خیال رکھا جاتا تھا، بلکہ ان قوانین میں جس بات کا زیادہ اہتمام کیا گیا، وہ یہ ہے کہ کوئی جدید قانون اسوقت تک کبھی نافذ نہیں ہوا، تاوقتیکہ اسکے نافذ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں پیش آئی، اور ضرورت پیش آنے کے بعد بھی جب نافذ کیا گیا تو اس وقت بھی ضرورت سے زیادہ کسی قانون کو وسعت نہیں دیگئی"

لیکن چونکہ یہ ثابت کرنے کے لئے کہ قوموں کے نظام حکومت و نظام معاشرت ان کے مزاجِ عقلی کا ثمرہ ہوتے ہیں، یہ ضروری ہے کہ ہم ایک ایک نظام حکومت کو الگ الگ لیکر اس مسئلہ کی وضاحت کریں، اور یہ موجب طوالت ہوگا، خصوصاً اس حالت میں کہ ہم اپنی دوسری کتاب انقلاب الامم میں اس مسئلہ پر نہایت تفصیل کیساتھ بحث کر چکے ہیں، اسلئے ہم یہاں صرف ایک مثال سے اس مسئلہ کی وضاحت کر کے اس بحث کو تمام کئے دیتے ہیں،

یہ ایک فلسفیانہ بحث ہے کہ مرکزیت اور لامرکزیت میں سے کون طریقۂ حکومت بہتر اور مفید ہے، فرض کرو کہ ایک قوم ہے جو مختلف فرقوں اور قوموں سے ملکر بنی ہے، اور مدتوں یکجا رہتے رہتے وہ مرکزی حکومت کے زیر فرمان ہوگئی ہے، اب فرض کرو کہ اس مرکزیت کے خلاف قوم میں نہایت سخت جوش پھیلا اور سخت شورش برپا ہوئی جس نے اس مرکزیت کو اور زیادہ مستحکم کر دیا، تو اب اسوقت ہمارے لئے بجز اسکے کیا چارہ ہوگا، کہ اس مرکزی حکومت کو تسلیم کرلیں،

کیونکہ اب تو گویا مرکزی حکومت ہماری طبیعت ثانیہ ہو گئی، اور بالآخر اب ان لوگوں کی غلطی صاف کھل جائیگی جو اس نظامِ مرکزیت کے دشمن تھے، اور اسکو مٹا دینا چاہتے تھے، اور اگر آیندہ وہ کبھی اپنے مقصد میں کامیاب بھی ہو گئے تو اس کا نتیجہ یقیناً یہ ہوگا، کہ ایک سخت خانہ جنگی برپا ہوگی جو پھر اس مرکزیت کو اور مستحکم کر دے گی

غرض تقریر بالا کا ماحصل یہ ہے کہ نظامِ حکومت و نظامِ معاشرت کو قوموں کے عروج و انحطاط اور ترقی و تنزل میں کسی طرح کا دخل نہیں ہوتا، اور نظامِ حکومت میں فوری تغیر کرنیکا نتیجہ بجز اسکے کچھ نہیں ہوتا، کہ قوم میں فوضویت اور انتشار کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے، جو بسا اوقات انحطاط کا موجب ہوتی ہے، ہمارے دعویٰ کی ایک بڑی مثال یہ ہے کہ ولایت متحدہ امریکہ اور امریکہ کی اسپینی جمہوریتیں گو جمہوری نظامِ حکومت کی پابند ہیں، لیکن جو خوشحالی اور فارغ البالی ولایات متحدہ امریکہ میں پائی جاتی ہے، وہ اسپینی جمہوریتوں میں بالکل ناپید ہے، اور یہ اس بات کی دلیل ہے، کہ قوموں کی ترقی و تنزل اور عروج و انحطاط میں قوموں کے نظامِ حکومت و نظامِ معاشرت کو کوئی دخل نہیں ہوتا، بلکہ قومیں اپنے نظامِ اخلاق کی پابند ہوتی ہیں، اور جو نظامِ حکومت قوم کے موروثی نظامِ اخلاق کے مطابق نہیں ہوتا، وہ اس قوم کے لئے صرف ملمع کا کام دیسکتا ہے، بس اگرچہ اکثر ممالک میں ہمیشہ بہت سے لوگ اس خواہش اور کوشش میں رہتے ہیں، کہ اپنے ملک کے نظامِ حکومت اور نظامِ معاشرت کو دوسری قوموں کی تقلید میں بدل دیں، لیکن اس کوشش کا نتیجہ بجز خانہ جنگیوں کے اور کچھ نہیں ہوتا، اور اسی قسم کی خانہ جنگیوں کو دیکھ کر بعض لوگ یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ قوموں کے نظامِ حکومت میں آسانی سے تغیر کیا جا سکتا ہے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ قومیں اپنے نظامِ حکومت کی تابع نہیں ہوتیں، بلکہ ان پر غلبہ صرف ان اوہام و الفاظ کا ہوتا ہے جو ان کے آباواجداد سے ان کو ورثہ میں ملتے ہیں، خاص کر ان خیالی الفاظ کا جو گو مبہم ہوتے ہیں

مگر قوموں کے قلوب پر اصل میں انہی کی حکومت ہوتی ہی،

(۵)

تربیت وتعلیم کا اثر

ہر زمانہ میں چند مخصوص خیالات ہوتے ہیں، جن کا عقلوں پر غلبہ ہوتا ہی، ہمنے بیانات بالا میں واضح کیا ہی کہ اس قسم کے خیالات دماغ پر کس قدر قوی اثر کرتے ہیں، زمانۂ حال میں جس خیال کا دور دورہ ہی، وہ یہ ہی کہ لوگوں میں تعلیم کے ذریعہ سے ایک بیّن اور محسوس فرق پیدا کیا جا سکتا ہی، اور تعلیم کے ذریعہ سے لوگوں میں مساوات پیدا کیجا سکتی ہی، یہ خیالات بار بار دہرائے گئے، یہانتک کہ ڈیماکریٹک پارٹی کے نزدیک یہ خیالات بالکل ثابت اور محقق ہوگئے اور اب ان کے رد کی کوشش کرنا اسی قدر مشکل ہو گیا، جس قدر اگلے زمانہ میں چرچ کی نوشت کا توڑنا مشکل تھا،

لیکن علمبرداران مساوات نے تعلیم و تربیت کے بارے میں جو خیالات قائم کئے ہیں، علم النفس نے دیگر مسائل کی طرح ان کی بھی تردید کر دی ہی اور اسپنسر نے نہایت خوبی سے ثابت کر دیا ہی کہ تعلیم نہ انسان کو مہذب بنا سکتی ہی، اور نہ اسکی ان خواہشوں کو روک سکتی ہی جو آبا و اجداد سے اسکو ورثہ میں ملی ہیں، نیز یہ کہ اگر طرز تعلیم خراب ہو تو تعلیم بجاے مفید ہونیکے اور مضر پڑتی ہی، ماہرینِ شمار و اعداد نے بھی ان کلیات کی تائید کی ہی اور بتایا ہی کہ آجکل جرائم جو بکثرت سرزد ہوتے ہیں، اسکا زیادہ تر باعث اشاعتِ تعلیم ہی، اور ہیئتِ اجتماعی کے جو بدترین دشمن ہیں یعنی فوضوئین (انارکسٹ) وہ عموماً ایسے لوگوں کو اپنے گروہ میں داخل کرنے کی کوشش کرتے ہیں، جو کالجوں سے بڑی بڑی ڈگریاں حاصل کر کے نکلے ہوں، موسیو ایڈولف گولاٹ نے جو ایک فاضل جج ہیں، اعداد و شمار سے بتایا ہی کہ آجکل چار ہزار مجرموں میں سے تین ہزار مجرم گروہ طلبہ کے اور ایکہزار ان پڑھ

طبقہ کے ہوتے ہیں، اور پچاس برس کے عرصہ میں مجرموں کی تعداد ۲۲۷ سے ۵۵۲ تک پہنچ گئی ہی،
موسیو مذکور اور انکے دیگر ہمعصروں نے یہ بتایا ہی کہ ارتکابِ جرائم ان نوجوانوں سے زیادہ ہوتا ہی
جو مدارس میں جبریہ اور مفت تعلیم پاتے ہیں،

بلا شبہہ طرزِ تعلیم اگر بہتر ہو تو تعلیم سے عمدہ نتائج حاصل ہوتے ہیں، اور اسوقت یہ تعلیم
تہذیب کو ترقی دیتی ہی، اخلاقِ فاضلہ کی ترقی میں ممد ہوتی ہی اور فنی قابلیتوں کو بڑھاتی ہی، لیکن
بدقسمتی یہ ہے کہ لاطینی قوموں میں تعلیم کی بنا نامناسب اور غلط اصول پر قائم کی گئی ہی خصوصًا
پچیس سال کے عرصہ سے تو تعلیم میں اسقدر ابتری پیدا ہو گئی ہی، کہ گو موسیو بریال، موسیو واسٹل
ڈی کولنگ اور موسیو ٹائن ایسے یگانۂ روزگار علمائنے اصلاح کی کوشش کی، لیکن ابتک یہ قومیں اپنی
اسی قدیم حالت کو نباہ رہی ہیں، میں نے بھی اپنی ایک تصنیف میں اس بات کو ثابت کیا ہی، کہ ہمارے
طرزِ تعلیم کا ایک خراب نتیجہ یہ ہے کہ اس کے ذریعہ سے ہیئتِ اجتماعی کے دشمن پیدا کیئے جارہے
ہیں، اور مذہبِ اشتراکیت کی جڑ مضبوط کیجارہی ہی،

یہ نتائجِ بد جو لاطینی تربیت سے پیدا ہوتے ہیں، اسکی اصلی وجہ یہ ہے کہ ہماری تربیت کی
بنا ایسے اصول پر قائم کی گئی ہی جسکی غلطی علم النفس سے ظاہر ہو چکی ہی، ایک بڑی اصل جس پر ہماری
تربیت کی بنیاد رکھی گئی ہی، یہ ہی کہ قوتِ حافظہ عقل کو ترقی دیتی ہی، اس سے ہماری تعلیم میں اس
بات کا زیادہ خیال کیا جاتا ہی کہ حتی الامکان قوتِ حافظہ کو ترقی دینا چاہیئے، اور اس اصول پر
اس مضبوطی سے عمل کیا جاتا ہی، کہ پرائمری اسکولوں، کالجوں، بلکہ ٹریننگ کالجوں میں بھی قوتِ حافظہ
ہی پر زیادہ زور دیا جاتا ہے، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہی کہ طالبِ علم از خود کسی عمل پر اقدام نہیں کر سکتے،
کیونکہ تعلیم کا مدعا تو ان کی نگاہ میں اب صرف یہ رہ گیا ہی کہ وہ واقعات کو حفظ کر لیں اور دوسروں
کی آرار کے آگے سر جھکا دیں، موسیو جولیس سیمان نے جو کسی زمانہ میں وزیرِ تعلیم رہ چکے ہیں، ایکبار کیا خوب

کہا تھا کہ

"صمیم قلب کیساتھ اسباق کے حفظ کر لینے یا صرف و نحو کی کسی کتاب کے رٹ لینے سے زیادہ بد تر کوئی تربیت نہیں ہو سکتی کیونکہ اس صورت میں طالب علم کا تمامتر مقصد یہ ہوجاتا ہے کہ وہ استاد کو تمام غلطیوں سے محفوظ مانے"

اگر اس تربیت کا ضرر اتنا ہی ہوتا کہ وہ کچھ مفید نہیں ہے، تو خیر ہم ان بچوں کیساتھ ہمدردی کر کے بیٹھ رہتے جنھیں مدارس میں کلوٹر کا نسب حفظ کرایا جاتا ہے لیکن غضب تو یہ ہے کہ طالب علم جس حالت میں زندگی بسر کر رہا ہو، اس تربیت سے اسکے دل میں یہ خواہش پیدا ہوتی ہے، کہ کاش مجھکو اس بلا سے نجات مل جاتی، یہانتک کہ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آج کارخانہ دار کا دل اپنے کاروبار سے اوچاٹ ہوا اور کل ایک کاشتکار بھی اپنے پیشہ سے اُلجھنے لگا، اور یونہی طبقۂ متوسط کے افراد اپنے اپنے کاموں کو چھوڑ چھوڑ کر حکومت کی جبہ سائی کرنے لگتے ہیں، اور چونکہ اسکول سے ایسے طلبہ پڑھکر نہیں نکلتے جو زندگی کے دشوار گذار مراحل کو طے کر سکیں، اسلئے قوم میں ایسے افراد کی کثرت ہو جاتی ہے، جو ہیئت اجتماعی پر بار ہونے کے علاوہ خود بھی روز اپنے دانت کٹکٹاتے اور شورہ پشتی پر ہر دم آمادہ رہتے ہیں، اس سے آگے بڑھو تو طبقۂ متوسط کی حالت اور افسوسناک نظر آتی ہے، باوجودیکہ اسے حکومت کی طاقت اور قوت پر بڑا گھمنڈ ہوتا ہے لیکن حکومت سے جو غلطیاں سرزد ہوتی ہیں ان پر جرح و قدح بھی اسی طبقہ کے افراد کرتے ہیں، اور باوجود اس کے وہ از خود کسی کام کو انجام دینے کی صلاحیت سے عاری ہوتے ہیں،

لیکن حکومت ان سند یافتہ لوگوں کو جو تیار کرتی ہے، ان میں سے کام کے لوگوں کو چھانٹ لیتی ہے اور باقی افراد کو چھوڑ دیتی ہے، اب یہ سند یافتہ جماعت اپنے روزگار کی تلاش میں گورنمنٹ کے تمام عہدوں پر معمولی کلرک کے عہدے سے لیکر ماسٹری اور پروفیسری تک ایکدم ٹوٹ پڑتی ہے، اور حالت یہ ہو جاتی ہے کہ ایک تاجر نو آبادیوں میں اپنا کاروبار چلانے کیلئے ایک منیجر ڈھونڈھتا

پھرتا ہے اور نہیں ملتا، حالانکہ ہزاروں آدمی گورنمنٹ کے ادنیٰ سے ادنیٰ عہدہ کے حاصل کرنیکی فکر میں لگے رہتے ہیں، پھر جب ان بیکار لوگوں کی تعداد بیشمار ہو جاتی ہے، تو بداہۃً اس کا یہ نتیجہ ہوتا ہے، کہ گورنمنٹ کے خلاف غضب وغصہ کا جوش پیدا ہو جاتا ہے، اور یہ بیکار لوگ فوراً کسی خاص آدمی کی قیادت میں ارتکاب جرائم اور شورہ پشتی پر آمادہ ہو جاتے اور امن عامہ میں خلل انداز ہوتے ہیں[ا]،

لیکن سچی بات یہ ہے کہ ہنگامہ اور فتنہ کا وقت گذر چکا، اور اب صرف تجارب سے جو اقوام کے بہت بڑے مربی ہیں، ہمارے اعمال کی اصلاح ہو سکتی ہے، اور اسی ذریعہ سے ہمیں یہ خیال پیدا ہو سکتا ہے، کہ ان ردی کتابوں کا پڑھنا پڑھانا اور یہ سخت ترین امتحانات بالکل بیکار ہیں، بلکہ ہمیں اب اس عملی تعلیم میں مشغول ہونا چاہئے، جو نئی نسل کو کاروباری دنیا اور استعماری تجاویز سے روشناس کرے، اور نسل کو ایسے کاموں میں پھنسا دے جنسے وہ بھاگتی ہے،

درحقیقت یہی فنی تعلیم جس کی آج روشن عقلیں بیتابی کیساتھ خواستگار ہیں، ہمارے محترم اسلاف کا طرز تعلیم تھا، اور اسی طرز کو ہمیشہ ان قوموں نے بھی اختیار کیا ہے، جو اپنی مضبوط قوت ارادی اور اقدام ذاتی کے بل پر دنیا پر قابض ہوئیں،

اگر ان بیکار علوم اور بیکار کتابوں کے پڑھ جانے سے ہمارے قوائے عقلی میں کچھ ترقی ہوتی تو بیشک ہم اس تربیت کے مصائب کے جھیلنے کے لئے تیار ہو جاتے، لیکن کیا یہ کتابیں اور یہ علوم ہماری زندگی میں ہمارے کچھ کام آتے ہیں؟ فہم وادراک، تجارب، اقدام وارادہ زندگی کے

[ا] یہ مصیبت صرف لاطینی قوموں کے ساتھ مخصوص نہیں، بلکہ یہی حالت چین اور ہندوستان میں بھی ہے، جب سے انگریزوں نے ہندوستان میں دلیسیوں کی تربیت کی غرض سے نہیں، بلکہ صرف انکی تعلیم کے لئے اسکول جاری کئے ہیں، اس وقت سے وہاں ایک گروہ بابوؤں کا پیدا ہو گیا ہے، جسے اگر ملازمت نہیں ملتی تو حکومت کا سخت ترین دشمن بنجاتا ہے، اس بحث پر میں نے اپنی کتاب "تمدن ہند" میں تفصیل سے بحث کی ہے، اس حالت کا اُن لوگوں نے بھی اندازہ کیا ہوگا جو اقلیم ہند کی وسیع سرزمین کی سیاحت کر چکے ہیں، (مولف)

کارگر اسلحہ ہیں لیکن سخت افسوس اور رنج سے کہنا پڑتا ہے کہ کیا کتابوں سے ہمیں انکے متعلق کوئی سبق حاصل ہوتا ہے؟ اور کیا یہ کتابیں ہم میں یہ اوصاف پیدا کر سکتی ہیں؟ یہ کتابیں گویا قواعد اور مرقعہ ہیں، کہ انسان ان کے مطالعہ سے فائدہ حاصل کر سکتا ہے لیکن کیا ان بڑے بڑے مضامین کا دماغ میں محفوظ کر لینا کچھ مفید ہے؟ بخلاف اس کے فنی تعلیم سے جو بیش بہا فوائد حاصل ہوتے ہیں، وہ تربیت مجربہ سے حاصل نہیں ہو سکتے،

ایک بہت بڑے روشنخیال مفکر موسیو ٹائن نے اس موضوع پر بہت کچھ لکھا ہے، جس کے بعض حصوں کو میں ناظرین کی ضیافتِ طبع کے لئے پیش کرتا ہوں، اُنھوں نے دلائل و براہین سے ثابت کر دیا ہے، کہ ہماری گذشتہ زمانہ کی تربیت اس تربیت کے بالکل مماثل تھی جو زمانۂ حال میں انگریزوں اور باشندگانِ امریکہ میں رائج ہے، پھر اُنھوں نے نہایت خوش اسلوبی کیساتھ لاطینی اور انگریزی طرزِ تعلیم کا مقابلہ کیا ہے، اور دونوں کے نتائج دکھائے ہیں،

موسیو ٹائن لکھتے ہیں:-

"افکار و خیالات تو عادۃً پیدا ہوتے رہتے ہیں، لیکن جن باتوں سے ان خیالات کا نشو و نما ہوتا ہے، وہ مختلف قسم کے موثرات ہوتے ہیں، جن سے ایک نوجوان کو کبھی تو کارخانوں اور کانوں میں سابقہ پڑتا ہے، کبھی بیرسٹر کے پرائیویٹ آفس اور شفاخانوں میں کبھی وہ مختلف ادوات و آلات کے مشاہدے سے متاثر ہوتا ہے، اور کبھی اجرت پیشہ لوگوں کے مجمع سے، بلکہ اکثر اپنی ذاتی کارگذاریوں سے، یہ چند معمولی موثرات ہیں، جنھیں آنکھیں دیکھتی، اور کان سنتے ہیں، اور جب نوجوان کے ذہن میں ان موثرات کا اجتماع ہوتا ہے، تو خواہ مخواہ اسے حسنِ اختراع کی جانب مائل کر دیتے ہیں، لیکن افسوس ایک فرنچ نوجوان اس ترکیبِ نفسی سے بالکل محروم ہے، اس کے

ذہن میں کبھی ان موثرات کا گذر تک نہیں ہوتا جن سے استفادہ کرنے کی اسے سخت حاجت ہے، کیونکہ ایک طویل مدت تک تو وہ اسکول کی چار دیواری کے اندر ان شخصی تجارب سے بیخبر بند پڑا رہا جن کے ذریعہ سے اشیار کی کوئی صحیح صورت اس کے ذہن میں آتی، اور جو زندگی کے کاروباری رُخ میں اس کو مدد دے سکتے۔ اب مدرسہ سے تعلیم حاصل کر چکنے کے بعد جو وہ نکلا، تو وہ اپنی عمر کا بیش بہا وقت ضائع کر چکا تھا، امتحان کی تیاری میں جس قدر وقت اُس نے صرف کیا تھا، وہ گویا افسوسناک ماضی اور منحوس مستقبل کے مابین حدِ فاصل رہا، لیکن جب نتیجہ شائع ہوا، تو اُس نے دیکھا کہ کامیاب طلبہ کی تعداد تو صرف نصف یا ایک ثلث ہی، اس کے لئے یہ کس قدر گراں مصیبت کا سامنا تھا، کہ وہ دن بھر ایک کرسی پر اپنے سامنے چھوٹی سی میز لے کر بیٹھا خاموشی کیسا تھ درس کو سن رہا ہی، سچی بات یہ ہے، کہ اس طرح کی جانفشانی دو ماہ سے زیادہ اس سے نہیں ہو سکتی تھی، اور اب امتحان کا وقت جو آیا، تو وہ اپنے میں محنت کرنے کی بھی قدرت نہیں پاتا، کیونکہ بیشمار علوم اس کے خزانۂ ذہن میں محفوظ کر دیئے گئے ہیں، قوتِ تعقل مفقود ہو چکی، قوائے ذہنیہ جواب دے چکے، اب نوجوان یہ سب مراحل طے کرنے کے بعد مستقل زندگی بسر کرنا چاہتا ہی، اور کاروبار کی کسی خاص لائن میں قدم رکھتا ہی، لیکن اسے کس قدر افسوس ہوگا، جب اسے یہ معلوم ہوگا کہ میری تو اوقات ضائع ہوئیں، اور میں نے تعلیم پر جتنا خرچ کیا تھا، اتنی آمدنی نہیں ہوئی! یہ زبون حالت فرانس کی ہی، لیکن انگلستان اور امریکہ میں حالت اسکے برعکس ہی"۔

اس کے بعد اس جلیل القدر مورخ نے ہمارے اور انگریزی طرزِ تعلیم کے مابین جو فرق ہیں، ان کو دکھایا ہے، اور یہ بات ثابت کی ہی، کہ جتنے مخصوص اسکول ہمارے ملک

میں ہیں، اپنے انگریزوں کے ملک میں نہیں ہیں، نیز یہ کہ انکے ملک میں کتابوں کے ذریعہ سے تعلیم نہیں دیجاتی ہی، بلکہ انجینیر (مثلاً) کارخانہ میں پیدا کیا جاتا ہی، اور ہر شخص کو اسکا موقع ملتا ہی کہ اس کی قوتِ عقلی جہانتک متحمل ہو اپنے پیشہ کو حاصل کرتا رہے اور اگر اسکے قوائے ذہنیہ اعانت کریں تو وہ کاریگر یان کا افسر ہو جائے، یہ نہایت اعلیٰ درجہ کا جمہوری طرز ہی، اور اس طرزِ تعلیم سے قوم کو حقیقی فائدہ حاصل ہوتا ہی، برخلاف اسکے ہمارا طرز تعلیم ایسا ہی کہ اسمیں نوجوان کی آیندہ قسمت ایک نتیجۂ امتحان پر مبنی ہوتی ہے، جو عموماً اسے اپنی عمر کے انیسویں یا بیسویں سال دینا پڑتا ہی، مو سیو ٹائن لکھتے ہیں :۔

"انگلستان میں کسی طالب علم کو شفاخانہ یا کسی بیرسٹر کے آفس میں داخل ہو کر تھوڑی مدت مشق اور تعلیم میں گذارنی پڑتی ہی، پہلے اُسے کچھ مختصر سے درس دیئے جاتے ہیں جن سے اسکی معلوماتِ عامہ میں اضافہ ہوتا ہی، علاوہ اسکے وقتاً فوقتاً کچھ اور بھی درس دئے جاتے ہیں جن پر اُسے فرصت کے وقت میں سوچنے کا موقع ملتا ہی، اسطرح وہ تھوڑی سی مدت میں اپنے تجارب کو ایک منتظم صورت میں مرتب کر لیتا ہی، دیکھو ایک یہ نظامِ تعلیم ہی کہ طالبِ علم کے قوائے عقلی کیساتھ ساتھ اسکی قوتِ عملی بھی جلا پاجاتی ہی، آیندہ کی ترقی کا بھی راستہ صاف ہو جاتا ہی اور بہت جلد طالب علم میں اختراع وایجاد کی قوت پیدا ہو جاتی ہی، یہانتک کہ پچیس برس کے سن میں اسکی قوتِ عقلی اسقدر نمو پاجاتی ہی، کہ وہ از خود اقدام کرنے لگتا ہی، اور ہر بات کا مقابلہ کرتا ہے گویا کہ وہ ایک مشین کا پہیہ ہے جو خود ہی محرک اور خود ہی متحرک ہو،

لیکن فرانس کی حالت اس سے بالکل جداگانہ ہی، وہاں تعلیم کا ایک دوسرا ہی طرز ہی جو قریب قریب چینیوں کے طرزِ تعلیم سے مشابہ ہی، اور جس سے بجز قوائے عقلی و ذہنی کی تضیع کے اور کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوتا۔"

پھر مذکورہ بالا بیان سے اس فلاسفر نے حسب ذیل نتیجہ اخذ کیا ہی، وہ لکھتا ہی:-

"قوتِ حافظہ پر تعلیم کے ادوارِ ثلثہ طفولیت، بچپن، شباب میں زور دیا جاتا رہا، اور پیمانہ طاقت لبریز ہو گیا لیکن دیکھو طالب علم اب تک کرسی پر بیٹھا ہی، امتحان کے انتظار میں اسکی آنکھیں کتاب پر گڑی ہوئی ہیں، اور وہ نہایت بے صبری کیساتھ اس دن کا منتظر ہی، جب اسے ڈگری ملیگی، جب وہ سند پائیگا، اسکے سوا اُسے کسی چیز کا شوق نہیں، کیا غضب ہے کہ اس بدتر نظامِ تعلیم کی ترویج کیلئے کیسے کیسے وسائل ایجاد کئے گئے ہیں اور کس کس طرح طالب علم اس نظام کا پابند بنایا جاتا ہی، عملی دنیا سے طالب علم کو نکالکر اسکولوں اور مدارس کے حجروں کے اندر بند کر دیا گیا ہی، جہاں اسے ایک مصنوعی جسمانی تربیت دیجاتی ہی، ذہن و فکر پر ایکدم بار ڈالدیا جاتا ہی، نہ مستقبل کے جانب نظر ہوتی ہی، اور نہ سن کا کچھ لحاظ کیا جاتا ہی، کسی کاروبار کا خیال تو کجا دنیا کی رزمگاہ سے جہاں آیندہ طالب علم کو مکمل اسلحہ لیکر نکلنا ہی، بالکل بحث نہیں ہوتی اور یہ بات تو بالکل پس پشت ڈالدیجاتی ہی، کہ طالب علم آیندہ خود اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کے قابل ہو جائے، ہمارے مدارس میں رہکر کوئی نوجوان ضروریاتِ زندگی نہیں حاصل کر سکتا، اس میں قوتِ تمیز پیدا ہوتی ہی، نہ قوتِ ارادہ اور نہ اعصاب ہی مضبوط ہوتے ہیں، بلکہ بجاے اس کے کہ آیندہ کے لئے آمادہ ہو، وہ کمزور و ناتوان ہو جاتا ہی، اور اسکی ذات اور اسکے قریبی مستقبل کے مابین کوئی مناسبت نہیں ہونے پاتی، اسی لئے تم دیکھتے ہو کہ جہاں اُس نے پہلے پہل کسی کام میں ہاتھ ڈالا بس وہ مختلف مصائب میں گھر گیا، اور اب اس میں لنگڑے لولے کے مثل کھڑے ہونے کی قدرت نہیں باقی رہی، یہ کس قدر خوفناک تجربہ ہے، جس میں اخلاق مضطرب ہوتے اور توازنِ عقلی مختل ہو جاتا ہے، بس آگے حسرت و یاس ہے، اور ناکامی کی

حائل دیوار ہ"

افسوس..............ناکامی..........حسرت موت[1]"

[1] دیکھو موسیو ٹائن کی کتاب "نظام عال" جلد دوم ص۱۸۹ یہ آخری صفحات ہیں، جو موسیو ٹائن نے تحریر کئے ہیں اور گویا اس مشہور فلاسفر کے تمام تجربات زندگی کا خلاصہ ہیں، لیکن افسوس ہے کہ ہمارے مدارس کے اساتذہ جنھوں نے فرانس کے باہر قدم نہیں نکالا ہے ان حقائق و واقعات تک نہیں پہنچتے، حالانکہ تربیت ایک ایسا ذریعہ ہے جس سے ہم قوم کے قلوب میں تحریک پیدا کر سکتے ہیں، سب سے بڑی بدقسمتی یہ ہے کہ ہم میں ایسے لوگوں کا قحط ہے جو یہ سمجھتے ہوں کہ تربیت کا طریقہ مجریہ قوم میں کس قدر جلد انحطاط پیدا کر دیگا، اور ہماری نسل ترقی کے بجائے تنزل اور انحطاط کی جانب مائل ہو گی، ناظرین کے لئے مفید ہوگا، اگر وہ ٹائن کے تحریرات کو ان مشاہدات اور تجربات کے ساتھ مقابلہ کر کے پڑھیں جو امریکہ میں تربیت کے متعلق عمل میں لائے گئے ہیں اور جنھیں موسیو پال بورگٹ نے اپنی کتاب "بحر زاخر" میں نقل کیا ہے،

ان تمام تحریرات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ہماری تربیت اس درجہ ناقص ہے کہ یا تو مدارس میں فوضوئین (انارکسٹ) پیدا کئے جاتے ہیں، یا ایسے لوگ جنہیں اقدام کی قوت مفقود ہوتی ہے، اور جن کا کوئی خاص ارادہ نہیں ہوتا، بقول موسیو پال بورگٹ کے یہ دونوں صورتیں ایک متمدن انسان کیلئے بدقسمتی کا پیش خیمہ ہیں اسکے بعد موسیو پال بورگٹ نے بدقت نظر ہمارے برباد کنندہ فرانسیسی مدارس اور ان مدارس کا جو طالب علم کو رزمگاہ حیات کے لئے تیار کرتے ہیں، مقابلہ کر کے ثابت کیا ہے کہ صحیح دیمقراطیت اور جمہوریت وہی ہے جو ان زندہ قوموں میں پائی جاتی ہے،

فصل دوم

معتقداتِ جماعت کے عوامل قریبہ

۱۔ ذہنی اشباح، الفاظ اور جملوں کا اثر معتقداتِ جماعت پر،

الفاظ اور جملے ذہنِ جماعت پر جادو نما اثر ڈالتے ہیں، الفاظ کی اس موثرانہ قوت کا تعلق انکے لغوی یا اصطلاحی معنوں سے نہیں ہوتا، بلکہ الفاظ میں یہ قوت ان ذہنی اشباح سے آتی ہی، جو خیال میں پیدا ہوتے ہیں، ان ذہنی اشباح میں حسب اقتضائے زمانہ اختلاف ہوتا رہتا ہی، بعض مستعمل الفاظ کے معانی میں جو تغیر ہوتا ہی، اس کی مختلف مثالیں، یہ بحث کہ جب مسمیات کے قدیم اسمار جماعت میں ناگواری کا احساس پیدا کرنے لگیں تو اس وقت سیاسی فوائد کے لحاظ سے جدید اسمار کا وضع کرنا ضروری ہو جاتا ہے، اختلافِ امزجہ کی بنا پر مختلف قوموں میں الفاظ کے معنی کس طرح متغیر ہو جاتے ہیں، یہ بحث کہ یورپ اور امریکہ میں "ڈیمقراطی" کے معنی کیوں مختلف ہیں،

۲۔ اوہام کا اثر معتقداتِ جماعت پر،

اوہام کی اہمیت کا بیان، یہ بحث کہ اوہام پر تمدن کی بنا ہوتی ہی، یہ بحث کہ اجتماعی نقطۂ نظر سے اوہام کی کیا ضرورت اور اہمیت ہی، جماعت ہمیشہ وہم کو واقعہ پر کیوں ترجیح دیتی ہی،

۳۔ تجارب کا اثر معتقداتِ جماعت پر،

تجارب قوموں کے ذہن میں واقعات کی اہمیت اور اوہام کی مضرت کا احساس پیدا کرتے ہیں، تجارب سے

قویں اس وقت اثر پذیر ہوتی ہیں، جب انکی بار بار تکرار ہو،

۴۔ عقل کا اثر معتقداتِ جماعت پر: عقلی استدلال کا اثر جماعت پر بالکل نہیں ہوتا، جماعت بجز اپنے احساساتِ غیر شاعرہ کے اور کسی چیز سے اثر پذیر نہیں ہوتی، یہ بحث کہ تاریخی واقعات میں منطق کی کیا حیثیت اور کیا درجہ ہے واقعات تاریخی کے باعث مافوق العقل مخفی اسباب ہوتے ہیں"

اس باب کی فصلِ اول میں ہم نے اُن عواملِ بعیدہ کے اثرات کو بیان کیا تھا، جو جماعت میں یہ صلاحیت پیدا کر دیتے ہیں کہ جماعت چند خیالات کو تسلیم کرلے، اور انکے ماتحت عمل کیلئے مستعد ہو جائے، اب اس فصل میں ہم اُن عواملِ قریبہ کے اثرات کو بیان کرینگے، جو جماعت میں بعد کو اثر کرتے ہیں، اور جن کا اثر یہ ہوتا ہے، کہ جماعت سے بعض افعال کا صدور ہونے لگتا ہے، اسکے بعد آیندہ فصل میں ہم یہ بیان کرینگے کہ وہ عواملِ قریبہ جو جماعت سے صدور افعال کے باعث ہوتے ہیں، ان کے اثر کو مفید اور کارگر بنانے کے کیا کیا طریقے ہیں اور کس قسم کے لوگ ان کا استعمال کر سکتے ہیں،

اس کتاب کے ابوابِ سابقہ میں جماعت کے حسیات، افکار اور خیالات کے متعلق جو ایک طول طویل بحث گذر چکی ہے، اس سے بطور نتیجہ کے اُن عواملِ قریبہ کا اخذ کرنا اور ان کی حقیقت کا دریافت کرنا آسان ہو گیا ہے، جو جماعت کو آمادۂ عمل کر دیتے ہیں، نیز گذشتہ بیانات سے ہم یہ نتیجہ بھی اخذ کر سکتے ہیں، کہ کون سے عوامل جماعت پر زیادہ اثر کرتے ہیں؟ ان عوامل و مؤثرات کی قوتِ تاثیر کتنی ہوتی ہے؟ اور اس اثر کا تعدیہ تمام افراد میں کس طرح ہوتا ہے؟ خصوصًا ان اثرات کا تعدیہ جو مختلف ذہنی اشکال کی صورت میں اُس کے ذہن میں مرتسم ہوتے ہیں، پھر چونکہ ذہنِ جماعت

ہیں ان اثرات کی پیدائش مختلف وسائل اور ذرائع کی مدد سے ہوتی ہے، اور اس بنا پر اُن عوامل و موثرات کا بھی جو جماعت پر اثر کرتے ہیں، مختلف اقسام کا ہونا ضروری ہے، اسلئے ہم ذیل میں ایک ایک موثر سے علٰحدہ علٰحدہ بحث کریں گے، اور گو اس صورت میں ہمکو بعض بیاناتِ ماسبق کی تکرار کرنا پڑیگی، تاہم ہمارے نزدیک یہ بحث کچھ غیر سودمند نہیں ہے، کیونکہ جماعت کی حالت قدمار کے طلسموں سے مشابہ ہوتی ہے، کہ یا تو طلسم کو حل کرو اور یا اپنے تئیں ان کے سپرد کردو، کہ وہ تمھیں فنا کردیں،

(۱)

ذہنی اشباح، الفاظ اور جملوں کا اثر

اوپر جہاں ہم نے جماعت کیلئے خاصۂ تخیل آرائی کی وضاحت کی تھی، وہاں ہم یہ بیان کرچکے ہیں کہ جماعت ذہنی صور و اشکال سے زیادہ متاثر ہوتی ہے، اور گو ہر وقت اُن ذہنی صور و اشکال کا ذہنِ جماعت میں موجود ہونا ممکن نہیں لیکن اگر الفاظ اور جملوں کو حزم و احتیاط کیساتھ استعمال کیا جائے تو ذہنِ جماعت میں صور و اشکال کا پیدا کردینا بھی آسان ہوتا ہے، خاصکر جب الفاظ اور جملوں کا استعمال کرنے والا ازمنۂ سابقہ میں احتیاط اور حزم کیساتھ انکا استعمال کرتا، تو اسکے معتقدوں کے دلوں میں اسکے الفاظ جادو کا اثر کرتے اور نفوسِ جماعت میں غیظ و غضب کی بجلی سی دوڑ جاتی، لیکن جب نفوس جوش اور غیظ و غضب سے پُر ہوجاتے تو اسوقت وہ پھر ان میں سکون کی حالت پیدا کردیتا، غرض اپنے حزم و احتیاط اور ہوشیاری کی بدولت اس کو اس قدر طاقت حاصل ہوجاتی، کہ وہ جب چاہتا لوگوں کو رلادیتا، اور جب چاہتا اُن کو ہنسا دیتا،

لیکن وہ الفاظ جو اپنے اندر مقناطیسی قوت رکھتے ہیں، انکے متعلق یہ خیال رکھنا چاہیے کہ

انکی اس قوتِ تاثیر میں انکے معنوں کو کبھی دخل نہیں ہوتا، بلکہ ان الفاظ کی ساحرانہ تاثیر درحقیقت مخفی ہوتی ہے اُن ذہنی اشکال اور صور کے اندر جوان الفاظ سے ذہنِ جماعت میں پیدا ہوتے ہیں، یہانتک کہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ وہ الفاظ جو ذہنِ جماعت پر زیادہ اثر کرتے ہیں، انکے معنی اسی قدر زیادہ مبہم ہوتے ہیں اور باوجود اس کے ان الفاظ کا اثر اس قدر قوی ہوتا ہے کہ گوان الفاظ کی حقیقت اور معنی اصطلاحی سے عوام ناآشنا ہوتے ہیں، لیکن یہ الفاظ نفوس میں کچھ اس طرح گھر جاتے ہیں، کہ ان کے متعلق لوگوں کو یہ اعتقاد ہو جاتا ہے کہ تمام اجتماعی مشکلات کا حل ان ہی الفاظ کے ساتھ وابستہ ہے،

پھر بعض الفاظ اور جملوں کا اثر اسقدر قوی ہوتا ہے، کہ افراد کی عقلوں پر بھی یہ اثر غالب آجاتا ہے، اس اثر کے آگے دلائل وبراہین بھی سپر انداز ہو جاتے ہیں، ان الفاظ اور جملوں کی حالت یہ ہوتی ہے کہ ادھر متکلم کے منہ سے یہ الفاظ اور جملے نکلنے بھی نہیں پائے اور ادھر سامعین پر ہیبت سی چھا گئی اور احترام وعظمت نے ان کو سرنگوں کر دیا، اور یہ جادو بھی ایسا قوی ہوتا ہے کہ ان الفاظ کے متعلق بعض لوگوں کا یہ اعتقاد ہو جاتا ہے کہ ان الفاظ میں کوئی الٰہی طاقت مضمر ہے لیکن بات یہ ہوتی ہے کہ یہ الفاظ اور جملے لوگوں کے ذہنوں میں ایسی ذہنی صورتیں اور اشکال پیدا کر دیتے ہیں، جنکی کیفیت نامعلوم ہوتی ہے، بزرگی اور عظمت انکو ڈھانپے ہوتی ہے اور ابہام انہیں ایک مخفی قوت پیدا کر دیتا ہے گویا وہ معبود ہوتے ہیں جو آنکھوں سے نظر نہیں پڑتے اور نگاہوں سے اسطرح غائب رہتے ہیں، کہ اُن کی ہیبت وجلال سے ہاد کے بدن میں جھرجھری پیدا ہوتی ہے، لیکن چونکہ یہ ذہنی صورتیں اور شکلیں جو الفاظ سے ذہن میں پیدا ہوتی ہیں، انکا وجود ان الفاظ کے معنوں سے الگ اور بے تعلق ہوتا ہے، اسلئے اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک لفظ جس کا استعمال مختلف قوموں میں جاری ہے، اس سے جو خیالی شکل مختلف قوموں کے ذہنوں میں پیدا ہوتی ہے، اس میں ضرور

ایام سے اختلاف ہو جاتا ہے اور اس لفظ کا استعمال کرتے ہی اسکی یہ مختلف خیالی شکلیں ذہن کے اندر حاضر ہو جاتی ہیں،

لیکن سطورِ بالا میں یہ کلیہ جو بیان کیا گیا کہ نفوسِ جماعت پر صرف وہی الفاظ اثر کرتے ہیں، جن کے اندر ذہنی صورتوں کے پیدا کرنے یا بالفاظِ دیگر نفرت و رغبت کے جذبات کو برانگیختہ کرنے کی قوت مخفی ہوتی ہے، اور جن کے اشارہ پر قومیں آمادۂ عمل ہو جاتی ہیں، یہ کلیہ دراصل تمام الفاظ کیلئے عام نہیں ہے، بلکہ بعض الفاظ ایسے بھی ہوتے ہیں جن میں گو ان ذہنی صورتوں کے پیدا کرنے کی قوت پہلے مخفی تھی، لیکن اب کثرتِ استعمال کے باعث اُن سے یہ قوت سلب ہو گئی اور اب وہ خالی آواز ہو کر رہ گئے، جن کا اب سوا اس کے کچھ نہیں رہا کہ انکو استعمال کرتے وقت ہمیں غور کرنے یا سوچنے کی زحمت نہیں برداشت کرنا پڑتی، بلکہ اب ہم اُن کی ہدایتوں پر بلا تکلف عمل کرتے ہیں، یہی بات ہے کہ بچپنے میں جو الفاظ بچوں کو رٹا دیئے جاتے ہیں، ان سے وہ گو اثر پذیر تو نہیں ہوتے، لیکن وہ ان الفاظ کی ہدایتوں پر ہمیشہ کاربند ہوتے ہیں،

اسی طرح اگر کسی زبان کی ماہرانہ واقفیت پیدا کیجائے، تو پتہ چلے گا کہ اس زبان کے مختلف ادوار میں گو الفاظ کا بالائی تغیر تو بہت آہستہ آہستہ وقوع میں آیا ہے، لیکن الفاظ کے معانی اور وہ ذہنی صورتیں جو الفاظ سے پیدا ہوتی ہیں، ایک دور سے دوسرے دور میں آکر انکی بالکل قلبِ ماہیت ہو گئی ہے، یہانتک کہ اب دوسرے دور میں آکر کسی لفظ کے جو جدید معنی پیدا ہوئے ہیں، وہ اس لفظ کے معنی متروک سے کوئی نسبت نہیں رکھتے، یہی سبب ہے کہ میرا یہ خیال ہے کہ ایک زبان کا دوسری زبان میں پورا پورا ترجمہ کرنا بالکل محال ہے، خاصکر کسی ایسی زبان کا ترجمہ جو اب مردہ ہو گئی ہو، اب اس وقت اگر ہم یہ چاہیں کہ یونانی یا لاطینی یا سنسکرت زبانوں کے کسی لفظ کا ترجمہ اپنی فرانسیسی زبان میں کرلیں تو گویا اسکا یہ مطلب ہوگا کہ ہم ان

ذہنی اشکال اور صور کو جو ہماری اپنی روزانہ زندگی سے ماخوذ تھیں، مٹا کر انکی جگہ ان ذہنی اشکال وصور کو دے رہے ہیں جنھیں ہماری روزانہ زندگی سے کوئی نسبت نہیں، انقلاب فرانس کے اہل حل وعقد نے اس بات کی کوشش کی تھی کہ اپنی زبان میں یونانی اور رومی زبان کے چند الفاظ مستعار لیکر اپنی روزانہ زندگی کے نظام میں یونانیوں اور رومیوں کی تقلید کریں، لیکن انکا یہ فعل اس سے زیادہ کچھ نہ تھا کہ وہ یونانی اور رومی زبانوں کے ان قدیم اجنبی الفاظ کو اجنبی اور غیر مستعمل معنوں میں استعمال کرنے لگے، گو الفاظ کی صورت یکساں سہی، لیکن بھلا کہیں ہمارے اور یونانیوں کے نظام زندگی میں کوئی مشابہت ہو سکتی ہی؟ ایک لفظ جمہوریت ہی کو لو جمہوریت کا جو مفہوم ہمارے ذہن میں ہی، اسکو اس مفہوم سے جو یونانیوں کے ذہن میں تھا کونسا لگاؤ ہے؟ یونانیوں میں اس لفظ کا جو مفہوم تھا وہ یہ تھا کہ چند استبداد پسند امرا جمع ہو جاتے اور اپنے زرخرید غلاموں پر حکومت جتاتے، گویا اس جمہوریت کی حالت دیہاتی پنچایت کی ایسی ہوئی جسکا انحصار صرف رسم غلامی پر تھا، کہ اگر یہ رسم موقوف ہو جاتی تو اس جمہوریت کا بھی خاتمہ ہو جاتا، دیکھو آجکل کی ترقی یافتہ جمہوریت اور قدیم یونانی جمہوریت میں زمین آسمان کا فرق ہی،

یا اسی طرح ایک دوسرا لفظ حریت ہی اس لفظ کے موجودہ معنی دیکھو اور اس کا مقابلہ اس معنی سے کرو، جس معنی میں یہ لفظ قدیم زمانہ کی ناآشنائے حریت قوموں میں استعمال کیا جاتا تھا، قدیم زمانہ میں حریت کا دائرہ اسقدر محدود تھا کہ کسی کو ان عقائد میں جو عام طور پر اس زمانہ میں تسلیم کر لئے گئے تھے، چون وچرا کرنے کی بالکل جرأت نہیں ہوتی، اب اسکے مقابلہ میں موجودہ زمانہ میں حریت کو اسقدر وسعت دیدی گئی ہو کہ کوئی مسئلہ ایسا نہیں رہا ہی، جو کبھی زیر بحث نہ لایا گیا ہو، یا اسی طرح ایک لفظ مادر وطن ہے، اس لفظ کے معنی بھی اب پہلے سے بہت مختلف ہو گئے ہیں، یونان میں جب ایتھنز اور اسپارٹا کی جدا جدا حکومتیں قائم

تھیں، اوران شہروں کے باشندے آپس میں لڑا جھگڑا کرتے تھے، تو اُس وقت انکے درمیان کوئی ایساعام رشتہ نہ تھا، جوان سب کو متحد کرتا، مختلف شہروں کے باشندے اپنے دیس کو اپناوطن سمجھتے تھے، اتھینز والوں کا دیس اور وطن اتھینز تھا اور باشندگانِ اسپارٹا کا وطن اسپارٹا، غرض ان مختلف شہروں کے باشندے باوجودیکہ جغرافیانہ حدود کے لحاظ سے ایک دوسرے کے ہمسایہ تھے، لیکن ان کے درمیان کوئی ایساوسیع رابطۂ وطن نہ تھا، جسمیں وہ سب اپنے کو حصہ دار اور شریک سمجھتے، پھر یونانیوں سے قطع نظر کرکے خود ہمارے ملک کے قدیم باشندوں کے حالات پر نظر دوڑاؤ، تو یہاں بھی تمھیں یہی سماں نظر آئیگا، قدیم زمانہ میں ملک گال کا ایک ایک ضلع علیحدہ علیحدہ ایک ـــــ وطن تھا جسمیں مختلف المذاہب، مختلف العقیدہ اور مختلف اللسان قومیں بستی تھیں، جو باہم ایک دوسرے سے سخت متنفر تھیں انمیں نہ کوئی رابطۂ قومی تھا نہ کوئی جامعۂ دینی، اور نہ کوئی جامعۂ سیاسی، لیکن جب سیزر کے زمانہ میں رومیوں نے ممالکِ گال کو فتح کیا، اسوقت جامعۂ سیاسی اور جامعۂ وطنی کے برکات ان ممالک کو حاصل ہوئے۔

غرض مختلف زبانوں میں اس قسم کے بہت سے الفاظ موجود ہیں، جنکے معنوں میں زمانہ کے تغیرات کے ساتھ ساتھ بہت بڑا انقلاب ہوگیا ہے، اور اب ان کے قدیم معنوں کا دریافت کرنا بھی خالی از دقت نہیں ہے، بلکہ بہت سے وہ الفاظ جو ابتک اپنے قدیم معنی میں استعمال کیے جاتے ہیں، ان میں بھی اگر مرورِ ایام سے اختلاف و تغیر ہوگیا ہو تو کوئی تعجب نہیں مثلاً "بادشاہ" اور "شاہی خاندان" یہ الفاظ اگرچہ اپنے قدیم معنی میں استعمال کئے جاتے ہیں، لیکن جس طرح اور دیگر الفاظ کے معنوں میں انقلاب ہوا ہے، اسی طرح ممکن ہے کہ ان الفاظ کے معنوں میں بھی کوئی تغیر ہوگیا ہو، اور یہ الفاظ پہلے اور کسی معنی میں استعمال کئے جاتے ہوں جواب متروک ہوگئے ہوں

پس ہمارے گذشتہ بیان سے جو اہم تفریع مستنبط ہوتی ہے، وہ یہ ہے کہ چونکہ الفاظ کے استعمالات اور معانی محض وقتی ہوتے ہیں، اور مرورِ ایام اور اختلافِ اقوام سے انکے معنوں میں تغیر ہوجاتا ہے، اسلئے اگر ہم جماعت کو اثر پذیر کرنا چاہیں، تو اسوقت ہمارا پہلا فرض یہ ہونا چاہئے کہ ہم الفاظ کو ان معنوں میں استعمال نہ کریں، جو قدیم زمانہ میں مستعمل تھے، اور نہ الفاظ کا استعمال ان معنوں میں کریں، جنکو جماعت سے زیادہ عقلمند لوگ استعمال کرتے ہیں، بلکہ صرف اُن معنوں میں الفاظ کا استعمال کریں جو اس قوم میں بروقتِ خطابت مروج و معروف ہوں،

اسی بناپر جب کسی ملک میں سیاسی ہیجان دور ہوکر سکون کی کیفیت پیدا ہوگئی ہو، اور جماعت بعض الفاظ سے اظہارِ نفرت کرنے لگی ہو تو اس وقت اُس قوم کے سیاست دانوں پر واجب ہوجاتا ہے کہ جلدی سے الفاظ کی ظاہری صورتوں کو تبدیل کردیں، اور انکے معانی یا بالفاظ دیگر ذہنی اشکال سے تعرض نہ کریں، کیونکہ ان معانی اور ذہنی صورتوں کا تعلق زیادہ تر قوموں کے موروثی مزاج کیساتھ ہوتا ہے جس میں تغیر کرنا کچھ کھیل نہیں ہے، ٹاکویل نے جو ایک بہت بڑا نقاد گذرا ہے، آج سے پیشتر کہا تھا، کہ اس کے زمانہ میں فرانس میں قنصلوں اور حکومت کا بڑا فرض یہ تھا کہ قدیم نظاماتِ حکومت و نظامِ معاشرت کیلئے ہروقت جدید الفاظ فراہم کرتے رہیں یعنی قوم کے ذہن میں کسی لفظ سے جو ذہنی شکلیں پیدا ہوتی ہیں، وہ جب قوم کو ناپسند ہونے لگتیں، تو فرانس کے سیاستداں اس لفظ کے بجائے کسی جدید لفظ کا استعمال شروع کردیتے، اسی غرض سے اُنھوں نے شخصی ٹکسوں کا نام "ٹکیس جائداد منقولہ" رکھا تھا اور چیندوں کو وہ "غیر معین ٹکیس" کہا کرتے تھے،

پس قوموں کے اہلِ سیاست کا سب سے بڑا فرض یہ ہوتا ہے کہ جب جماعت کے کانوں کو کوئی لفظ ناگوار گذرنے لگے، تو اس لفظ کی جگہ پر کسی دوسرے لفظ کو لاکر رکھدیں، جو جماعت کے نزدیک ناپسند نہ ہو، بات یہ ہے کہ نفوسِ جماعت پر الفاظ کا اتنا قوی اثر پڑتا ہے، کہ بعض اوقات

کسی ناپسندیدہ شے کو کسی معروف لفظ سے ظاہر کر دینا جماعت کی ناپسندیدگی کو دور کر دیتا ہے،
اسی بنا پر موسیو ٹاکویل کا قول ہے کہ انقلاب فرانس کے اہلِ حل وعقد نے الفاظ "حریت و مساوات"
کو جو اس زمانہ میں نہایت مقبول تھے، بار بار استعمال کر کے ایسی مستبدانہ حکومت قائم کر لی
جو ڈاہومیا کے زیادہ مناسب حال تھی اور احتساب کا ایک ایسا محکمہ ایجاد کیا جو مذہبی محکمۂ
انکویزیشن سے مشابہت رکھتا تھا، اور ایک ایسا فتنہ برپا کیا جیسا کبھی بلاد میکسیکو میں برپا ہوا
تھا، پس اب اس بنا پر حکام سلطنت کی حالت وکلا اور بیرسٹروں سے ملتی جلتی ہے، جن کا وظیفۂ عمل
الفاظ کا انتخاب اور انکو مناسب مواقع پر استعمال کرنا ہوتا ہے، لیکن اس وظیفۂ عمل کے انجام
دینے میں دقت جو واقع ہوتی ہے، وہ یہ ہے کہ گو ایک قوم کے تمام طبقے ایک ہی قسم کے
الفاظ کا استعمال ہمیشہ کرتے ہیں، لیکن باوجود اس کے ہر طبقہ کے افراد ان الفاظ سے جداجدا
معنی مراد لیتے ہیں اسلیے الفاظ کے انتخاب اور اظہارِ ناپسندیدگی کا کوئی خاص معیار نہیں مقرر کیا جا سکتا
غرض امثلۂ بالا سے یہ بات خوب واضح ہو گئی کہ زمانہ کے اثر سے الفاظ کے معنوں میں کس قدر
عظیم الشان تغیر ہو جاتا ہے، لیکن اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک ہی زمانہ میں مختلف الجنس
اقوام میں جو الفاظ روزمرہ مستعمل ہوتے ہیں، قومی اختلاف کی بنا پر مختلف قومیں ان الفاظ کے مختلف
معنی مراد لیتی ہیں جنکو ایک دوسرے سے کوئی نسبت نہیں ہوتی ہے، البتہ چونکہ الفاظ کے اس معنوی
فرق کو وہ شخص بخوبی ادراک نہیں کر سکتا، جس نے دنیا کی مختلف قوموں میں کبھی بود و باش اختیار
نہیں کی ہے، اسلیے میں یہاں اس مسئلہ کو زیادہ طول دینا نہیں چاہتا، ہاں صرف یہ بتا دینا ضروری
سمجھتا ہوں کہ یہ معنوی فرق اُن الفاظ میں زیادہ نظر آتا ہے، جو نہایت کثرت سے لوگوں میں شائع
ہوتے ہیں، مثلاً موجودہ زمانہ میں الفاظ ڈیمقراطی، اشتراکیت، جمہوریت، وغیرہ گو نہایت کثیر الاستعمال
ہیں لیکن محض قومی اختلاف کی بنا پر مختلف قوموں میں ان الفاظ کا استعمال مختلف معنوں میں ہوتا ہے

ایک لفظ جمہوریت کو لو جو یورپ کی مختلف قوموں میں مستعمل ہے، کیا اس لفظ کی تصویر ذہنی ایک اٹالین اور ایک انگریز دونوں کے ذہنوں میں یکساں پیدا ہوتی ہے؟ اور کیا اس لفظ کا جو مفہوم ایک اٹالین اور ایک انگریز سمجھتا ہے، ان دونوں میں کوئی فرق نہیں ہوتا؟ لاطینی قوموں کے نزدیک تو جمہوریت کا مطلب یہ ہے کہ افراد کا ارادہ ذاتی اور استقلال حکومت کے ارادہ اور استقلال کے اندر فنا ہو جائے، افراد سوسائٹی کے تمام فرائض ترک کر کے محض حکومت کے دست نگر ہو جائیں کہ حکومت سوسائٹی کے منافع کی حفاظت کیلئے جو تدابیر چاہے، اختیار کرے، بخلاف اسکے ایک سیکسن انگریز خصوصاً ایک امریکن لفظ جمہوریت سے جو مفہوم سمجھتا ہے، وہ یہ ہوتا ہے کہ بجائے حکومت کے افراد سوسائٹی کے فرائض و واجبات انجام دیں اور افراد کا استقلال ذاتی، حکومت کے استقلال پر غالب رہے حکومت افراد کی مرضی کے تابع ہو، نہ یہ کہ افراد حکومت کی مرضی کے تابع ہوں، حاصل یہ کہ ایک لفظ جمہوریت جو مختلف قوموں میں کثیر الاستعمال ہے کہیں تو یہ لفظ افراد کے استقلال ذاتی کو مٹا کر حکومت کا پایہ بلند کر دیتا ہے، اور کہیں حکومت کے ارادہ کو افراد کے ارادہ میں جذب کر کے افراد کے استقلالِ ذاتی کو اور قوی کر دیتا ہے،

(۲)
اوہام کا اثر

دنیا پر جب سے آفتابِ تمدن نور افگن ہوا ہے، اسوقت سے ابتک جماعت ہمیشہ اوہام ہی کے آگے سرنگوں رہی ہے، اور موجدین اوہام ہی کے لئے اسنے مختلف زمانوں میں طرح طرح کے بت، ہیاکل اور معابد تعمیر کئے ہیں، دنیا کا ہر وہ تمدن جو کبھی روے زمین پر آب و تاب سے جلوہ گر ہوا، اسکے آگے ہمیشہ اوہام کی خیالی مشعلیں رہنمائی کرتی جاتی تھیں، اوہام و تخیلات ہی کی بنیاد پر کالڈیا اور قدیم مصر کے تمدنوں کی عمارت تعمیر کی گئی، انہی کی بنیاد پر قرونِ وسطی میں مساجد

اور گرجے تعمیر کئے گئے، اور انہی اوہام کی بدولت سو برس پیشتر براعظم یورپ زیر و زبر کر دیا گیا، صرف یہی نہیں بلکہ اوہام کا طوقِ محکومیت ہر فنی، سیاسی اور اجتماعی تحقیق اور انکشاف کی گردن میں بھی نظر آتا ہے، اور گو بعض اوقات انسان اس بات کا ارادہ کرتا ہے، کہ اُن اوہام کی بنیادوں کو متزلزل کر دے جو اس پر غلبہ کئے ہوئے ہیں، لیکن جس وقت وہ اس ارادہ کو عملی جامہ پہناتا ہے تو اسکو انقلاب اور شورش کے مصائب بھی جھیلنا پڑتے ہیں، اور گو وہ کبھی اپنے مقصد میں کامیاب بھی ہو جاتا ہے، لیکن ان اوہام کی بنیاد کو متزلزل کرتے ہی وہ پھر دوسری مصیبت میں گھر جاتا ہے یعنی اس پر اب دوسرے اوہام مستولی ہو جاتے ہیں، غرض اوہام کے قیود سے انسان کو کبھی رہائی نہیں مل سکتی، حقیقت یہ ہے کہ اگر انسان اوہام کا پابند نہ ہوتا، تو شاید اپنے قدیم توحش سے وہ کبھی نجات نہ پا سکتا، اور ہمیشہ وہ وحشت اور بربریت کی بیشمار وادیوں میں بھٹکتا پھرتا، اوہام خیالاتِ باطلہ سہی لیکن انہی کا صدقہ ہے کہ قومیں علوم و فنون میں ہر جدید سے جدید تحقیق کے دریافت کرنیکی کوشش کرتی ہیں، اور تہذیب و تمدن میں ہر نفیس سے نفیس شئے اختراع کرتی ہیں،

دانیال لوزبار کہتا ہے کہ

"عجائب خانوں اور لائبریریوں میں جو کچھ انسان کا فراہم کردہ سرمایہ جمع ہے، اس کو جلا دو، اور تمام بڑے بڑے آثار جو فنون اور ادیان کے نمونہائے صنعت ہیں انکو ایک ایک کر کے توڑ ڈالو، تو انسان کے تخیل کی بنائی ہوئی کون سی چیز باقی رہے گی؟ لیکن قوموں کے نامور رہنما اور جادو بیان شعرا النفوس کے اندر آتشِ امید پھر نئے سر سے مشتعل کر دینگے، انسان امید کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا، لیکن علم بھی امید کے اس مصالح کو فراہم نہیں کر سکتا، علم نے پچاس برس تک اس امانت کو اپنے پاس محفوظ رکھنا چاہا، لیکن علم انسان کو آئندہ کے متعلق خیالی امید دلانے میں ناکام رہا، کیونکہ اسکو فریب دینا اور جھوٹ بولنا نہیں آتا تھا"

دیکھو گذشتہ صدی میں فلاسفہ نے اپنے زمانہ کے تمام دینی، سیاسی اور اجتماعی اوہام و تخیلات کو جو صدیوں سے ہمارے اجداد کے دستور العمل رہتے چلے آرہے تھے، مٹا دینا چاہا، لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے، تو انھوں نے امید و رجا کے دروازوں کو بند کر دیا، اور خیال کے مٹ جانے کے بعد اب مردہ فطری قوتوں کی حکومت تمام دنیا پر قائم ہو گئی، جو نہ ضعیفوں پر شفقت کرتی ہیں اور نہ بیکسوں پر ترس کھاتی ہیں، اور گو ان قدیم اوہام کو مٹانے کے بعد فلسفہ بہت تیزی سے ترقی کرنے لگا، لیکن اپنی ترقی کے باوجود جماعت کے لئے ایسے خیالات فراہم نہ کر سکا، جو اسکی کلفتوں کو دور کرتے اور ناامیدی اور بیکسی کے عالم میں خوشنما امیدوں کا سبز باغ دکھلاتے، جماعت کی مثال تو رینگنے والے کیڑے کی ایسی ہو کہ جہاں اسکو روشنی دکھائی دی وہیں وہ دوڑ گیا، اسکے لئے تو امید کی مشعل ہونا چاہئے، جو اسکی رہبری کرے، پس اب جماعت نے جب یہ دیکھا کہ فلسفہ اسکے خیالی آرام و سکون کے اسباب فراہم نہیں کرتا تو وہ فلسفہ سے ناامید ہو کر تاجران بلاغت کی دوکانوں پر جو اپنے خطیبانہ انداز میں اس نادر اور نایاب گوہر بیش بہا کو فروخت کرتے پھرتے تھے، عاجزی کیساتھ بھیک مانگنے دوڑی گئی، اور چونکہ قومیں حقیقت کو چھوڑ کر طمع کے پیچھے ہمیشہ سرگرداں رہتی ہیں، اسلئے ان جادو بیان خطیبوں کا اثر جماعت پر چل گیا، اور اب وہ ان کی زر خرید کنیز بن گئی، زمانہ حال میں اشتراکیت کا جو اثر ترقی کر رہا ہے، اگر اسکے اسباب دریافت کرو تو پہلی نگاہ اس تخیل پر پڑے گی جو مذہب اشتراکیت کا روح رواں ہے، اور جسکی حقیقت کو اگرچہ علم نے کھول کر رکھدیا ہے، لیکن باوجود اسکے اس مذہب کا جادو لوگوں کو مسحور ضرور کر لیتا ہے، بات یہ ہے کہ یہ مذہب اس وجہ سے اور زیادہ ترقی کر رہا ہے کہ اس مذہب کے داعی حقائق اشیاء سے ناواقف ہیں، اور اپنی ناواقفیت کی بدولت لوگوں کو یہ امید دلاتے ہیں، کہ اپنی زندگی میں وہ ابدی سعادت سے بہرہ اندوز ہو سکتے ہیں،

حالانکہ یہ فریب ہے، اور انسان کو کبھی اس حیاتِ فانی میں ابدی سعادت نصیب ہی نہیں ہو سکتی، لیکن اس وہم نے لوگوں کے ذہنوں میں کچھ اسقدر رسوخ پیدا کر لیا ہے کہ اب اس نے ان قدیم اوہام کی جگہ حاصل کر لی ہے، جو زمانہ قدیم میں ہمارے اجداد کے دستور العمل تھے،

حاصل یہ ہے کہ جماعتیں اپنے دورِ حیات میں کبھی تشنۂ حقیقت نہیں ہوتیں، بلکہ ان پر ہمیشہ ان اوہام کا غلبہ ہوتا ہے، جو ان کے مضطرب قلبوں کیلیے سامانِ امید فراہم کرتے ہیں،

(۱۳)

تجارب کا اثر

صفحاتِ بالا میں ہم وضاحت کر چکے ہیں، کہ قومیں اپنے آبائی اور موروثی اوہام و خیالات کی کس درجہ پابند ہوتی ہیں، اور یہ اوہام و خیالات اس قدر مستحکم ہوتے ہیں، کہ ان کو اپنی جگہ سے ہلانے میں اکثر ناکامیابی ہوتی ہے، لیکن اوہام کا یہ اثر و غلبہ صرف اسی وقت تک رہتا ہے جب تک واقعات و تجارب کی بدولت اُن کی بنیادیں متزلزل نہ ہو جائیں، اوہام کی یہ مضبوط چٹانیں جو عملِ توارث کی بدولت صدیوں میں استحکام حاصل کرتی ہیں، واقعات و تجارب کا سیلان ہی صدیوں میں ان کو کاٹ سکتا ہے، اور انسان کے ذہنوں کے اندر آبا و اجداد کا متروکہ سرمایہ قدیم اوہام کی صورت میں جو بند محفوظ رہتا ہے، اسکو چشم زدن میں اگر کوئی چیز جلا کر خاک سیاہ کر سکتی ہے، تو وہ واقعات و تجارب کی آتشِ عالم سوز ہے، غرض وہ عظیم الضرر اوہام جو ذہنِ انسانی میں مستحکم ہو گئے ہیں، رفتارِ واقعات کی بدولت ان کا استحکام خاک میں ملجاتا ہے، ان کی مضرتیں کھل جاتی ہیں، اور صدیوں کا بنا بنایا کھیل دم کے دم میں بگڑ جاتا ہے،

لیکن یہ تجارب جو اوہام کے استحکام کو نقصان پہنچاتے ہیں، انکے اثر و فعل کرنیکے

لئے بھی دو باتوں کی ضرورت ہوتی ہے،

۱۔ تجارب جس قدر زیادہ عمومیت لئے ہوئے ہونگے، اسی قدر زیادہ وہ اوہام کے اثر کو مٹا سکیں گے،

۲۔ تجارب بار بار وقوع پذیر ہوں، تاکہ خوب اچھی طرح وہ اوہام کے اثر کو مٹا سکیں،

ان دو شرطوں میں سے دوسری شرط نہایت اہم ہے، اور اوہام کے مٹنے کے لئے واقعات کے مکرر وقوع پذیر ہونے کی اسقدر ضرورت ہوتی ہے کہ بسا اوقات ایک صدی کے واقعات دوسری صدی کے لوگوں کے لئے بالکل سرمایۂ عبرت نہیں ہوتے، اور یہی وجہ ہے کہ تاریخی واقعات سے کسی بات پر استدلال کرنا بالکل بیکار ہوتا ہے، گذشتہ زمانہ کے تاریخی واقعات کی اگر کوئی قدر و قیمت ہماری نگاہ میں ہوسکتی ہے، تو وہ یہ ہے کہ ان سے صرف یہ معلوم ہوسکتا ہے کہ تجارب کے موثر اور کارگر ہونے اور نفوس جماعت میں جو اوہام راسخ ہوگئے ہیں، ان کے مٹانے کے لئے تجارب کے بار بار وقوع پذیر ہونے کی کس قدر ضرورت ہوتی ہے،

موجودہ صدی اور اس کے پیشتر کی صدی میں ایسے ایسے ہولناک واقعات کا ظہور ہوا ہے جن کی کوئی دوسری نظیر صفحاتِ تاریخ میں نہیں مل سکتی، اور شاید کسی زمانہ میں ایسے ہولناک واقعات کا ظہور نہ ہوا ہوگا، اسلئے مورخین ضرور ان ہولناک واقعات کا بار بار تذکرہ کریں گے، اور یہ دو صدیاں ہمیشہ انسان کی تاریخ میں اس بات کے لئے یادگار رہیں گی، کہ انسان کے سیاسی اور اجتماعی حالات میں جن واقعات نے انقلاب کردیا، ان کا ظہور ان ہی دو صدیوں میں ہوا ہے،

ان عجیب تر واقعات میں سے جو گذشتہ صدی میں گذر چکے ہیں، ایک واقعہ انقلاب فرانس کا ہے، اس واقعہ میں محض اس بات کا تجربہ حاصل کرنے کی غرض سے کہ کوئی قوم صرف عقلی

اصول کی پابندی کرکے نئے سرے سے زندہ کیجا سکتی ہے یا نہیں، ہم کو مسلسل ...سال تک تمام
ممالکِ یورپ میں انقلاب اور شورش کی آتشِ سوزاں کو مشتعل کئے رہنا پڑا جسمیں سیکڑوں بیگناہوں
کا خون ہوگیا، پھر اس کے بعد پچاس برس کی مدت میں دو کمزور تجربوں کے ذریعہ سے ہمکو
یہ بات معلوم ہوئی کہ شاہانِ وقت جن قوموں کو بلندی پر لیجانا چاہتے ہیں، ان پر وہ سخت
منفعتوں کا بار ڈالدیتے ہیں، اور باوجودیکہ یہ دونوں تجربے اپنے مقاصد میں کامیاب رہے
لیکن معلوم ہوتا ہے کہ شاید طمانیت اور سکون پیدا کرنے کے لئے ناکافی ثابت ہوئے، انمیں سے
پہلا تجربہ تو وہ تھا کہ جسمیں سیکڑوں جانوں کے نقصان کے ساتھ اجنبی حملہ کے مصائب بھی ہمکو برداشت
کرنا پڑے، اور دوسرے تجربہ میں ہمارے ملک کا ایک حصہ بھی ہم سے جدا ہوگیا، اور ایک باقاعدہ
اور دوامی لشکرِ جرار کے رکھنے کی ضرورت محسوس کی گئی، اور تیسرے تجربہ کا عنقریب ظہور ہونیوالا ہے
حاصل یہ کہ جس آخری جنگ نے ہماری فراہم کردہ دولت کو برباد کرڈالا، اسکی اہمیت اس وجہ سے
اور زیادہ بڑھ گئی ہے، کہ فرانسیسیوں کا یہ اعتقاد جو جرمن افواج کی بابت مدتوں سے قائم تھا کہ اسکی
حیثیت جیشِ ملی (نیشنل گارڈ) سے زیادہ نہیں، اسکی اچھی طرح قلعی کھولدی گئی،[۱]

[۱] اس مسئلہ کے متعلق ہمارے ملک کی رائے عام جن واقعات پر مبنی تھی، انکی حقیقت سے لوگ عام طور پر ناواقف تھے، بات یہ تھی کہ ان دنوں ہمارا جیشِ ملی (نیشنل گارڈ) معمولی حرفت پیشہ اصحاب سے مرکب تھا جو فوجی نظام اور ڈسپلن سے ناآشنائے محض تھے، اس بنا پر لوگوں کے ذہن میں یہ خیال راسخ تھا کہ جرمنی کا جیشِ ملی بھی اسی قسم کا ہوگا اور چونکہ اس قسم کی فوج کے خیال سے ان کو خوف بھی کچھ نہ تھا، اسلئے جماعت کو اپنے اس خیال پر اصرار تھا، موسیو ٹیرس نے ۱۳ر دسمبر ۱۸۶۶ء کو پارلیمنٹ میں جو اسپیچ دی اس کا ایک جملہ موسیو اولیفیہ نے اپنی ایک بدیع الطبع کتاب میں نقل کیا ہے، موسیو ٹیرس گو اپنے زمانہ کا بہت بڑا سیاست داں تھا، تاہم رائے عام کا اسقدر پابند تھا کہ کہتا ہے کہ "جرمنی کے پاس باقاعدہ فوج کے علاوہ جسکی تعداد ہماری افواج کی تعداد کے مساوی ہے صرف ایک قومی گارڈ ہے، جیسا کبھی ہمارے پاس بھی تھا، اور جس کو کوئی اہمیت حاصل نہیں"! موسیو ٹیرس کے اس خیال کی وہی وقعت ہوسکتی ہے، جو اس کے اس خیال کی ہوئی، یعنی جو اس نے ریلوے کی بابت ظاہر کیا تھا، (مؤلف)

اسی طرح جو قومیں وطنی تجارت کی اس غرض سے حامی ہیں کہ اجنبی تجارت کا دروازہ مسدود کر دیا جائے، ان کے سامنے ہم اگر دلائل و براہین پیش کرنا چاہیں تو ان تمام ناخوشگوار واقعات کو دہرانا پڑے گا، جو بیس سال کی مدت میں ہماری تجارت کے خلاف وقوع میں آ رہے ہیں"

(۴)

عقلی استدلال کا اثر

اگر ہمیں یہاں یہ بتانا نہ ہوتا کہ نفوسِ جماعت عقلی استدلال سے بالکل اثر پذیر نہیں ہوتے تو شاید جماعت کے موثراتِ قریبہ کے ضمن میں اس بحث کا لانا ہی بیکار ہوتا،

ہم اس سے قبل بھی متعدد مقامات پر بیان کر چکے ہیں، کہ براہین و ادلّہ سے جماعت مطلقاً اثر پذیر نہیں ہوتی، بلکہ جماعت پر اگر کسی عقلی استدلال کا اثر ہوتا بھی ہے تو صرف اس استدلال کا جو اشیا کی سطحی مماثلت پر مبنی ہوتا ہے، اور جس کی منطقی نگاہوں میں کوئی وقعت نہیں ہوتی، اور اسی بنا پر جو خطیب جماعت کو متاثر اور مسحور کرنا چاہتا ہے وہ کبھی کسی امر کے متعلق جماعت کی عقل سے فتویٰ نہیں مانگتا، بلکہ ہمیشہ وہ جماعت کے شعور سے فیصلہ طلب کرتا ہے[1]،

[1] جماعت پر اثر ڈالنے کے بارہ میں قواعد منطقی اور اصول عقلی کو جو ضعف حاصل ہے اسکی ایک بین دلیل محاصرہ پیرس کے زمانہ میں خود میرے مشاہدہ سے گذری، میں نے ایک روز کچھ لوگوں کو دیکھا کہ وہ ایک فوجی کمانڈر کو سر لیے ہوئے قصر لیجا رہے تھے جو اندنوں حکومت تھا کھینچے لئے جا رہے تھے، لوگ جو اسکے گرد تھے غصہ میں بھرے ہوئے تھے اور اس کمانڈر کا جرم یہ بتاتے تھے کہ یہ غنیم یعنی جرمنوں کو مدد پہنچانے کی غرض سے ایک قلعہ کا فوٹو لے رہا تھا، یہ لوگ محل کے دروازہ پر پہنچے ہونگے کہ اتنے میں دروازہ کے اندر سے حکومت کا ایک ممبر نکلا جو بلند آواز خطیب بھی تھا، اور اس نے لوگوں کو شور و غل مچاتے دیکھکر اصل واقعہ دریافت کیا، میں اس خیال میں تھا کہ شاید یہ اس فوجی افسر پر سے الزام دفع کرنے کے لیے اس مجمع کو یہ تشفی بخش جواب دیگا کہ یہ جرم درحقیقت اس شخص کا نہیں ہے، بلکہ یہ جرم فوٹو گرافروں کی ایک جماعت کا ہے جنھوں نے اس قلعہ کے فوٹو لیے جو شہر کے ہر دوکاندار کے پاس موجود ہیں، لیکن مجھ کو سخت حیرت ہوئی جب میں نے اسکو یہ کہتے سنا کہ "اچھا اس شخص سے باز پرس کیجائیگی، اور حکومت اس معاملہ کی تحقیقات کر کے اس شخص کو سزا دیگی" اس کا یہ کہنا تھا کہ شورش دفع ہو گئی اور مجمع متفرق ہو گیا، لیکن اسکے بعد میں نے دیکھا کہ ایک یا دو گھنٹے کے بعد وہ مجرم بھی محل سے اپنے گھر صحیح و سالم واپس گیا، اس واقعہ میں اگر خطیب مجمع کے سامنے دلائل منطقیہ پیش کرتا تو شاید وہ خود بھی اس مجمع کے سامنے سے جانبر نہ ہو سکتا، (مولف)

جماعت کو کسی حقیقت کے سمجھانے اور کسی امر کے متعلق مطمئن کرنے کے لئے خطیب کو اپنے
خطبہ میں جن باتوں کے ملحوظ رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے وہ حسب ذیل ہیں :-

۱- خطیب کو اُن خاص خاص احساسات، جذبات اور اعتقادات کا علم حاصل کرنا چاہیئے جن میں جماعت کے شعور کو بیدار کرنے کی قوت موجود ہو،

۲- پھر ترتیبِ بیان میں خطیب کو اس بات کا لحاظ بھی ضروری ہے، کہ حتی الامکان وہ اپنے مافی الضمیر کو ایسی سادہ مثالوں اور تشبیہات کے ذریعہ سے ادا کرے جو کسی واقعہ یا کسی شے کا ایک موثر نقشہ آنکھوں کے سامنے کھینچ دیں،

۳- پھر خطیب کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ خطبہ دیتے وقت ہر لمحہ یہ اندازہ کرتا رہے کہ اس کے کلام کا سامعین پر کیا اثر پڑا تا کہ ضرورت کے وقت وہ برمحل فوراً اپنے کلام میں تغیر کر سکے،

خطبہ دیتے وقت نفوسِ سامعین میں جو اثر پیدا ہوتا ہے، اور جس کی بنا پر اکثر خطیب کو اپنے کلام میں تغیر کرنا پڑتا ہے، اس سے ہمیں اس بات کی وجہ بھی معلوم ہو جاتی ہے، کہ قبل سے تیار کیا ہوا خطبہ سامعین پر کیوں اثر نہیں کرتا؟ کیونکہ اس صورت میں خطیب کو سامعین کی حالت نظر انداز کر کے اپنے فراہم کردہ افکار و خیالات کا پابند ہو جانا پڑتا ہے، اور اسی لئے سامعین ان افکار و خیالات سے بالکل اثر پذیر نہیں ہوتے، لیکن منطقیین جو پُر زور دلائلِ منطقیہ سے کسی امر کے ثابت کرنے کے عادی ہو گئے ہیں، ان سے جماعت کو مخاطب کرتے نہیں بنتا، کیونکہ وہ ہمیشہ خطابت کے مذکورہ بالا اصول کو نظر انداز کر کے اپنے دعووں کو منطقی دلائل سے ثابت کرنا چاہتے ہیں، جو جماعت کے لئے بالکل بیکار ہوتے ہیں، اور جن سے جماعت ذرہ برابر اثر پذیر نہیں ہوتی، اور اسی بنا پر منطقیین کو تعجب ہوتا ہے، جب وہ دیکھتے ہیں کہ ان کے پر زور دلائل جماعت کے اثر پذیر کرنے میں بالکل قاصر ہیں، منطقیین کا یہ دعوی ہے کہ

وہ اپنے دعوے کے ثبوت میں جس قسم کے دلائل پیش کرتے ہیں، انکا فیصلہ اس قدر ناطق اور بدیہی ہوتا ہے، کہ اگر بیجان مادہ کو بولنے اور بات چیت کرنے کی قدرت ہوتی تو وہ بھی ان دلائل کی قوت کو تسلیم کر لیتا، ان کا یہ قول بیشک صحیح ہے، لیکن مشکل یہ ہے کہ مادہ اور جماعت دونوں اس بات میں یکساں ہیں، کہ منطقی دلائل کا تسلیم کرنا تو کجا وہ ان دلائل کو سننا بھی گوارا نہیں کرتے، جسے ہماری بات کا یقین نہ آتا ہو، وہ کسی وحشی انسان یا کسی بچہ کے سامنے منطقی استدلال پیش کر کے دیکھ لے، معلوم ہو جائیگا، کہ وہ اپنے اس طرز سے جماعت کے ساکت کرنے میں کس قدر قاصر ہے،

اچھا اس کو جانے دو، ایک وحشی کے سامنے شعور و احساس کے مقابلہ میں عقلی دلائل کو پیش کر کے تجربہ کرنے کی ضرورت نہیں، ہمارے دعوے کے ثابت کرنے کے لئے یہی بات کیا کچھ کم ہے، کہ ایک عرصہ تک وہ مذہبی اوہام و خیالات جو عقلی اصول کے خلاف تھے، دنیا کی عقلوں پر مسلّط رہے، اور تقریبًا دو ہزار سال کی مدّت تک دنیا کی روشن عقلیں ان ہی خیالات کے زیر فرمان رہیں، یہاں تک کہ کہیں اس صدی میں آکر ان کی صحت و عدمِ صحت کے متعلق بحث و تحقیق کا دروازہ کھولا گیا، قرونِ وسطیٰ اور نہضتِ جدیدہ کے ابتدائی دور میں گو روشنخیال لوگ بکثرت موجود تھے، لیکن باوجود اس کے کسی عقلی دلیل کی بنا پر ان کے ذہن میں کبھی یہ خیال نہیں گذرا، کہ ان کے زمانہ کے مذہبی اوہام و خیالات بالکل غلط ہیں، اور جادوگروں کے جلائے جانے اور شیطان کے بہکانے وغیرہ کے متعلق ان لوگوں نے زبان تک نہ ہلائی، اسکی وجہ یہی تھی کہ جماعت اپنی بے عقلی کی بدولت جن اوہام و خیالات کے زیر فرمان تھی، ان کے غلبہ کی بنا پر خود ان روشنخیال لوگوں کو انکی بابت کوئی شک و شبہہ پیدا ہی نہیں ہوتا تھا۔

لیکن اب سوال یہ ہے کہ جماعت عقلی اصول کی پیروی جو نہیں کرتی تو کیا اس سے وہ مونکی

عام ترقی میں کوئی رکاوٹ پیدا ہوتی ہے،؟

اس سوال کے جواب میں مجھے صرف یہ کہدینا کافی معلوم ہوتا ہے کہ قوموں نے آجتک جن احساسات ومشاعر کے ماتحت رہ کر عظیم الشان ترقیاں حاصل کی ہیں، وہ جادۂ عقل سے کتنے ہٹے ہوئے ہیں، لیکن باوجود اسکے قوموں کے عظیم الشان انقلابات اور تغیرات میں انہی احساسات ومشاعر کو ہمیشہ دخل رہا ہے، بلکہ میرا خیال یہ ہے کہ اگر انسانی تمدن کی بنا ان احساسات ومشاعر پر نہ ہوتی تو شاید انسان کو یہ عظیم الشان ترقیاں بھی نصیب نہ ہوتیں، حقیقت یہ ہے کہ ہر قوم اپنی عقلی سطح کی تہ میں چند قوانین مضمر رکھتی ہے، جو اسکے انجام اور مآلِ کار کا فیصلہ کرتے ہیں، اور قوم ایک بے شعوری کی حالت میں ان ہی نوامیس اور قوانین کے زیر فرمان ہوتی ہے، البتہ ان مخفی قوانین اور پوشیدہ قوتوں کے متعلق ہمارا علم بہت کمزور ہوتا ہے، اور ان مخفی رازوں کے انکشاف کا یہ طریقہ نہیں کہ ہم کسی قوم کے تاریخی ادوار میں ایک ایک جزئی واقعہ کے اسباب وعلل کی جستجو کریں، بلکہ جب تک اس قوم کے تاریخی دور پر ایک عام نظر دوڑا کر بڑے بڑے انقلابات اور عظیم الشان تاریخی حوادث کے اسباب وعلل کو دریافت نہ کیا جائے، اس وقت تک ان مخفی قوتوں کا پتہ نہیں لگتا، جو قوموں کی تاریخ میں جدید باب کا اضافہ کرتی ہیں،

کیا یہ عقل میں آنے کی بات ہے کہ ایک جاہل زرگر گلیلو نامی تاریخ میں اتنی عظیم الشان شہرت حاصل کرتا ہے، کہ اسکے نام پر دنیا میں تمدن کا سنگِ بنیاد رکھا جاتا ہے، پھر کیا یہ کسی کے اندیشہ میں گذر سکتا تھا کہ عرب کے خانہ بدوش وحشی اپنے بے برگ وگیاہ صحراؤں سے ایکبارگی امنڈ امنڈ کر نکلیں گے اور یونانیوں اور رومیوں کی دریافت کردہ دنیائے قدیم کے ایک وسیع حصہ میں ایسی زبردست حکومت قائم کریں گے جو ہیبت وشوکت میں سکندر کی حکومت سے

بھی بڑھ کر ہو گی، پھر بالآخر یہ کس کو گمان تھا کہ ایک حقیر سپاہی یورپ میں پیدا ہوگا، اور ایک باقاعدہ چھوٹی سی فوج لیکر دنیا کی زبردست قوتوں پر فتوحات حاصل کرکے تاریخ میں ایک زریں یادگار چھوڑ جائیگا،

ہاں بس عقل کو حکما اور فلاسفہ کے لئے چھوڑ دو، وہ اپنے حجروں کے اندر بیٹھے بیٹھے خاموشی کیساتھ خیالی تک بندیاں کیا کریں، اور ان سے قوموں کے معاملات میں مداخلت کی درخواست مت کرو، کیونکہ اکثر اوقات علی رغم عقل انسان کی ذہنی دنیا میں ان احساسات و مشاعر کا زور ہوتا ہے، جو باوجودیکہ اصول عقلی کے سخت خلاف ہوتے ہیں، مگر تمام تمدنوں اور تہذیبوں کا سنگ بنیاد ہمیشہ ان ہی مشاعر و احساسات پر رکھا جاتا ہے، مثلاً انکارِ لذات، ایمان بالدین حب مجد، حبِ وطن وغیرہ وغیرہ،

فصل سوم

قائدینِ جماعت (یعنی لیڈروں) کے خصائص

۱۔ **قائدینِ جماعت**، جماعت کو فطری طور پر ایک لیڈر کی احتیاج ہوتی ہے، لیڈروں کے نفسانی خصائص، لیڈر جماعت کے لئے ایک دستور العمل تجویز کرتے اور جماعت میں باقاعدگی پیدا کرتے ہیں، یہ بحث کہ لیڈروں کو مطلق العنان ہونا ضروری ہے، لیڈروں کے اقسام یہ بحث کہ لیڈروں کیلئے پختہ عزم اور مستقل ارادہ کی کیوں ضرورت ہوتی ہے،

۲۔ **لیڈروں کے وسائلِ عمل**، تاکید، تکرار اور تعدیہ اثر کے ذریعہ سے لیڈر کس طرح جماعت کو متاثر کرتے ہیں، جماعت پر ان موثرات کا درجہ بدرجہ کیا اثر ہوتا ہے، یہ بحث کہ قوم کے ادنیٰ طبقہ سے اعلیٰ طبقہ کی جانب، تعدیہ اثر کس طرح وقوع پذیر ہوتا ہے یہ بحث کہ قوم کے تمام طبقوں میں کسی جدید خیال کی اشاعت کس طرح ہوتی ہے،

۳۔ **نفوذ**، نفوذ کی تعریف اور اس کے مختلف اقسام کی تشریح، نفوذ مکتسب اور نفوذ فطری کی تشریح، ان دونوں کی مختلف مثالیں، یہ بحث کہ قائم شدہ نفوذ کا زوال کس طرح ہوتا ہے،

گذشتہ ابواب میں نہایت تفصیل کے ساتھ معلوم ہو چکا، کہ جماعتوں کی نفسانی ترکیب کن عناصر سے ہوتی ہے، نیز وہ کون سے عوامل و موثرات ہیں، جو نفوسِ جماعت پر اثر کرتے ہیں، اور جن کے اثر سے جماعت کے قوائے عقلی میں حرکت پیدا ہو جاتی ہے، اب صفحاتِ ذیل میں

ہم یہ بیان کریں گے کہ ان عوامل و موثرات سے کام لینے کے کیا کیا طریقے ہیں، اور کون لوگ ان وسائل کو استعمال کر سکتے ہیں،

(۱)
قائدین جماعت کے خصائص

یہ ایک قانونِ فطرت ہے کہ جب حیوانات کے بعض افراد ایک جگہ جمع ہوتے ہیں تو حالتِ اجتماع میں ان کو ایک رئیس کی اطاعت اور فرمانبرداری کرنا پڑتی ہے،

لیکن (جیسا کہ صفحاتِ بالا میں گذر چکا ہے) انسانی جماعتیں محض چند افراد انسانی کے اجتماع ہی سے عبارت نہیں ہیں، بلکہ انسانی جماعتیں حیوانی جماعتوں کے خلاف اپنے بعض نفسانی خصوصیات بھی رکھتی ہیں جن کا ظہور انسانوں کے خیالات و افعال میں صرف اسی وقت ہوتا ہے، جب وہ حالتِ اجتماع میں آجاتے ہیں، اسوقت افراد انسانی ہمہ تن تقلید ہوتے ہیں، اور بہت جلد متاثر ہو جاتے ہیں، اب ان میں قوتِ فاعلی کی جگہ پر قوت انفعالی کا غلبہ ہوتا ہے، اور اب وہ اپنے اعمال و افعال سے یہ ظاہر کرنے لگتے ہیں، کہ گویا ان پر مسمریزم کا عمل کر دیا گیا ہے، اور جو حکم ان کو دیا جاتا ہے، اسکی تعمیل کے لئے ہمہ تن تیار ہو جاتے ہیں، غرض حالتِ اجتماع میں آکر افراد میں تمام وہ خصائص پیدا ہو جاتے ہیں، جو ان کو ہمہ تن کسی ارفع ذات کی محکومیت قبول کرنے پر مجبور کر دیتے ہیں، یہی ارفع ذات جو جماعت پر حکومت کرتی ہے، اس جماعت کی قائد رئیس، ہادی اور لیڈر کہلاتی ہے، یہ قائد اور لیڈر جماعت میں انتظام پیدا کرتا ہے، جماعت کے انفعال کی مطلق العنانی کیساتھ نگرانی کرتا ہے، اور جماعت کے قوائے عمل سے حسب موقع و محل اپنی مرضی کے مطابق جو چاہتا ہے کام لیتا ہے، گویا جماعت اسکے ہاتھ میں ایک آلۂ بیجان کی طرح ہوتی ہے، کہ یہ قائد اسے جدھر چاہتا ہے، پھیر تا ہے،

لیکن لیڈر کے لئے جو بات سب سے ضروری ہوتی ہے، وہ یہ ہے کہ قبل اسکے کہ قیادت کی مسند پر وہ اپنے لئے جگہ حاصل کرے، کچھ دنوں وہ جماعت کے دیگر افراد کیطرح مقتدیوں اور مقلدوں کی صف میں رہ کر دوسرے لیڈروں کی فرمانبرداری کرچکا ہو، یا جس خیال کی جانب اب وہ لوگوں کو بلا رہا ہے، وہ خود اس خیال کو اپنے ذہن و دماغ پر اسطرح مسلط کرچکا ہو کہ اب اس کے دماغ میں بجز اس ایک خیال کے جس کی وہ اشاعت کررہا ہے، کوئی اور خیال باقی نہ رہا ہو، اور اس خیال کے خلاف جتنے خیالات ہیں، وہ سب اسکو باطل اور وہم نظر آنے لگے ہوں، جب تک قائد اس رتبہ کو حاصل نہیں کرلیتا ہے، اسوقت تک اسمیں قیادت کی صلاحیت اور اہلیت نہیں پیدا ہوتی ہے، روسبیر نے جو انقلاب فرانس کا بانی تھا اپنے خیالات کی اشاعت جب شروع کی ہے، تو اس سے پہلے وہ خود اپنے تئیں روسو کے خیالات میں بالکل محو کرچکا تھا،

لیکن اپنے تئیں کسی خیال میں محو کردینے کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ قائد غور و فکر کے ذریعہ سے اپنے خیالات میں پختگی پیدا کرے، کیونکہ قائد کیلئے جس بات کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے، وہ غور و فکر کی عادت نہیں بلکہ عمل کی عادت ہے، اور اگر قائد بجائے عمل کے غور و فکر کی عادت ڈالے تو اس کے ذہن میں تشکیک پیدا ہونے لگیں، اسکے ارادہ میں تزلزل و رخنہ پیدا کردے، اور اس کا جوش سرد پڑ جائے، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ قائد اپنے اس خیال میں جسکی وہ اشاعت کررہا ہے، اسقدر پختہ ہوگیا ہو، کہ باوجود موانع اور مصائب کے حائل ہونے کے وہ ہر وقت اپنے خیال کی اشاعت اور اپنے مقصد کی دعوت میں سرگرم رہے دنیا کا خوف، حکومت کا ڈر، جان و مال کی محبت اعزہ و اقربا کی ملامت غرض دنیا کی کسی مصیبت کا خیال اسکو اپنے مقصد کی دعوت سے کسی وقت باز نہ رکھ سکے، حاصل یہ ہے

کہ قائد کیلئے کچھ یہ ضروری نہیں، کہ ذہن و ذکاوت میں کوئی اسکا ہمسر نہ ہو، بلکہ قائد کیلئے جس بات کی ضرورت ہوتی ہے، وہ یہ ہے کہ اس کا عزم اس قدر پختہ ہو کہ کوئی طاقت اسکے ارادہ کو اپنی جگہ سے ہلا نہ سکے، اور یہی وجہ ہوتی ہے، کہ قائدین جماعت عموماً ایسے افراد سے نکلتے ہیں جن کے اعصاب مریض اور جن کے قوائے عقلی مختل اور قریب بجنون ہوتے ہیں، اعصاب کی بے حسی ان کے جذبات کو مردہ کر دیتی ہے، اور قوائے عقلی کا اختلال ان کو غور و فکر کی اجازت نہیں دیتا، اور اسی وجہ سے ان کا اعتقاد اسقدر پختہ ہوتا ہے کہ کوئی دلیل نہ انکے خیال کو باطل کر سکتی ہے، اور نہ کوئی حجت ان کے خیال کو پلٹ سکتی ہے، تحقیر و تذلیل سے اثر پذیر ہونا تو در کنار، یہ باتیں اپنے خیال میں اور ان کو پختہ اور مضبوط کر دیتی ہیں، اپنے خیال کے دھن میں انکو نہ اپنی جان کی پروا رہتی ہے، نہ خاندان اور مال کی اور نہ وہ اپنی ان خدمتوں کے صلہ میں قوم سے کوئی اجر طلب کرتے ہیں، بلکہ الٹے وہ اپنے تئیں قوم پر سے نثار کر دیتے ہیں، اور ان کی قوتِ اعتقادی ان کے الفاظ میں حیرت انگیز اثر اور رعب پیدا کر دیتی ہے،

لیڈروں کے یہ اوصاف جن کا اوپر تذکرہ کیا گیا، اسقدر کمیاب اور نادر ہوتے ہیں کہ گو تاریخ دعوی کرتی ہے، کہ عموماً ہر قوم میں کسی نہ کسی وقت کوئی نہ کوئی قائد ضرور پیدا ہوا ہے لیکن نظرِ انصاف سے دیکھو تو بہت کم قائد ایسے نکلیں گے، جو واقع میں قیادت کی اہلیت رکھتے ہوں، بلکہ اسکے خلاف قائدین کی فہرست میں تمھیں ایسے لوگ بھی نظر پڑیں گے جو اپنے موثرانہ خطبوں اور اسپیچوں کے ذریعہ سے لوگوں کو مسحور کرتے تھے، اور اسکے بعد اپنے ذاتی اغراض لوگوں کو دھوکہ دے دے کر حاصل کرنا چاہتے تھے، اور گو ان کا نفوذ ان تدبیروں سے بڑھ جایا کرتا تھا، مگر آخر طمع کہانتک اصلی حقیقت کو

چھپا سکتا ہے کسی نہ کسی وقت ان کو ناکامی ہوتی تھی، ہاں البتہ وہ لوگ جو نفوسِ جماعت پر قابو پاکر جماعت کی تحریک کے باعث ہوئے ہیں، مثلاً سینٹ پطرس، لوتھر، سافونارول اور قائدین انقلابِ فرانس، یہ لوگ بھی نفوسِ جماعت کو اپنی جانب مائل کرنے میں اسوقت تک کامیاب نہ ہوئے تاوقتیکہ انھوں نے اپنے اپنے خیالات میں پختگی اور اپنے ارادہ میں استحکام نہ پیدا کر لیا، لیکن جب ایکمرتبہ ان کو کامیابی حاصل ہوگئی، تو پھر انھوں نے نفوسِ جماعت میں وہ زبردست اعتقاد پیدا کر دیا جس کے باعث انسان اپنے خیال کا غلام بن جاتا ہے،

پس قائدینِ جماعت کا وظیفۂ عمل صرف یہ ہوتا ہے، کہ وہ نفوس انسانی میں اعتقاد اور قوتِ ایمان پیدا کر دیتے ہیں، اور یہی بات ہے کہ قائدین کا اثر اپنی جماعتوں پر نہایت قوی ہوتا ہے، کیونکہ قوتِ ایمان ایک ایسی قوت ہے، کہ جس شخص میں پیدا ہو جاتی ہے، اسکی قوت میں دس گنا اضافہ ہو جاتا ہے، انجیل میں بہت صحیح آیا ہے، کہ قوتِ ایمانی پہاڑوں کو اپنی جگہ سے ہلا سکتی ہے، جو لوگ انقلاباتِ تاریخی کے باعث ہوئے ہیں، وہ چند بستلین اور ایماندار لوگ تھے، جنکی قوتِ ایمانی نہایت مضبوط و مستحکم تھی، یہ فلاسفہ کے بس کی بات نہیں کہ کسی ایسے مذہب کی ایجاد کریں جو لوگوں کے قلوب پر غلبہ حاصل کرلے یا ایسی بڑی بڑی حکومتوں کی بنیاد ڈالیں، جو دنیا کے اس کنارہ سے اس کنارہ تک پھیلی ہوئی ہیں لیکن یہ اوصاف جن کا اوپر تذکرہ کیا گیا، صرف قوموں کے ان بڑے بڑے لیڈروں اور رہنماؤں میں پائے جاتے ہیں، جو شاذونادر کبھی کبھی پردۂ وجود پر ظاہر ہوتے ہیں، لیکن ان کے بعد پھر ایسے لوگوں کا سلسلہ شروع ہوتا ہے، جو کسی قہوہ خانے میں کھڑے ہوکر چند ایسے جملوں کی تکرار شروع کر دیتے ہیں، جن کے معنوں سے وہ خود اگرچہ واقف

نہیں ہوتے لیکن اتنا جانتے ہیں، کہ اگر ان الفاظ اور جملوں کے مطابق عمل کیا گیا، تو انکی تمام امیدیں پوری ہو جائیں گی،

انسان کی حالت یہ ہے کہ جب وہ جماعت میں شامل ہوتا ہے تو اسے کسی نہ کسی لیڈر کی اطاعت کرنا پڑتی ہے، کیونکہ جماعت میں آکر افراد اس قابل نہیں رہتے کہ اپنے پیشہ یا کاروبار کے علاوہ کسی اور مسئلہ میں اپنی مستقل رائے قائم کریں، بلکہ طبقۂ عوام کے افراد کی حالت تو یہ ہوتی ہے، کہ جہاں اُنھوں نے اپنے پیشہ یا کاروبار سے فرصت پائی بس تمام افکار و خیالات اُن کے دماغ سے نکل گئے اور اب وہ اپنے لیڈر کے قبضہ میں ہیں، وہ ان کو جدھر چاہتا ہے، گھماتا ہے، اور یہ اسکی اطاعت کرتے ہیں، لیکن کبھی لیڈروں کے قائم مقام روزانہ اخبارات اور رسائل ہوا کرتے ہیں، جو روز مفید خیالات اور پُر اثر جملوں سے اپنے ناظرین کی ضیافت طبع کرتے اور رائے عام کی قیادت کا فرض انجام دیتے ہیں،

لیکن قائد کے اثر و نفوذ کے لئے ایک یہ شرط بھی لازمی ہے، کہ قائد مطلق العنان اور مجسمۂ استبداد ہو کر اور اسکی قوت و غلبہ کے سامنے جماعت سپر انداز ہو جائے، اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ کاروباری اور مزدوری پیشہ طبقہ بعض ایسے لیڈروں کے زیر فرمان ہوتا ہے، جنمیں گو کوئی خاص بات نہیں ہوتی، لیکن انکا استبداد اور انکا غلبہ لوگوں کو اسطرح مقہور کر لیتا ہے کہ یہ لیڈر اپنے ہم پیشہ طبقہ کے اوقات عمل کی تجدید کرتے ہیں، مناسب شرح اجرت مقرر کرتے ہیں، اسٹرائک اور شورشیں برپا کرا لتے ہیں، اور پھر ان شورشوں کو خود ہی فرو بھی کرا دیتے ہیں،

زمانۂ حال میں جب سے لوگوں کو حکومتوں کی کارروائیوں میں نکتہ چینی کرنے کی اجازت دیدی گئی ہے، اس وقت سے اس قسم کی شورش برپا کرنے والے لیڈر جو اپنی اپنی

جماعتوں میں ممتاز اور صاحبِ اثر ہوتے ہیں، اسقدر فرعون بے سامان ہو گئے ہیں کہ جماعتیں اب حکومت سے زیادہ ان لیڈروں سے ڈرتی اور حکومت سے زیادہ انکی اطاعت اور فرمانبرداری کرتی ہیں، یہانتک کہ اگر کسی اتفاقی حادثہ کے باعث کسی اسٹرائیک کرنے والی جماعت کا رئیس و قائد جماعت کی نظروں سے غائب ہو جاتا ہے، تو جماعت فوراً پراگندہ اور منتشر ہو جاتی ہے، کیونکہ اب اس جماعت کا وہ قائد ہی نہیں رہا، جو تمام تحریکات کا بانی تھا، پیرس میں ابھی کچھ عرصہ ہوا، ایک کمپنی کے مزدوروں نے اسٹرائیک برپا کی، اس تحریک کے سرغنہ دو شخص تھے، جب وہ دونوں گرفتار کر لئے گئے تو اسٹرائیک کا بھی خاتمہ ہو گیا، اس سے معلوم ہوا کہ نفوسِ جماعت میں جس قسم کے شعور کے پیدا کرنے کی ضرورت ہوتی ہے، وہ حریت اور آزادی کا حس نہیں، بلکہ اطاعت اور فرمانبرداری کا شعور ہے، اور جماعت فطری طور پر ہر اُس شخص کی فرمانبرداری کے لئے تیار رہتی ہے، جو اپنا اثر جماعت پر قائم کر لیتا ہے،

لیکن قائدینِ جماعت کی ہمیشہ دو ممتاز قسمیں ہوتی ہیں:-

۱- ایک قسم کے قائد وہ ہوتے ہیں جن کا ارادہ تو مضبوط اور مستحکم ہوتا ہے، لیکن جن کے ارادہ کی پختگی عارضی اور وقتی ہوتی ہے، یہ درجۂ دوم کے قائد ہیں، جو اکثر قوموں میں ظاہر ہوتے ہیں، یہ قائد خود بھی شجاع اور بہادر ہوتے ہیں، اور بزدلوں کو بھی شجاع بنا دیتے ہیں، فرانس میں نائی اور موراٹ ایسے ہی لوگ گذرے ہیں، اور ہمارے زمانہ میں گریبالڈی کس پایہ کا شجاع اور صاحب عزم ہوا ہے، کہ ایک تھوڑی سی جماعت کو ساتھ لیکر اس نے نیپلز کے صوبہ کو فتح کر لیا، حالانکہ اسکے مقابلہ پر جو فوج تھی، وہ تعداد اور خوش ترتیبی میں گریبالڈی کی فوج سے بدرجہا فائق تھی،

لیکن باوجودیکہ اس قسم کے قائدین کا عزم نہایت پختہ اور مضبوط ہوتا ہی، تاہم انکے مضبوط ارادوں میں اکثر اسوقت تزلزل واقع ہو جاتا ہے، جب اُن کا وہ مقصد جسکی خاطر اُنھوں نے اپنی زندگی کو وقف کردیا تھا، حاصل ہو گیا ہو، بلکہ اکثر ایسا ہوا ہی، کہ جب ان لیڈروں نے اپنی اصلی حالت کیجانب عود کیا ہی، تو وہ بالکل کمزور اور ضعیف الارادہ پائے گئے ہیں، یہی وجہ ہے کہ اس قسم کے قائدین اسوقت تک اپنے فرائض منصبی نہیں ادا کرسکتے تا وقتیکہ انکے اوپر بھی خود کوئی خاص خیال یا کوئی خاص طاقت مسلط نہ کردیگئی ہو،

۲- ان قائدین کے مقابل میں ایک دوسرا گروہ اور ہی، جن کا ارادہ درجۂ دوم کے قائدین کی طرح وقتی اور تغیر پذیر نہیں ہوتا، بلکہ یہ قائدین اپنی مضبوط قوتِ ارادی کے بل پر عظیم الشان سلطنتوں اور قوی الاثر مذاہب کی بنا ڈالتے ہیں، جن کا اثر و غلبہ ان قواد کے مرنے کے بعد بھی مدتوں قائم رہتا ہے، سینٹ پال[1]، محمد صلی اللہ علیہ وسلم، کریسٹاف، کولمبس، ڈو لیسپس اپنے اپنے زمانہ میں اسی طرح کے لوگ ہوئے ہیں، اس قسم کے قواد کی حالت یہ ہوتی ہی کہ خواہ ذہن و ذکاوت میں اپنے زمانہ کے لوگوں سے وہ کتنے ہی گرے ہوئے ہوں لیکن دنیا ہمیشہ انکے قبضہ میں رہتی ہی، کیونکہ مضبوط عزم ایک ایسا ملکہ ہی، جو اگرچہ نادر الوجود ہی، تاہم جس شخص میں پیدا ہو جاتا ہی، تمام دنیا اسکے قدموں پر گرپڑتی ہی، البتہ چونکہ لوگ اس بات سے واقف نہیں ہوتے کہ اس مضبوط عزم کے پردے میں کونسی طاقت پوشیدہ ہوتی ہی، اسلئے وہ ان قائدین کے کارنامے دیکھ دیکھ کر حیرت میں پڑجاتے ہیں،

---

[1] سینٹ پال، کولمبس، ڈو لیسپس گو اپنے زمانہ میں کتنے ہی نامور ہوئے ہوں لیکن ہم مسلمانوں کے عقیدہ میں کبھی ان ناموروں کو وہ رتبہ حاصل نہیں ہوسکتا، جو پیغمبر اسلام اور دیگر پیغمبران مذاہب کو حاصل ہی، (مترجم)

مضبوط ارادہ اور پختہ عزم کی اگر کوئی تازہ ترین مثال تلاش کرنا چاہو تو اس نامور شخص کے حالاتِ زندگی کا مطالعہ کرو جس نے اپنی ہمت اور ارادہ سے ایسا کام کر دکھایا جس کے آگے بڑے بڑے بادشاہوں کی ہمتیں پست ہو گئی تھیں مضبوط عزم اور پختہ ارادہ کی بدولت بعض اوقات جن خوارقِ عادت کا ظہور ہوتا ہے، ان کی ایک تازہ ترین مثال براعظم ایشیا اور براعظم افریقہ کے درمیان نہر سویز کے جاری کرنے کا واقعہ ہے، اس واقعہ کی تفصیل میں ڈاکٹر کزالیس کی زبانی ناظرین کو سناتا ہوں، ڈاکٹر کزالیس شروع سے آخر تک اس واقعہ میں شریک رہا ہے، اسکی زبان سے واقعات کی اصلی حقیقت کا خوب انکشاف ہو سکے گا، وہ لکھتا ہے :-

"ڈولیس کبھی کبھی مجھ سے افتتاحِ نہر سویز کے واقعات تفصیل کے ساتھ بیان کیا کرتا تھا، اس نے مجھ سے یہ تمام واقعات بیان کئے، کہ اس نے اپنی تجویز کو عملی جامہ پہنانے میں کتنی مصیبتیں برداشت کیں کیونکر اس نے محال کو ممکن کر دکھایا، اور کیونکر اس نے اس ناامیدی کا مقابلہ کیا، جو کبھی کبھی اس پر مستولی ہو جاتی تھی، وہ بیان کرتا تھا کہ اس تجویز کے خلاف انگلستان سے اکثر صدائیں بلند ہوا کرتی تھیں، فرانس اور مصر بالکل الگ اور خاموش تھے، مگر مصر کا فرانسیسی مشیرِ مال سب سے زیادہ اس تحریک کا مخالف تھا، یہانتک کہ جب اس نے دیکھا کہ مزدور اس کا کہنا نہیں مانتے تو اس نے پانی بند کر دیا، اور اس طرح اس نے مزدوروں کو اس بات پر مجبور کیا کہ وہ کام کرنے سے انکار کر دیں، ان تمام مخالفانہ صداؤں اور شور و غل کے علاوہ فرانسیسی وزیر جنگ اور تمام انجینیروں اور تمام باخبر اور اہلِ علم لوگوں کو یقین تھا، کہ ناکامی لازمی اور حتمی ہے، یہانتک کہ ناکامی کے متعلق

اکثر پیشینگوئیاں بھی کی گئیں لیکن آخرکار دنیا نے دیکھ لیا، کہ جس تجویز کے متعلق تمام دنیا نے ناممکن ہونے کا فیصلہ کردیا تھا، اسکو عملی جامہ کس طرح پہنایا گیا۔"

غرض مختصر یہ کہ صفحاتِ تاریخ میں درجۂ اول کے قائدین کی فہرست اگر تلاش کیجائے اور اُن قائدین کے اسماء ڈھونڈھے جائیں، جنکا عزم وارادہ غیر متزلزل و محکم ہوا ہی، توشاید قائدین کی فہرست میں اس قسم کے اسماء تو کم نکلیں گے، لیکن ان کمیاب ونادر الظہور افراد کا وصفِ امتیازی جو صفحاتِ تاریخ میں نمایاں رہا ہے، یہ ہے کہ ان قوادنے ہمیشہ ادوارِ تاریخ میں ایک نیا انقلاب پیدا کردیا ہی،

(۲)

لیڈروں کے وسائلِ تاثیر وعمل

قائدین جماعت جن کے خصائص کا اوپر تذکرہ گذر چکا نفوسِ جماعت میں جن تدابیر اور ذرائع سے تحریک و اثر پیدا کرتے ہیں، ان میں سے ایک ذریعہ تمثیل بیانی ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ قائدین ہمیشہ اپنے اُس خیال یا اُس مقصد کو جسکی وہ اشاعت کررہے ہیں یا جس کے حاصل کرنے کے لئے وہ قوم کو آمادہ کررہے ہیں، کچھ اس طرح مبالغہ کا رنگ چڑھاکر خطیبانہ اور موثرانہ انداز میں جماعت کے سامنے پیش کرتے ہیں، کہ جماعت صرف ان کے بیان کو سنکر فوراً آمادۂ عمل ہوجاتی ہی، لیکن عموماً یہ سب تدبیریں صرف اسیوقت کارگر ہوتی ہیں، جب پہلے سے موثراتِ بعیدہ نے نفوسِ جماعت میں اثر پذیری کی صلاحیت پیدا کردی ہو، نیز قائد جو جماعت کو مخاطب کررہا ہی، صاحبِ نفوذ بھی ہو، لیکن بعض اوقات قائدین کی غرض یہ نہیں معلوم ہوتی کہ نفوسِ جماعت میں کوئی

تحریک پیدا کیجائے، یا جماعت کو کسی کام کے لئے آمادہ کیا جائے، بلکہ بعض اوقات لیڈروں کی صرف یہ غرض ہوتی ہے کہ کسی خاص عقیدہ یا خاص خیال کی دجو لیڈر کے ذہن میں پیدا ہوا ہی) جماعت میں بھی اشاعت کیجائے، اس وقت عموماً قائدین ذریعۂ بالا کے علاوہ بعض دوسرے ذرائع بھی استعمال کرتے ہیں، اور وہ ذرائع حسب ذیل ہیں :-

۱۔ تاکید یعنی کسی بات کو ادعا و تحکم کے ساتھ ادا کرنا،

۲۔ تکرار یعنی ایک ہی خیال کی بار بار تکرار کرنا،

۳۔ تعدیۂ اثر، یعنی اس بات کی کوشش کرنا، کہ جو اثر کسی ایک فرد جماعت پر ہوا ہے، اس سے سارا مجمع متاثر ہو جائے،

مدعیانہ و محکمانہ انداز بیان جو شک و تذبذب کے الفاظ اور عقلی دلائل و براہین سے بالکل پاک و صاف ہو، جماعت پر بہت جلد اس کا گہرا اثر ہوتا ہی، اور متکلم جن خیالات کا اظہار اس انداز میں کرتا ہی، سامعین اثر پذیر ہو کر فوراً اُن خیالات کو تسلیم کر لیتے ہیں، متکلم اپنے خیالات کے اظہار میں شک و تذبذب اور عقلی دلائل و براہین سے جسقدر زیادہ گریز کریگا، اسیقدر اسکے کلام کا سامعین پر زیادہ اثر پڑیگا، مدعیانہ انداز بیان کی یہی شدت تاثیر ہے جس سے دنیا کے بڑے بڑے بانیانِ مذاہب اور بڑے بڑے سیاست داں ہمیشہ واقف ہوتے ہیں، اور یہی وجہ ہی کہ مذہبی کتابوں اور قانونی تعزیرات میں اسی طرز ادا کا ہمیشہ خیال رکھا جاتا ہی، اسی طرح اہلِ سیاست جب قوم کو کسی بات کیلئے برانگیختہ کرنا چاہتے ہیں، یا صنعت پیشہ لوگ جب اپنی صنعت کو رواج دینا چاہتے ہیں تو اسی مدعیانہ انداز بیان کے ذریعہ سے اپنی غرض حاصل کرتے ہیں،

لیکن ادعا و تحکم کی قوت بھی نامکمل اور ادھوری رہتی ہی، تا وقتیکہ اسے ایک دوسری

طاقت سے تقویت نہ پہنچائی جائے، جس کا نام تکرار ہے، میرا خیال ہے کہ شاید نپولین کا یہ مقولہ ہے کہ خطابیات کے اسلحہ خانہ میں سب سے زیادہ کارگر حربہ تکرار ہے، تکرار کی قوت اسقدر زبردست ہے کہ کوئی شئے تنہا اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی، لیکن تکرار کے لئے صرف یہی بات کافی نہیں ہوتی، کہ مختلف الفاظ اور مختلف اسالیب سے متکلم ایک ہی دعوی کی بار بار تکرار کرتا رہے، بلکہ تکرار معنوی کیساتھ یہ بھی ضروری ہے، کہ جہانتک ممکن ہو ایک مفہوم کو ایک ہی عبارت سے بار بار دہراتے رہنا چاہیئے، تجربہ بتاتا ہے کہ معمولی سے معمولی بیانات جو اپنے اندر ادعا و تحکم کی کوئی خاص قوت نہیں رکھتے، اگر ایک ہی عبارت سے انکی بار بار تکرار کیجاتی ہے تو بالآخر دل میں وہ گھر پیدا ہی کر لیتے ہیں،

تکرار کا جماعتوں پر جس قدر گہرا اثر ہوتا ہے، اس کا اندازہ صرف اسی ایک بات سے ہو سکتا ہے، کہ بڑے بڑے ذی عقل و فہم افراد بھی اس سے متاثر ہوتے ہیں، پھر یہ ظاہر ہے کہ جماعت جو عقلی اور ذہنی خصوصیات میں افراد سے گری ہوئی ہوتی ہے، اس پر کہانتک تکرار کا اثر نہ ہوگا، تکرار کی اس عظیم الشان طاقت کا راز یہ ہے کہ مکرر بیانات رفتہ رفتہ ہمارے نفوس کے اُن غیر شعوری حصوں کے اندر پیوست ہو جاتے ہیں، جو ہمارے محرکات افعال کا اصلی منبع ہوتے ہیں، پھر کچھ عرصہ کے بعد ہم یہ بھول جاتے ہیں، کہ ان بیانات اور اطلاعات کا اول ماخذ کیا تھا، لیکن ان سے ہمارے نفس میں یقین کی کیفیت جو پیدا ہو گئی تھی، وہ قائم رہجاتی ہے، اشتہارات کی زبردست تاثیر کا باعث بھی یہی ہے، فرض کرو کہ ہماری نظر سے سینکڑوں ہزاروں مرتبہ یہ اشتہار گذرا کہ زید کی دوکان کی مٹھائیاں نہایت خوش ذائقہ ہوتی ہیں، یہ اشتہار دیکھکر ہمارے ذہن کو رفتہ رفتہ اس دعوی کا یقین تو ہو جائیگا، مگر ہم یہ بھول جائیں گے کہ یہ یقین پیدا کس ذریعہ سے ہوا، یا فرض کرو کہ ہمنے صدہا مرتبہ یہ اعلان پڑھا ہے

کہ عمرو کی دوائیں تیر بہدف اور نہایت مجرب اور زود اثر ہوتی ہیں، تو اب جب ہم خود کسی مرض میں مبتلا ہوں گے تو ہمکو طبعاً یہ خواہش پیدا ہوگی کہ کم از کم ان کی آزمائش ہی کریں، یا اگر ہم کسی اخبار میں ہر روز پڑھتے رہیں کہ الف ایک یانتدار اور پڑھا لکھا شخص ہے اور ب ایک بدمعاش اور جاہل ہے، تو ہمیں اس بیان پر پورا اعتماد و وثوق ہوجاتا ہے، اور یہ خیال اُس وقت تک ہمارے دل سے نہیں نکلتا، تاوقتیکہ ہماری نظر سے اس بیان کی تردید کہیں نہیں گذرتی، غرض مختصر یہ کہ ادعاو تکرار ایسی زبردست طاقتیں ہیں، جو خود ہی اپنا جواب ہوسکتی ہیں،

پھر جب تحکمانہ انداز بیان کیساتھ کسی مفہوم کی لفظی و معنوی تکرار کرنے سے کوئی خیال نفوسِ جماعت میں پیوست ہوجاتا ہے، تو یہاں سے اب ایک دوسرے موثر معنی سریانِ تاثیر کا عمل شروع ہوتا ہے، سریانِ تاثیر کے اثرات اسقدر واضح ہیں، کہ کسی تصریح کی حاجت نہیں، اصل میں سریانِ تاثیر دوسرے لفظوں میں نام ہے محاکات و اثر پذیری کا، اور محاکات اور اثر پذیری کی قابلیت حیوانات کی ہر صنف کے خمیر میں داخل ہے، اور انسان سے اتر کر حیوانات میں بھی یہ قابلیت اور استعداد موجود ہے، دیکھو اگر گلہ کی ایک بکری گلہ سے نکلنے کی کوشش کرتی ہے تو پورے گلہ کی بکریاں اسکی تقلید کرتی ہیں، اسیطرح انسان کی زندگی کا بھی ایک ایک لمحہ اثر پذیری و محاکات کے نذر ہوتا ہے، اور حیوانات کی طرح انسان کی زندگی کا بھی دار و مدار محاکات و تقلید ہی پر ہے، ہم اگر کسی وقت انگڑائی لیتے ہیں، تو ہمیں دیکھکر ہمارے سامنے بیٹھا ہوا شخص بھی انگڑائی لینے لگتا ہے، ہم اگر روتے ہیں تو ہمیں دیکھ کر ہمارے ہمنشیں احباب کی آنکھوں سے بھی آنسو نکل پڑتے ہیں، پھر جس طرح ہماری زندگی کے جسمانی شعبوں پر محاکات و تقلید کا اثر غالب ہے، اسی طرح ہماری حیاتِ نفسی کی بھی تکوین محاکات و تقلید ہی کے مظاہر سے

ہوتی ہی خصوصاً ہمارے نفسِ اجتماعی کی تو یہ ایک خصوصیت ہی کہ خیالات، جذبات، اعتقادات اور احساسات ومشاعر میں سے ہر ایک اگر کسی جماعت کے بعض افراد کی تہیج وتحریک کا باعث ہوتا ہی، تو اس اثر سے جماعت کے کل افراد ایک دم متاثر ہو جاتے ہیں، اگر جماعت میں سے کسی ایک شخص کو کسی بات سے خوف پیدا ہوتا ہی، تو یہ خوف جماعت کے تمام افراد کے دلوں میں پیدا ہو جاتا ہے، یہانتک کہ اکثر ایسا بھی ہوا ہی کہ چند مجانین جن اطبا کے زیرِ علاج تھے، وہ اطبا ان مریضوں کے اثر سے خود مرضِ جنون میں مبتلا ہو گئے، اسی طرح بعض اطبائنے ایک قسم کے جنون کی تحقیق کی ہی جسکا اثر انسان سے حیوانات کے جانب متعدی ہوتا ہی،

لیکن سریان کیلئے یہ کچھ ضروری نہیں ہی، کہ بہت سے افراد ایک جگہ اکٹھا ہوں، بلکہ اکثر یہ بھی ہوتا ہے کہ ایک ایسا واقعہ جس کا تعلق مختلف ممالک کے باشندوں سے ہوتا ہی اس کے اثر سے ان مختلف ممالک کے باشندے ایک ہی وقت میں یکساں متاثر ہوتے ہیں، اور خصوصاً یہ اثر اُس وقت ان مختلف ممالک کے باشندوں پر زیادہ ہوتا ہی، جب یہ تمام باشندے اُن مختلف عواملِ بعیدہ کی تاثیرات کے تحت میں (جنکا ذکر اوپر گذر چکا ہی) اس واقعہ سے اثر پذیر ہونیکے لئے پہلے سے مستعد ہوتے ہیں، ۱۸۴۸ء میں جو شورش برپا ہوئی تھی اسکی ابتدا تو اگرچہ پیرس سے ہوئی، لیکن تھوڑے عرصہ کے اندر تمام یورپ میں اسکے شعلے بھڑک اٹھے،

سریانِ تاثیر، تقلید ومحاکات کا ایک شعبہ ہے، اور تقلید ومحاکات ہی کے مظاہر سے ہماری معاشرتی اور اجتماعی زندگی کی تکوین ہوتی ہی، بلکہ ہماری معاشرتی زندگی تمامتر موقوف ہوتی ہے محاکات وتقلید پر، اسلئے نفسِ اجتماعی کی یہ خصوصیت اسکے تمام خصوصیات پر حاوی رہتی ہی، اور نظامِ اجتماعی کی کوئی کل بغیر محاکات وتقلید کے کبھی درست نہیں رہ سکتی، میں نے انسان کی اس فطری خصوصیت پر تفصیل کیساتھ اپنی دوسری کتاب میں بحث

کی ہی، اس موقع پر اس کے چند اقتباسات امید ہی کہ ناظرین کے لئے مفید ہونگے،

"حیوانات کی طرح انسان بھی بالطبع تقلید پسند واقع ہوا ہی، تقلید ضروریات انسانی میں داخل ہی، اور یہی ضرورت ہی جس کی بنا پر لوگ نہ صرف خیالات میں، نہ صرف ادنیٰ قابلیتوں کی نمایش کے موقع پر اور نہ صرف اپنی اپنی ذاتی رایوں میں، بلکہ اپنے لباس، اپنے ضروریات زندگی اور اپنے طرز بود و باش میں بھی ایک دوسرے کی تقلید کرتے ہیں، کوئی مدلل دعویٰ، کوئی قیاسی یا استقرائی نتیجہ انسان کو کسی فعل کے کرنے یا نہ کرنے کی رغبت دلانے میں اتنا کامیاب نہیں ہو سکتا، جتنا ایک زندہ نمونہ کامیاب ہوتا ہی، اور اگرچہ ہر زمانہ میں کچھ ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جو نئی نئی باتیں ایجاد کرتے ہیں، اور کسی کی تقلید نہیں کرتے، لیکن اگر انکی یہ ایجاد عام طبائع کے موافق نہیں ہوتی تو انکی ایجاد کسی کو اپنی جانب مائل نہیں کر سکتی ہی، یہی سبب ہی کہ جو لوگ اپنے ابنائے عصر سے عقلی اور ذہنی خصوصیتوں میں برتر اور فائق ہوتے ہیں، گو وہ کسی کی تقلید نہیں کرتے لیکن ان کا اثر بھی کسی پر نہیں پڑتا، اور پھر یہی وجہ ہے کہ یورپ کے باشندے تہذیب و تمدن میں گو مشرقی باشندوں سے فائق ہوتے ہیں، لیکن مشرقی باشندہ ایک مغربی باشندے سے بہت کم اثر پذیر ہوتا ہی،

غرض ماضی کی تاثیرات، اور زمانہ حال کی نقالی، ان دونوں کا دوہرا اثر ایک ملک بلکہ ایک زمانہ کے تمام آدمیوں پر اتنا گہرا ہوتا ہے کہ گو دنیا کے فلسفی اور عقلمند لوگ ہمیشہ اس بلائے عام، محاکات و تقلید کے اثر سے بچنے کی کوشش کرتے ہیں، لیکن باوجود اس کے ان کے طرز انشا اور رفتار خیالات سے انکی تصنیفات کے ہر دیکھنے والے کو اول نظر میں یہ پتہ چل جاتا ہے کہ یہ مصنف کس زمانہ کا ہے؟ اس کا

کیا پیشہ تھا؟ اس کے کیا خیالات تھے؟ غرض یہ اثر اتنا قوی ہوتا ہے، کہ فلاسفہ کی تصنیفات میں بھی اس کا اثر بہت نمایاں اور کھلا ہوا ہوتا ہے۔[1]

پھر انسان کی اس جبلت محاکات اور تقلید کا اثر صرف اسی حد تک محدود نہیں ہوتا کہ لوگ محض خیالات و عقائد میں ایک دوسرے کی نقل کرتے، اور ایک دوسرے سے اثر پذیر ہوتے ہوں، بلکہ خیالات اور عقائد کے حدود سے گذر کر اس کا اثر لوگوں کے جذبات پر بھی پڑتا ہے، لوگ اپنے جذبات میں بھی ایک دوسرے کی اسیقدر نقل اتارتے ہیں جتنی خیالات و عقائد میں، اور یہی وجہ ہے کہ بعض اوقات اگر کسی شے سے کسی ایک فرد کو نفرت پیدا ہوتی ہے تو اسکے دیکھا دیکھی ایک زمانہ اس سے نفرت کا اظہار کرنے لگتا ہے یا اسی طرح جب کسی شے کیجانب کسی ایک شخص کو رغبت پیدا ہوتی ہے، تو اس کے دیکھا دیکھی، اور لوگ بھی اسکی تقلید میں اس شے کو عزیز رکھنے لگتے ہیں،

سریانِ تاثیر، محاکات و تقلید کے اثرات انسان کی معاشرتی حیات پر اس قدر حاوی ہیں کہ کسی خیال اور کسی رائے کی اشاعت بجز اس کے کسی اور طرح ہو بھی نہیں سکتی، کہ اس خیال کی بار بار تکرار کر کے ہر ہر فرد جماعت کے ذہن میں اسکو خوب پیوست کر دیا جائے، ہر زمانہ میں جب کسی خیال کی اشاعت ہوئی ہے تو اسی طرح کہ قہوہ خانوں اور گپ خانوں میں جہاں ہر طبقہ کے لوگوں کا مجمع ہوتا ہے، وہ خیال پھیلنا شروع ہوا اور اس کے بعد رفتہ رفتہ اس کا دائرۂ اشاعت وسیع ہوتا گیا، رینان نے جو انیسویں صدی کا ایک مشہور فرنچ مصنف گذرا ہے کیا خوب کہا ہے، کہ "مذہب عیسائیت کی اشاعت کی ابتدا اپنجانوں اور شرابخانوں سے ہوئی ہے"، والٹر کہتا ہے کہ تقریباً ایک صدی تک

---

[1] دیکھو کتاب "انسان اور ہیئت اجتماعی" جلد دوم صہ ۱۱۲ مصنفہ لیبان مطبوعہ ۱۸۸۱ء۔

مسیحیت کی اشاعت صرف طبقۂ ادنی تک محدود تھی "

پس گذشتہ بیانات سے معلوم ہوا کہ سریانِ تاثیر اور محاکات و تقلید کا اثر سب سے پہلے قوموں کے طبقۂ ادنی میں ظاہر ہوتا ہے، اور جب ان تاثیرات کی بدولت طبقۂ ادنی کے ذہن میں اس خیال کی اچھی طرح اشاعت ہو جاتی ہے، تو اسوقت یہ اثر ترقی کر کے طبقۂ ادنی سے قوم کے طبقۂ اعلیٰ تک جا پہنچتا ہے. زمانۂ حال میں مذہبِ اشتراکیت کی اشاعت بھی اسی طرح ہو رہی ہے، کہ سب سے پہلے ان خیالات نے ان لوگوں کو اپنے اثر سے متاثر کیا جو مزدوری پیشہ تھے، اور جن کا شمار قوموں کے ادنیٰ طبقہ میں ہوتا تھا، اسکے بعد پھر جب ان لوگوں میں اس مذہب کی اچھی طرح اشاعت ہو چکی، تو اسوقت اس کا اثر متعدی ہو کر قوموں کے دوسرے طبقوں تک بھی پہنچ گیا،

یہی بات ہے کہ جب کوئی خیال طبقہ ادنیٰ میں اشاعت پذیر ہوتا ہے، تو اسکا اثر قوم کے اعلیٰ طبقہ تک بھی ضرور پہنچتا ہے، پس یہ ایک تعجب انگیز اور حیرتناک واقعہ ہے کہ عموماً جن خیالات کی قوموں میں اشاعت ہوتی ہے، ان کی تخم ریزی فلسفیانہ رنگ میں سب سے پہلے قوم کے اعلیٰ طبقہ کے دماغوں میں ہوتی ہے، اور ایک مدت تک یہ تخم ان دماغوں کے اندر پختگی اور قوت حاصل کرتا رہتا ہے، پھر ایک مدت کے بعد کوئی انقلاب انگیز دماغ والا شخص جس میں قیادت کی اہلیت پائی جاتی ہو، اس خیال کو منتخب کرتا ہے، اور اپنے دماغ میں اس کو خوب پکاتا ہے، اور جب یہ خیال اسکے دماغ میں پختگی حاصل کر لیتا ہے تو ایک دم کسی تحریک کی صورت میں اسکی شاخیں پھوٹ نکلتی ہیں، کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو ابتدائی منازل میں اس تحریک کو تسلیم کر لیتے ہیں، یہانتک کہ اب رفتہ رفتہ ترقی کرتے کرتے اس خیال کی اشاعت قوم کے اس اعلیٰ طبقہ تک بھی ہو جاتی ہے، جہاں

پہلے اسکی تخم ریزی کی گئی تھی، غرض دنیا پر گو ہمیشہ عقل اور فلاسفہ ہی کی حکومت رہی ہے لیکن کبھی فلاسفہ عملی رزمگاہ میں بے نقاب ہو کر سامنے نہیں آئے ہیں، علماء اور فلاسفہ خیالات کی تخم ریزی کر کے پیوندِ زمین ہو جاتے ہیں، لیکن ایک مدت کے بعد یہ فنا شدہ آوازیں ان مردوں کی قبروں سے نکل نکل کر عملی رنگ میں حیاتِ جاودانی حاصل کرتی ہیں،

(۳)

نفوذ

لیکن جس خیال کو ادعا و تحکم اور تکرار لفظی و معنوی کیساتھ جماعت کے سامنے ظاہر کیا جاتا ہے، اس کا اثر جماعت پر اسوقت اور زیادہ بڑھ جاتا ہے، جب اس طرزِ بیان کو متکلم کی ذاتی سطوت و نفوذ سے تقویت پہنچ جاتی ہے،

دنیا میں جب کبھی کسی شخص یا کسی عقیدہ کی اثر کو غلبہ ہوا ہے، تو عموماً قوتِ نفوذ ہی کی بدولت یہ غلبہ ظہور میں آیا ہے، سطوت و نفوذ کے لفظی معنی گو عام طور پر معروف ہیں لیکن جن صورتوں میں نفوذ کا ظہور ہوتا ہے، وہ باہم اسقدر مختلف ہیں کہ ان سب کی کوئی منطقی تحدید نہیں کیجا سکتی، قلوبِ انسانی پر جو نفوذ کسی ذات کا مستولی ہوتا ہے اسکی بناء عام طور پر حیرت و استعجاب اور خوف کے جذبات ہوا کرتے ہیں، یعنی یہ کہ اُس ذات میں کوئی قوتِ تسخیر ایسی پائی جاتی ہے جس سے لوگوں کے دلوں پر دہشت طاری ہوتی ہے، یا جس کے سبب سے لوگ اُس ذات کو اپنے سے مافوق تصور کرنے لگتے ہیں اور اسی دہشت و استعجاب کی بناء پر اس کا نفوذ قائم ہو جاتا ہے لیکن سب میں کامل اور دیرپا وہ نفوذ ہوتا ہے، جو بلا ان جذبات کے پیدا ہوتا ہے، جو لوگ فنا ہو گئے ہیں، اب مرنے کے بعد اُن سے خوف و دہشت کرنی کیا بات ہے لیکن باوجود اسکے جنلوگوں کا نفوذ اب تک ہم پر مسلّط ہے، وہ یہی لوگ ہیں، جو پیوندِ زمین ہو گئے ہیں اور اپنی قبروں کے اندر سے

ہمارے اوپر حکومت کر رہے ہیں، سکندر، قیصر، محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اور بدھ وغیرہ ایسے عظمائے رجال ہیں جن کی دیرپا سطوت کی شہادت ان کے پیرووں کی کثرت دے رہی ہے، اسیطرح بعض اوقات بعض اُن ہستیوں کا بھی نفوذ قائم ہو جاتا ہے، جو گو اپنے اندر کوئی حیرت انگیز بات نہیں رکھتیں لیکن قوموں پر انکا گہرا اثر مدتوں قائم رہتا ہے، مثلاً مختلف بت پرست اقوام کے دیوتا وغیرہ،

البتہ سطوت و نفوذ کی اگر کوئی تعریف کیجا سکتی ہے، تو وہ یہ ہے کہ سطوت و نفوذ کسی خیال یا کسی انسان کے اُس غلبہ و اثر سے عبارت ہے، جو کبھی قلوبِ انسانی پر مستولی ہو جاتا ہے، اور جس کے استیلا کے باعث نفس میں ایک دہشت و مرعوبیت کی کیفیت پیدا ہوتی ہے، اور جو ہماری ناقدانہ قوت کے استیصال کا باعث ہوتا ہے، سطوت و نفوذ کے باعث یہ کیفیت قلوبِ انسانی میں جو پیدا ہوتی ہے، اسکی تعریف بھی گو ناممکن ہے، لیکن اتنا ضرور ہے کہ یہ کیفیت بھی اسی قسم کی کیفیت ہوتی ہے، جو مسمریزم کے معمول پر طاری ہوتی ہے،

سطوت و نفوذ کی دو قسمیں ہیں:-

۱۔ "نفوذ مکتسب" وہ نفوذ ہے، جو کسی شخص کی ثروت یا شہرت کے باعث پیدا ہوتا ہے،

۲۔ "نفوذ شخصی" وہ نفوذ ہے، جو خود اس شخص کی ذات کے ساتھ قائم ہوتا ہے، اسکے لئے شہرت و ثروت وغیرہ کی حاجت نہیں ہوتی، پہلی قسم کا نفوذ اکتسابی ہوتا ہے جو سعی و جہد و جد و جہد کے ذریعہ سے اکثر لوگوں کو حاصل ہو جاتا ہے، لیکن دوسری قسم کا نفوذ وہبی اور فطری ہوتا ہے، جس میں اکتساب و سعی کو دخل نہیں ہوتا،

لیکن ان دونوں میں جو نفوذ سب سے زیادہ شائع ہے، وہ پہلی قسم کا نفوذ مکتسب ہے، یہ نفوذ اکثر اُن لوگوں کو حاصل ہوتا ہے، جو کسی خاص عہدہ پر متمکن ہوتے ہیں، یا جو صاحبِ ثروت

یا خطاب یافتہ ہوتے ہیں، علمائے شریعت عبا و عمامہ کے ساتھ وکلا و حکام اپنے گون (جبہ) کیساتھ، پولیس کے سپاہی اپنی وردیوں کیساتھ، یونیورسٹی کے سندیافتہ اپنی مخصوص پوشاکوں کیساتھ بہ نسبت اپنے معمولی و سادہ لباس کے زیادہ رعب و سطوت رکھتے ہیں، تاج و کلغی تمغہ و نشان، یونیورسٹی کی ڈگریاں، خطابات و اعزازات، دولت و حکومت، شہرت، علم و فضل غرض ہر ایسی شے جو عام شاہراہ سے ایک ممتاز حیثیت رکھتی ہو، کم و بیش افزائش نفوذ کا آلہ بن سکتی ہے، یہی وجہ ہے کہ زمانۂ حال میں قاضیوں اور وکیلوں کیلئے جبوں کی اہمیت پر زیادہ زور دیا گیا ہے، کیونکہ بغیر جبوں کے ان کا نفوذ آدھا رہ جاتا ہے۔

لہ خطابات اور تمغوں کی جو تاثیر نفوس جماعت میں ہوتی ہے، وہ ہر ملک میں مسلم ہے حتی کہ ان ممالک میں بھی جہاں افراد کو حریت و استقلال حاصل ہے، ایک سیاح نے انگلینڈ کے بعض معتدر اصحاب کی چشم دید حالت اپنے سفر نامہ میں تحریر کی ہے، میں یہاں اسکے چند اقتباسات درج کرتا ہوں، وہ لکھتا ہے:-

"میں نے اکثر انگلستان میں دیکھا ہے، کہ جو لوگ بیرونٹ یا سر کے خطابوں سے اعزاز یافتہ ہوتے ہیں، وہ اگر کسی کے پاس بیٹھ جاتے ہیں تو یہ اُس شخص کے لئے فخر کی بات سمجھی جاتی ہے، اور اگر یہ خطاب یافتہ لوگ خطاب کے ساتھ دولت مند بھی ہوتے ہیں تو لوگ ان سے ملاقات کرنے کے قبل ہی سے ان کی عزت کرنے لگتے ہیں، اور جب اُن سے ملاقات ہوتی ہے، تو لوگ ان سے بہت خوشی خوشی ملتے ہیں اور اگر کہیں انھوں نے کسی سے بات چیت کر لی، تب تو وہ شخص بھولا نہیں سماتا جسطرح اسپین کے باشندے رقص و سرود کے اور جرمنی کے باشندے موسیقی کے اور فرانس کے لوگ انقلاب اور شورش کے شوقین ہوتے ہیں، اسی طرح انگریز بڑے بڑے خطاب یافتہ امراء کے شیدائی ہوتے ہیں"

اس قسم کا نفوذ گو صرف انسان کے ساتھ خاص ہوتا ہے، لیکن انسان کے علاوہ افکار وخیالات اور آراء و نظریات کا بھی ایک نفوذ ہوتا ہے، جو اکثر حالتوں میں تکرار سے پیدا ہوتا ہے، تاریخی کتابوں بالخصوص علوم و فنون کی تاریخوں کی قدر و قیمت بجز اسکے اور کیا ہے کہ وہ چند آراء و خیالات کا مجموعہ ہیں، جنکو مکرر سہ کرر مختلف مصنفین بلا حذف و تغیر مختلف اوقات میں دوہراتے رہے ہیں، اور اب تکرار کرتے کرتے حالت یہ ہو گئی ہے کہ ہر شخص وہی کہنے لگا، جسکی تعلیم اُس نے اسکول یا مدرسہ میں پائی ہے، ہومر کے مطالعہ سے گو رنج و غم کے جذبات پیدا ہوتے ہیں، مگر کوئی شخص ان واقعات کی تکذیب نہیں کرتا، بات یہ ہے کہ سطوت و نفوذ کی ممتاز خصوصیت ہی یہ ہے کہ وہ انسان کی قوتِ فیصلہ و قوتِ تنقید کو فنا کر دے، اور چونکہ جماعت اور افراد دونوں کو تمام مباحث میں مختتم اور فیصلہ کن رایوں کی ہمیشہ حاجت رہتی ہے، اسلئے جب کسی رائے یا کسی کی اشاعت ہوتی ہے، تو اسوقت کسی شخص کے ذہن میں یہ شبہہ نہیں گذرتا، کہ یہ رائے اور خیال واقع میں صحیح ہے یا غلط، بلکہ لوگ ہمیشہ اسی رائے اور خیال کو تسلیم کر لیتے ہیں، جس کا سب سے زیادہ نفوذ ہوتا ہے،

اب ہم نفوذِ مکتسب سے بحث کرنے کے بعد نفوذ کی دوسری قسم نفوذِ شخصی یا النفوذ وہبی سے بحث شروع کرتے ہیں، نفوذ شخصی یا النفوذ وہبی کو نہ عہدوں کی حاجت ہوتی ہے نہ خطابات کی، اور نہ دولت و ثروت کی، بلکہ یہ نفوذ جن لوگوں کو حاصل ہوتا ہے، انکی قدر و منزلت بھی انکے ہمچشموں سے کچھ ایسی زیادہ نہیں ہوتی، لیکن باوجود اس کے انکے پاس کچھ ایسے وسائل ہوتے ہیں، اور کچھ ایسی قوتِ مقناطیسی ان میں پائی جاتی ہے کہ یہ لوگ اپنے ذاتی غلبہ کے بل پر اپنے خیالات کو ذہنوں میں راسخ کر دیتے ہیں، اور لوگ انکی اسیطرح اطاعت و فرمانبرداری کرتے ہیں، جس طرح حیوانات اپنے مالک کے مطیع ہوتے ہیں، اس قسم کا فطری

اور وہی نفوذ قوموں کے اُن تمام اعاظمِ رجال کو حاصل ہوتا ہے، جنھوں نے اپنے کارناموں سے دنیا پر اپنی دھاک بٹھادی ہے، اور ہمیشہ اس قسم کے نفوذ کی بدولت دنیا پر یہ لوگ قہر و غلبہ حاصل کرتے ہیں، بدھ، حضرت عیسیٰؑ، حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم، جان آف آرک اور نپولین دنیا میں اسی قسم کے لوگ ہوئے ہیں،

دنیا میں جو صاحبِ نفوذ ہستیاں گذری ہیں، انکی حالت یہ ہوتی ہے کہ گو انکے کارناموں سے ان کا نفوذ بڑھ جایا کرتا ہے، لیکن انکی ذاتی سطوت اور انکا شخصی نفوذ کبھی ان خارجی مؤیدات کا زیر بارِ احسان نہیں ہوتا، بلکہ ان کی شہرت کے پیشتر ہی سے انمیں ایک ایسی طاقت پائی جاتی ہے، جو لوگوں کو اپنی جانب کھینچ لیا کرتی ہے، نپولین کو دیکھو کہ جب اُس نے فوجی ترقیاں حاصل کی ہیں تو اُسکے پیشتر ہی سے اس کا نفوذ لوگوں پر قائم ہو چکا تھا، جس وقت وہ نہ شہنشاہ نپولین تھا اور نہ کوئی فاتحِ اعظم، بلکہ محض ایک معمولی رتبہ کا فوجی افسر تھا، اسی وقت سے اسکی دھاک ایسی بیٹھی ہوئی تھی، کہ بڑے بڑے شورہ پشت افسر ایک لمحہ میں اسکے حلقہ بگوش بنجاتے تھے، بطور نمونہ کے ہم یہاں پر ایک خاص موقع کا ایک واقعہ درج کرتے ہیں، جس سے نپولین کے نفوذ کا حال معلوم ہوگا، یہ واقعہ موسیو ٹائن نے اپنی کتاب "تاریخ انقلابِ فرانس" میں درج کیا ہے، موسیو ٹائن لکھتا ہے :-

"جب پیرس سے اس نوخیز افسر کا فوج کی کمان کے لئے تقرر ہوا، تو دیگر افسرانِ فوج کو یہ تقرر سخت شاق گذرا، خصوصاً اوجیرو کو نہایت ہی ناگوار ہوا، جو سخت درشت مزاج تھا، اور اپنی شجاعت و بسالت پر ناز کیا کرتا تھا، اُس نے لوگوں سے اس نئے افسر کے سن و سال اور قد و قامت کا حال سنکر تہیہ کر لیا تھا کہ جب وہ اسکی ملاقات کرنے جائیگا، تو اس سے سخت تمرد سے پیش آئیگا"

جنرل اوجیرو بار اس کا خاص شاگرد تھا، اور اس رتبہ پر محض اپنی شجاعت اور جنگ آزمائیوں
ہی کی بدولت پہنچا تھا، اور اسی لئے اسکو اس نوجوان کمانڈر سے ایک طرح کی
کد پیدا ہوگئی تھی، بہرحال نپولین سے ملاقات کرنے کے لئے جب سب
افسر گئے، تو نپولین نے پہلے تو ان سے اپنا طویل انتظار کرایا، اس کے
بعد کمرے سے اس قطع سے باہر نکلا، کہ کمر سے تلوار لٹک رہی تھی، اور سر برہنہ
تھا، کمرے سے باہر آکر اُس نے سر پر ٹوپی رکھی، اس کے بعد مختلف احکام صادر
کیئے، تجاویز جنگ کے متعلق افسروں سے باتیں کرتا رہا، اور پھر انکو رخصت کردیا،
اس تمام عرصہ میں اوجیرو کی حالت یہ تھی کہ جب تک نپولین سامنے رہا، وہ بت
بنا ہوا دم بخود کھڑا رہا، اور وہاں سے نکل کر جب اس کے ہوش بجا ہوئے، تو اس نے
اپنے دوست سینیا سے بیان کیا، کہ مجھ پر تو نپولین کے دیکھتے ہی رعب طاری ہوگیا،
میری سمجھ میں نہیں آتا، کہ اس میں کون سی طاقت ہے جس سے میں ایسا مرعوب ہوگیا"
نپولین عظمت و رتبہ میں اپنے کارناموں کی بدولت جتنا جتنا ترقی کرتا جاتا تھا،
اسی نسبت سے اسکے نفوذ اور سطوت میں بھی ترقی ہوتی جاتی تھی، یہانتک کہ آخر میں
اس کا نفوذ اتنا بڑھ گیا کہ وہ اُن لوگوں کی نگاہوں میں جو اسکی عزت کرتے تھے ایک
معبود کے درجہ پر پہنچ گیا، ایک بار کا واقعہ ہے، کہ کمانڈر وانڈم جو اوجیرو سے
زیادہ شورہ پشت فوجی افسر تھا، ۱۸۱۵ء میں قصر ٹولیری میں نپولین کے پاس ملاقات
کی غرض سے گیا، اس کے ساتھ اسوقت جنرل ارنانو بھی تھا، وانڈم نے ارنانو سے
سلسلہ سخن میں پوچھا، کہ یہ کیا بات ہے کہ میں باوجودیکہ کسی چیز سے خوف نہیں کرتا نپولین
کے پاس جاکر کیوں اس قدر خائف ہوجاتا ہوں، اور اس کی صورت دیکھتے ہی

میرے بدن میں تھرتھری پیدا ہو جاتی ہے،

نپولین کے نفوذ کی حالت یہ تھی، کہ جب وہ جزیرۂ البا سے بھاگ کر آیا ہے، تو باوجودیکہ اس کے مددگار لوگ کم تھے، اور اس کے مقابلہ کے لئے پورا فرانسیسی لشکر تیار تھا، لیکن نہایت تپاک سے اس کا خیر مقدم اور استقبال کیا گیا، اور فرانسیسی قوم کے قلوب کو دوبارہ اس نے فتح کر لیا، فوج کے جو افسر اسکو قید کرنے کے لئے بھیجے گئے تھے، انھوں نے اس کے قید کر لانے کا حلف اٹھایا تھا، لیکن نپولین کی صورت دیکھتے ہی وہ سب خاموش ہو کر اسکے حلقہ بگوش بن گئے، اور ان پر اس کا رعب چھا گیا، اس واقعہ کی کیفیت جنرل وسلی حسب ذیل لکھتا ہے :-

"نپولین جزیرۂ البا سے بھاگ کر جب فرانس کی سرزمین پر اترا ہے، تو اس وقت اسکی حالت یہ تھی کہ اس کے ساتھ بجز اسکے چند مخلص دوستوں کے اور کوئی نہ تھا، لیکن باوجود اس کے نپولین نے سرزمین فرانس پر قدم رکھتے ہی ایک ہفتہ کے اندر ہی اندر نہایت آسانی کے ساتھ محض اپنے نفوذ کے بل پر فرانسیسی طرز حکومت میں حیرت انگیز انقلاب پیدا کر دیا، اس کے علاوہ اس سلسلہ میں جو حیرت انگیز واقعہ ہے، وہ یہ ہے کہ اس نے اپنے آخری حملوں میں اپنے حلیفوں پر ایسا دباؤ ڈالا کہ وہ اس کا ساتھ دینے پر مجبور ہو گئے"

نپولین کا یہ نفوذ اس قدر قوی تھا کہ اس کے مرنے کے بعد بھی اس کا نفوذ اور غلبہ اپنی حالت پر برقرار رہا، اور اسی نفوذ کے اثر سے متاثر ہو کر اسکے مرنے کے بعد لوگوں نے اس کے بھانجے کو فرانس کے تخت شاہی پر بٹھایا، صرف یہی نہیں، بلکہ آج بھی جب کہ نپولین کو مرے ہوئے ایک مدت گذر گئی ہے، اس کے قصوں اور افسانوں کو

لوگوں کی زبانوں پر جو ہم چڑھا ہوا پاتے ہیں، تو ہمکو خیال ہوتا ہی، کہ نپولین کا اثر و نفوذ اب تک برابر ترقی کر رہا ہے، مختصر یہ کہ وہبی نفوذ و اثر کی حالت یہ ہوتی ہے، کہ اگر تمکو نفوذ حاصل ہو گیا ہو تو تم جتنا چاہو لوگوں کو قتل کرو، جتنی شورشیں چاہو برپا کرو، سب تمہارے لئے جائز ہے، تمہارے افعال کی کوئی پرسش نہ کریگا، بشرطیکہ تم اپنے نفوذ کو برابر ترقی دیتے رہو،

لیکن نفوذ کے پیدا ہونے کی صرف یہی چند صورتیں نہیں ہوتیں کہ محض فوجی دبدبہ یا شخصی قابلیت یا مذہبی خوف و رعب کی بنا پر کسی شخص کا نفوذ قائم ہو جاتا ہو، بلکہ کبھی ایسا بھی ہوتا ہی، کہ چند معمولی امتیازی حیثیتیں کسی شخص کا ایک پائدار نفوذ قائم کر دیا کرتی ہیں، ان صورتوں سے جو نفوذ پیدا ہوتا ہے، اسکی سب سے بڑی مثال فرانسیسی انجنیر ڈولیسپس کی ہی، جس نے بین الاقوامی تجارت کا راستہ کھول کر روے زمین پر عظیم الشان تغیر پیدا کر دیا، اور محض اپنے اسی کارنامہ کی بنا پر عظماے رجال کی صف اول میں جگہ حاصل کی، باوجودیکہ اس کا ارادہ مستقل اور اسکا نفوذ قوی تھا، مگر اسکی کامیابی کا سب سے بڑا راز یہ تھا کہ جو لوگ اس کے مخالف تھے، اُن کو وہ رام بنا لیا کرتا تھا، وہ جب ان سے بات چیت کرتا تھا، اپنی شیریں کلامی سے اُن کو مسحور کر لیتا تھا، یہانتک کہ وہ اُس کے دوست بنجاتے، انگریزوں نے اسکی تجویز کا کتنا مضحکہ اڑایا تھا، لیکن اس کا جواب اُس نے اسطرح دیا کہ ان کے ملک مین خود سیر و سیاحت کرنے گیا، لوگوں سے مل جل کر اپنی تجویز پر مباحثہ کیا، اس واقعہ کا انگریزوں پر بہت اثر پڑا، اور وہ اس کے معین و مددگار بن گئے، یہانتک کہ جب وہ شہر سوتھمپٹن سے ہو کر گذرا ہے، تو اس کے استقبال میں گھنٹے بجائے گئے، اور نہایت جوش و خروش کا اظہار کیا گیا،

ڈلیسپس کے راستہ میں گو بہت سی مشکلات حائل تھیں، لیکن اس نے لوگوں کے مخالفانہ مجمعوں کو چیر کر، پہاڑوں کو کاٹ کر اور ریگستان کی ریتیلی زمین کو سبزہ زار بنا کر، آخر کار اپنی تجویز کو پورا کر ہی دکھایا؛ اور اس کے بعد نہر سویز سے اسکو فرصت ملی تو اس نے یہ ایک نئی تجویز اور سوچ کر نکالی، کہ اسی طرح سے نہر پناما کا راستہ بھی کھولنا چاہیئے، لیکن اب چونکہ بڈھا ہو گیا تھا، اسلئے مجبوراً اسے اپنی اس آخری تجویز کو چھوڑ دینا پڑا، مگر اس عرصہ میں قضا و قدر کے کارخانے کچھ ایسے تھے، کہ اسکو چین سے بیٹھنا نصیب نہ ہوا، اور کچھ ایسے اتفاقات پیش آئے، کہ اسکی ساری زندگی کی محنت اکارت گئی، اور اس کے تمام کارناموں پر پانی پھر گیا، اسکی زندگی اہل بصیرت کے لئے گویا مرقع عبرت تھی، اپنی زندگی کے بعض ادوار میں اس نے اسقدر ترقی حاصل کر لی، کہ لوگ اسکی پرستش کرنے لگے، لیکن ایک معمولی بات کے پیش آجانے پر اسی کے ہم قوم مجسٹریٹوں نے اس کو مجرموں کی صف میں شامل کر کے اس کے اثر و نفوذ کو ایسا دھکا لگایا کہ اس کے صدمہ سے وہ جانبر نہ ہو سکا[۱]،

[۱] ڈی لیسپس کے انتقال کے بعد وائنا کے اخبار نوی فرائی پریس میں ایک دلچسپ مضمون شائع ہوا تھا جس میں بعض قابلِ غور باتیں بھی درج تھیں، اس بنا پر یہاں اس کے ایک دلچسپ حصہ کو ناظرین کی ضیافتِ طبع کے لئے پیش کرتا ہوں، مضمون نگار لکھتا ہے:-

"فرڈینینڈ ڈی لیسپس کے ساتھ جو کچھ برتاؤ کیا گیا، اسکے دیکھنے کے بعد کولمبس کے انجام پر بھی ہمیں کچھ تعجب نہیں ہوتا، ڈی لیسپس اگر قدیم زمانہ میں ہوتا تو لوگ اس کی بے انتہا قدر کرتے، اور مرنے کے بعد وہ یقیناً معبودوں کی صف میں جگہ پاتا، ڈی لیسپس کے ساتھ جو برتاؤ کیا گیا ہے، اسکی (بقیہ حاشیہ بر صفحہ ۱۶۱)

غرض یہ مثالیں جو ہم نے اوپر ذکر کی ہیں، ان سے نفوذ کی ان تمام حدود کا کہ کس طرح وہ پیدا ہوتا ہے، پھر کس طرح ترقی کرتا ہے، اور اس کے بعد کس طرح اس کا خاتمہ ہو جاتا ہے، ناظرین کو پورا اندازہ ہو گیا ہوگا، لیکن اگر نفوذ کی نفسانی کیفیات کا مفصل اندازہ کرنا چاہو تو بتدریج بانیانِ مذاہب و دول سے لے کر اس عامی تک کے

(بقیہ حاشیہ صنہ ۱۶۰) بنا پر عدالتِ استیناف (ہائی کورٹ) کے ججوں کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا، کیونکہ لوگ آپس میں سوال کریں گے، کہ اتنی بڑی حرکتِ ناشایستہ کا ارتکاب کس شخص نے کیا تھا اور ڈی لیسیس پر فردِ قرارداد جرم کس نے لگائی؟ ہاں بس آج سے معلوم ہو گیا کہ جس ملک میں یہ حالت ہو، کہ چھوٹے چھوٹے سرکاری ملازم قوم کے فدائیوں اور اعاظم رجال سے ان کے کارناموں کی بنا پر بغض و حسد رکھتے ہوں، اس ملک میں ہمیشہ انصاف کا خون ہوگا، اور اس ملک کے لوگوں سے انصاف کی توقع رکھنا حماقت و نادانی ہے،

ہاں لیکن قوموں کو ہمیشہ ان لوگوں کی احتیاج رہے گی، جو اپنے غیر متزلزل عزم و ارادہ کے بل پر مشکلات کو اپنے اوپر برداشت کرتے ہیں، ان لوگوں کو ڈرنے اور خوف کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے، فرڈیننڈ دی لیسیس اپنے کارناموں کی بدولت اوجِ رفعت پر پہنچا، اور اس نے دنیا کے لئے تجارت کی ایک راہ کھول دی اور جب وہ کامیاب ہو گیا تو امراء اور بادشاہ اس کے پاس ہدایا اور تحائف لے کر آئے، اور آج جب اسکو کورڈ یا پرسس کی پہاڑی پر ناکامی ہوئی، تو وہ نظروں سے گر گیا، یہ (بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۶۲ پر)

حالات کو خوب غور سے دیکھ جاؤ، جو کبھی نیا لباس پہن کر یا اپنے سینہ کو تمغوں سے آراستہ کر کے لوگوں میں اپنی نمود و نمایش کرتا ہے،

پس اگر نفوذ کے تمام مدارج کا غور سے مطالعہ کیا جائے، تو معلوم ہوگا کہ تمدن کے تمام عناصر کی بنا اسی نفوذ پر ہوتی ہے، بانیانِ مذاہب و دُول سے لیکر افکار، خیالات، علوم و فنون سب نفوذ ہی کے مظاہر ہوتے ہیں، اور کوئی خیال اور کوئی فن اور کوئی رائے لوگوں میں اسوقت تک اشاعت پذیر نہیں ہوتی، تاوقتیکہ اس رائے یا اس خیال یا اس فن کے نفوذ کا سکہ لوگوں کے دلوں پر نہیں بیٹھ جاتا ہے، اور پھر نفوذ حاصل ہونے کے بعد چونکہ اس کی اشاعت محض سریانِ تاثیر کی بدولت ہوتی ہے، اور سریانِ تاثیر بھی اپنا عمل لوگوں میں غیر شعوری کیساتھ کرتا ہے، اسلئے لوگوں میں جس خیال کی اشاعت ہو جاتی ہے، اسکی صحت و عدمِ صحت کا سوال پھر کسی وقت نہیں پیدا ہوتا، یہی بات ہے، کہ اس زمانہ کے مصورین جو مختلف بدنما تصویریں قدیم زمانہ کے انسانوں کی بناتے ہیں، ان کے متعلق ان کو خود علم نہیں ہوتا، کہ یہ خاکہ ان کے ذہن میں کہاں سے آیا، بلکہ وہ بجائے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۶۱) کچھ نہیں، یہ سب سرکاری ملازموں کی کارستانیاں ہیں، جو بغض و حسد کی وجہ سے قوم کو ہر اُس شخص کے برخلاف برانگیختہ کر دیتے ہیں، جو اوجِ رفعت پر پہنچ جاتا ہے، بات یہ ہے کہ اعاظم رجال جو نئی نئی باتیں ایجاد کرتے ہیں، ان کے سامنے انکے زمانہ کے بڑے بڑے مقننین حیران رہجاتے ہیں، کیا کوئی اڈوکیٹ یہ ثابت کر سکتا ہے کہ اسٹانلی قاتل اور ڈی لیسیس خائن اور دغاباز تھا؟" (مؤلف)

اس کے خود اپنے ہی کو ان کا موجد سمجھنے لگتے ہیں، حالانکہ اصل میں ہوتا یہ ہی، کہ پہلے کوئی بڑا مصور اس خاکہ کو تیار کرتا ہے، اور اس کے بعد جب وہ تصویر رائج ہو جاتی ہے، تو ہر شخص اس کی نقل اتارنے لگتا ہی، لیکن یہ کسی کو خیال نہیں رہتا، کہ اس کا ماخذ اصلی کون تھا، اسی طرح بعض مصورین یہ کرتے ہیں، کہ اپنی تصویروں میں بنفشئی رنگ کا سایہ دکھلاتے ہیں، حالانکہ اُنھوں نے بنفشئی رنگ کا سایہ کبھی دیکھا بھی نہ ہوگا، لیکن ہوتا یہی ہے کہ کوئی بڑا مصور جو اپنے زمانہ میں بے مثل مصور ہوتا ہے، اپنے فن میں یہ نئی نئی باتیں ایجاد کرتا ہے، اور پھر اسکے بعد دوسرے مصور بھی اسکی نقلیں اُتارنے لگتے ہیں،

پس بیاناتِ گذشتہ سے معلوم ہوا کہ نفوذ کی پیدائش کے باعث گو مختلف اسباب ہوتے ہیں، لیکن ان تمام ذرائع میں سب سے بڑا درجہ کامیابی کا ہے، جب کوئی حاکم اپنے احکام میں کامیاب ہو جاتا ہے، تو لوگ خواہ مخواہ اسکی اطاعت کرنے لگتے ہیں، اسی طرح جب کوئی خیال عقلوں پر غلبہ حاصل کر لیتا ہی، تو لوگ اسکی تصدیق کرنے لگتے ہیں، کامیابی کی بناپر نفوذ کے قائم ہونے کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ جب کسی ایسے شخص کو جس کا نفوذ پہلے قائم تھا، ناکامی کا سامنا ہوتا ہے، تو اسی وقت اس کا نفوذ بھی تشریف لیجاتا ہے، یہانتک کہ بعض اوقات حالت یہ ہوتی ہے کہ کل جس شخص کے سامنے جماعت سرنگوں تھی، اگر زمانہ اس سے پھر گیا، تو آج اسی کو جماعت گالیاں دینے لگتی ہی، روبسپیر کو دیکھو کہ ایک وقت میں لوگوں پر اسکی دھاک بیٹھی ہوئی تھی، کہ اُس نے اپنے بہت سے مخلص دوستوں کو بلا وجہ قتل کر ڈالا لیکن جب انتخاب کے وقت اسکو چند ووٹوں کی کمی کی بدولت اپنے عہدے کو

کو چھوڑنا پڑا، تو اسی وقت اس کا نفوذ بھی زائل ہو گیا، اور جماعت کو اس پر اسقدر غصہ آیا، کہ آخر کار وہ پھانسی پر لٹکا دیا گیا،

لیکن اگر کسی انسان کے بجائے کسی خیال کا نفوذ جماعت پر قائم ہو گیا ہو، تو اس نفوذ کا ازالہ اکثر اسوقت ہوتا ہی، جب اس خیال اور اس عقیدہ میں شکوک و شبہات پیدا کئے جاتے ہیں، خیال جب تک شک و شبہہ سے پاک رہتا ہی، اسی وقت تک اس کا نفوذ بھی قائم رہتا ہے، اور جہاں اس میں شک پیدا کیا گیا، بس اسکے نفوذ کا بھی خاتمہ ہو جاتا ہے،

فصل چہارم

نفس اجتماعی کے معتقداتِ اساسی کے حدود

۱۔ جماعت کے معتقداتِ اساسی، جماعت کے بعض معتقدات غیر تغیر پذیر ہوتے ہیں، اسی قسم کے غیر تغیر پذیر معتقداتِ جماعت پر کسی تمدن کی بنیاد ہوتی ہے، ان معتقدات کو اپنی جگہ سے ہلانا دشوار ہوتا ہے، یہ بحث کہ کسی قوم میں تعصب کا کس حد تک پایا جانا مفید ہے، اگر کوئی عقیدہ عقلی پہلو سے مہمل ہو تو اس سے اسکی اشاعت اور اس کے رسوخ پر کوئی اثر نہیں پڑتا،

۲۔ جماعت کے معتقداتِ غیر اساسی، یہ بحث کہ معتقداتِ اساسی کے علاوہ جماعت کے بعض ایسے معتقدات ہوتے ہیں، جن میں تغیر ہوتا رہتا ہے، اکثر ان معتقداتِ غیر اساسی میں ایک صدی سے بھی کم مدت کے اندر تغیر ہو جاتا ہے، ان تغیرات کے کیا کیا حدود ہیں، وہ کون سے معتقدات ہیں جنمیں تغیر ہوجاتا ہے، زمانۂ حال میں معتقداتِ اساسی کی بنیادیں متزلزل ہوگئی ہیں، اور اخبارات اور اشاعتِ مطبوعات اس تغیر و انقلاب کے اصلی سبب ہیں، یہ بحث کہ اس انقلاب اور تغیر کی وجہ یہ ہے کہ زمانۂ سابق میں خیالات پر

حکومتوں کا جو قابو تھا، وہ اب باقی نہیں رہا ہی، زمانۂ حال میں خیالات کے اندر انتشار کی کیفیت جو پیدا ہوگئی ہی وہ حکومتوں کے تسلط کی سدِّ راہ ہی،

(۱)

جماعت کے معتقداتِ اساسی

نظرِ غور سے دیکھو تو انسان کے تشریحی یعنی جسمانی اور اس کے نفسانی خصائص کے مابین ایک عجیب تشابہ پاؤ گے، انسان کے خصائصِ جسمانی میں بعض خصائص ایسے ہیں جنمیں کبھی تغیر نہیں ہوتا، اور اگر ہوتا بھی ہے، تو رفتہ رفتہ ایک مدت دراز میں، اور بعض ایسے خصائص ہیں جنمیں ماحول یا دوسرے موثرات کی وجہ سے بہت آسانی کیساتھ تغیرِ عظیم ہوجاتا ہی، اور یہ تغیر بعض اوقات کچھ اس طرح کا ہوتا ہی، کہ بادی النظر میں اس کے سبب سے خصائصِ اصلی پر بھی پردہ پڑجاتا ہے،

بعینہ یہی حال انسان کے خصائصِ نفسانی کا بھی ہے، قوموں کے خصائصِ جسمانی کی طرح ان کے خصائصِ نفسانی بھی دو طرح کے ہوتے ہیں، بعض وہ ہیں جنمیں کبھی تغیر نہیں ہوتا، اور بعض خصائص ایسے ہیں جو ہمیشہ تغیر پذیر رہتے ہیں، لیکن اقوام کے معتقدات و افکار پر عمیق نظر ڈالنے سے پتہ چلتا ہے، کہ ان کے نفسانی خصائص میں جو خصوصیتیں اصلی اور غیر تغیر پذیر ہوتی ہیں، ان پر ہمیشہ وقتی اور تغیر پذیر خصائص پردہ ڈالے رہتے ہیں،

اس بنا پر معتقداتِ جماعت کی دو ممتاز قسمیں ہیں، ایک قسم کے معتقدات وہ ہوتے ہیں جو مدتوں ایک ہی حالت پر برقرار رہتے ہیں، اور جو گویا قومی تہذیب کے لئے

مرکز کی طرح ہوتے ہیں، کہ اس قوم کے تمام عناصرِ تمدن اسی ایک مرکز سے باہم پیوست ہوتے ہیں، اس قسم کے معتقداتِ اساسی کی مثال ہمارے زمانہ کے جمہوریت پسندی کے خیالات ہیں، بخلاف اس کے دوسری قسم کے معتقدات و افکار وہ ہوتے ہیں جنمیں ہر وقت تغیر ہوتا رہتا ہے، کہ آج اُن کا ظہور ہوا، اور کل مٹ گئے، لیکن اس قسم کے خیالات کی پیدائش ہمیشہ پہلی قسم کے مستحکم خیالات سے ہوتی ہی، اسطرح کے خیالات کی مثالیں جیسے موجودہ زمانہ میں طبیعین اور روحانیین کے مذاہب جو بیسیوں پیدا ہوئے اور مٹ مٹ گئے، ان معتقدات کی حالت سطحِ بحر کی موجوں کی سی ہوتی ہی، کہ وہ سطحِ بحر پر برابر تلے اوپر پیدا ہوتی رہتی ہیں،

لیکن پہلی قسم کے مستحکم معتقدات و افکار میں تغیر پذیر معتقدات و افکار سے بہت تھوڑے مگر بہت مستحکم ہوتے ہیں، اور در اصل انہی افکار کے عروج و زوال سے قوموں کی تاریخ میں نیا دور شروع ہوتا ہی، اور حقیقت میں انہی مستحکم عقائد پر قوموں کے تہذیب و تمدن کا بھی دار مدار ہوتا ہی،

بلاشبہہ نفوسِ جماعت میں کسی ایسے عقیدہ یا خیال کو وقتی طور پر پیوست کر دینا تو بہت آسان کام ہے، جو تغیر پذیر ہو، لیکن کسی ایسے عقیدہ کا دلوں میں راسخ کرنا بہت مشکل ہوتا ہے، جو مدتوں ایک حال پر قائم رہے اور بالکل ناقابلِ تغیر ہو اور پھر اگر کسی طرح نفوسِ جماعت میں کبھی ایسے غیر تغیر پذیر عقیدہ کا نقش قائم بھی ہو گیا تو اس کے بعد پھر دلوں سے اس نقش کے اثر کو مٹانا بھی کچھ آسان کام نہیں ہی، کسی غیر تغیر پذیر عقیدہ اور خیال کی حالت یہ ہوتی ہی، کہ اول تو کبھی نفوس میں اسکا رسوخ ہی نہیں ہوتا، اور اگر ہو گیا تو اب اسکو اپنی جگہ سے ہلانا دشوار ہو جاتا ہی، ہاں البتہ اس قسم کے عقیدے جو

دلوں میں راسخ ہو گئے ہیں، ان کو مٹانے اور اپنی جگہ سے ہلانے کی صرف ایک صورت ہوتی ہے، وہ یہ کہ سخت شورشیں ان عقیدوں کے خلاف برپا کیجائیں، اور مستحکم عقیدوں کے اثر کا شورشوں کے آہنی ہتھیاروں سے مقابلہ کیا جائے، لیکن مشکل یہ ہوتی ہی کہ یہ شورشیں بھی اس وقت تک کارگر نہیں ہوتیں، تا وقتیکہ پہلے سے ان عقیدوں کا اثر مضمحل نہ ہو گیا ہو، اور پھر بھی شورشوں سے صرف اتنا فائدہ ہوتا ہی کہ عقیدوں کا بچا کھچا اثر مٹ جاتا ہے، بشر طیکہ عوائد مستمرہ اس اثر کو زائل ہونے دیں، باقی ان کے اختیار میں یہ نہیں ہی، کہ وہ ان عقیدوں کے اثر کو دلوں سے بالکلیہ زائل و فنا کر دیں،

پس حاصل یہ کہ جو خیالات عملِ توارث سے قوم کے دلوں میں جگہ پکڑ لیتے ہیں، انکا ازالہ شورشوں سے بھی ممکن نہیں ہوتا، لیکن ان معتقدات کے فنا کرنے کی ایک تدبیر اور ہے، جو عموماً بہت کارگر ہوتی ہی، اور وہ یہ ہی، کہ جو معتقدات عام طور پر مسلّم مان لئے گئے ہوں، ان میں بحث و مباحثہ شروع کر دیا جائے اصل میں عقیدہ اسی وقت تک عقیدہ رہتا ہے، جب تک وہ مناظرہ اور مباحثہ کی زد سے محفوظ رہتا ہے، لیکن جہاں اسکے متعلق بحث و مباحثہ کا دروازہ کھولا گیا، بس اسکی قوت میں اسی وقت سے فرق آنے لگتا ہے، تمام عقیدوں کی قوت کا راز یہی ہی، کہ وہ عام نگاہوں سے کچھ اس طرح اوجھل رکھے جاتے ہیں، کہ ان کے سقم کیجانب کسی کا خیال تک نہیں جاتا،

لیکن اسکے بعد بھی مشکل یہ پیش آتی ہی، کہ وہ رسوم و رواج یا نظامِ حکومت و نظامِ تعلیم و تربیت وغیرہ جو ان معتقدات اساسی پر مبنی ہوتے ہیں، ان معتقدات کی حفاظت کرتے ہیں، اور ان رسوم و رواج میں ذرا دیر میں تغیر ہوتا ہی، مگر جہاں ان رسوم میں تغیر ہوا، بس پھر اس عقیدہ کے مٹنے میں کوئی کسر نہیں رہتی لیکن جب

قوم کے معتقداتِ اساسی میں تغیر ہو جاتا ہے، تو اس کے بعد یہ بھی ضروری ہوتا ہے کہ وہ اپنے تمام ارکانِ تمدن اور عناصرِ تہذیب میں بھی ایک دم تغیر کر دے، اور تا وقتیکہ کوئی جدید عقیدہ اس فنا شدہ قدیم عقیدہ کی جگہ نہیں لے لیتا ہے، اس وقت تک قوم پر ایک انتشار کی کیفیت طاری رہتی ہے،

غرض کسی قوم کے عقائد اساسی اس قوم کے لئے نعمت ہوتے ہیں، اور انکی قدر کرنا اور ان کو شورشوں کے حملوں سے محفوظ رکھنا، اس قوم کا فرض ہوا کرتا ہے، یہی وجہ ہے کہ قومیں ہمیشہ اپنے ان معتقدات کی قدر و قیمت پہچانتی ہیں، جو آبا و اجداد سے انکو ورثہ میں ملتے ہیں، اور قوموں کو یہ معلوم رہتا ہے کہ اصل میں انکے زوال کا دن وہی ہے جب ان کے عقائد اساسی نشانۂ ہدف بنجائیں، رومی قومیں جب تک شہر روم کی نہایت تعصب کے ساتھ پرستش کرتی رہیں، اسوقت تک انکا ستارۂ اقبال عروج پر رہا، لیکن جس دن سے اس عقیدہ کی بنیاد کھوکھلی ہو گئی، اسی روز سے رومیوں پر مصائب کے پہاڑ ٹوٹ پڑے، اور یہی بات ہے کہ قومیں نہایت تعصب اور تنگ نظری کیساتھ اپنے عقائد کیجانب سے جان توڑ مدافعت کرتی ہیں، تعصب گو عقلی پہلو سے کسی قدر مذموم کیوں نہ خیال کیا جائے، لیکن عملی حیثیت سے قوموں کی حیات و ممات میں ہمیشہ تعصب کو بہت بڑا دخل رہا ہے، قرونِ متوسطہ میں جو لوگ زندہ جلا دئیے جاتے تھے، تو کس غرض سے؟ صرف اسلئے کہ مسیحیت کے عقائد کی الحاد و دہریت کے جھونکوں سے حفاظت کیجائے، اسی طرح قرونِ متوسطہ میں بعض بڑے بڑے لوگوں کو مرتے دم کس بات کی حسرت رہجاتی تھی؟ صرف اس بات کی کہ کاش وہ اپنے مذہب کی حفاظت کی راہ میں شہید ہوئے ہوتے، پھر بالآخر میدانِ جنگ میں ہمیشہ

لوگ اپنی گردنین کیون کٹوایا کئے ہین؟ اس کی غرض بھی صرف یہی ہے کہ اجنبی حملوں کی زد سے قومی عقیدہ کے مستحکم قلعون کی حفاظت کی جائے، غرض دنیا میں ہمیشہ قومون نے اپنے قدیم عقائد کی اجنبی حملون سے اسی طرح مستعدی کے ساتھ حفاظت کی ہو، اور شاید کہ دنیا مین قیامت تک یہی ہوتا رہیگا،

اور گو جیسا کہ میں اوپر بیان کر چکا ہوں کسی جدید اعتقاد کا نفوس میں راسخ کرنا بہت مشکل ہوتا ہے، لیکن اس کے ساتھ یہ بھی ہے کہ جب کسی عقیدہ کو رسوخ حاصل ہو جاتا ہی تو اس کے غلبہ اور رسوخ میں ترقی ہوتی رہتی ہے، اور ایک مدت تک نفوسِ جماعت پر اسی عقیدہ کا قبضہ اور تسلط رہتا ہے، دیکھو یوروپین قوموں پر ایک مدت تک اُن جھوٹے قصوں کا کیسا اثر قائم رہا، جو قدیم زمانہ مین مشہور و مسلّم تھے، حالانکہ واقع مین وُہ کہانیاں اس قابل نہ تھین کہ روشن عقلین ان کو اس طرح بلا چون وچرا تسلیم کر لیتین، باوجودیکہ اس زمانہ میں گیلیلیو، نیوٹن، لبنٹز وغیرہ بڑے بڑے روشن خیال فلسفی موجود تھے، لیکن کسی کو بھی ان قصون اور خرافات کے باطل کرنے یا ان کی حقیقت دریافت کرنے کا کبھی خیال نہین آیا، اور صرف اسی ایک بات سے یہ اندازہ ہوسکتا ہی کہ معتقدات جماعت نفوس پر کیا ساحرانہ تسلّط حاصل کر لیتے ہین، نیز اس بات کا بھی اندازہ ہوسکتا ہی کہ عقلِ انسانی کا دائرہ کس قدر محدود ہے،

لیکن جب یہ نیا عقیدہ ذہنوں میں خوب پختہ ہو جاتا ہے، تو اس وقت اس قوم کا نظامِ حکومت، اس کا نظامِ معاشرت، اس کے علوم و فنون اور اس کے تمام اعمال و افعال کی بنا بھی یہی عقیدہ قرار پاتا ہے، اب واضعانِ قوانین اسی عقیدہ کی بنیاد پر قوانین وضع کرتے ہیں، اور فلاسفہ اور اہلِ فن اسی عقیدہ کو پیشِ نظر رکھ کر اپنے اپنے فلسفہ اور

اپنے فن کا سنگِ بنیاد رکھتے ہیں، اور گو کبھی اس عقیدہ سے بعض وقتی افکار اور تغیر پذیر خیالات کا بھی نشو و نما ہوتا ہے، تاہم یہ وقتی افکار اور تغیر پذیر خیالات بھی اسی عقیدہ کے رنگ میں رنگ جاتے ہیں، زمانۂ قدیم میں مصریوں کے تمدن کی بنا چند مذہبی خیالات تھے، جن کا رنگ ان کے ہر شعبۂ زندگی پر چڑھا ہوا تھا، اسی طرح ازمنۂ متوسطہ میں اہلِ یورپ اور مسلمانوں کے تمدنوں پر بھی یہی دینی رنگ غالب تھا،

پس بیاناتِ بالا سے معلوم ہوا کہ ایک زمانہ کے تمام لوگ، اپنے خیالات، افکار و عادات میں ایک دوسرے کے مشابہ جو ہوتے ہیں، تو اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ ان کے موروثی عقائد میں کسی طرح کا اختلاف نہیں ہوتا، اور چونکہ انسان کی سیرت اور عادات کی ترکیب جس خمیر سے ہوتی ہے، وہ اس کے موروثی عقائد ہوا کرتے ہیں، اس لئے ہمارے ہر چھوٹے سے چھوٹے عمل کی بنا بھی ان ہی عقائد پر ہوتی ہے، اور ایک قوم اور ایک زمانہ کے لوگوں کے اعمال و افعال میں بھی ہمرنگی پائی جاتی ہے اور گو ہماری عقلی حالت کسی قدر کیوں نہ ترقی کر جائے مگر ہم کو ان عقائد سے کسی وقت رہائی نہیں مل سکتی، پس حقیقی استبداد وہ ہے جو ہم پر غیر شعوری حالت میں مسلط ہوتا ہے، اور جس سے مقابلہ کرنے کی کسی میں قدرت نہیں ہوتی، دیکھو قیصر ٹیبر، چنگیز خاں، نپولین کس قدر صاحبِ نفوذ بادشاہ گذرے ہیں، لیکن حضرت موسیٰؑ حضرت عیسیٰؑ و حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی طرح ان لوگوں کو کبھی نفوذ حاصل نہیں ہوا، البتہ اگرچہ بعض اوقات ان موروثی عقائد کا اثر تھوڑی دیر کے لئے کسی دغا بازی کی وجہ سے زائل ہو جایا کرتا ہے، لیکن جو عقیدہ نفوس میں راسخ ہو گیا ہو، اس کو دغا بازی بھلا کیا فنا کر سکتی ہے، اس وقت بھی آخر میں جا کر اسی موروثی عقیدہ ہی کو فتح ہوتی ہے، انقلابِ فرانس کے موقع پر جب عیسائیت اور شورشِ الحاد کے مابین جنگ جاری تھی، تو اس وقت گو بانیانِ شورش کے نظام کے

باوجود عام طور پر جماعت کا میلانِ طبع ظاہر میں فرانسیسی شورش ہی کی جانب تھا، مگر آخر میں شورش ہی کا ستیاناس ہوا،

حقیقت یہ ہے کہ انسان جن چیزوں کا محکوم ہوتا ہے، وہ وہ انسانی اموات ہوتے ہین جو قبرون کے اندر سے لوگوں پر حکومت کرتے ہین،

پھر یہ عقائد اور خیالات ذہنوں میں جو رسوخ حاصل کرتے ہین، اُن کے لئے یہ بھی کچھ ضروری نہیں ہے کہ عقلی پہلو سے بھی یہ خیالات اور عقائد اپنے اندر واقعیت رکھتے ہوں بلکہ اس کے خلاف جن عقائد کو غلبہ ہوتا ہے وہ عموماً وہی خیالات ہوتے ہیں جو عقلی پہلو سے گرے ہوئے ہوتے ہیں، مذہبِ اشتراکیت جو اس وقت ہم کو انحطاط پذیر نظر آرہا ہے، اس کی وجہ یہ نہین ہے کہ عقلی پہلو سے وہ کچھ کم رتبہ ہے، اور اس لئے اس کا اثر لوگوں پر نہیں ہوتا، بلکہ اصلی وجہ یہ ہے کہ مذہبِ اشتراکیت کے علاوہ اور جو مذاہب ہیں وہ انسان سے یہ وعدہ کرتے ہین کہ ان کو اس جہان کے علاوہ ایک دوسرے جہان میں راحتِ ابدی حاصل ہوگی، بخلاف اس کے مذہبِ اشتراکیت لوگوں کو یہ طمع دلاتا ہے، کہ اگر اس کے اصول پر درآمد کیا گیا تو لوگوں کو اسی جہان میں حیاتِ جاودانی حاصل ہوسکتی ہے، لیکن جب اس کے اصول پر عمل کیا جاتا ہے، تو اس وقت اس کے جھوٹے وعدوں کی قلعی کھل جاتی ہے، یہی بے اعتباری ہے، جو مذہبِ اشتراکیت کو فروغ نہیں حاصل ہونے دیتی،

(۲)

جماعت کے معتقداتِ غیر اساسی

جماعت کے عقائدِ غیر متغیرہ جن کی میں نے صفحاتِ بالا میں تشریح کی ہے ان کے علاوہ جماعت کے بعض افکار اور عقائد ایسے بھی ہوتے ہیں، جو ہمیشہ تغیر پذیر اور حالتِ زوال

میں رہتے ہیں،

لیکن ان تغیر پذیر افکار میں سے بعض وہ ہوتے ہین جو بالکل نقش بر آب ہوتے ہین اور بعض عقائد جو زیادہ اہم ہوتے ہیں، وہ بھی زیادہ سے زیادہ ایک صدی تک اپنی حالت پر قائم رہتے ہین، اور جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہین کسی قوم کے یہ تمام تغیر پذیر افکار و عقائد مبنی ہوتے ہیں ان اصولی افکار پر جو اس قوم میں بذریعۂ وراثت رسوخ پیدا کر لیتے ہین' اس کی مثال میں ہم نے اپنے ملک کے نظام سیاسی کو پیش کیا تھا، کہ گو ہمارے ملک کے تمام فرقوں کے اصول ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں، مگر ان سب کا ایک مشترک مقصد ہے جو ہمارے مخصوص مزاجِ عقلی سے پیدا ہوا ہے، نیز ہم یہ بھی بیان کر چکے ہیں کہ خیالات و افکار میں صوری اور رسمی تغیر کر دینے سے ان خیالات کی اصلی حقیقت نہیں بدلتی، اور اس کی مثال میں ہم نے بانیانِ انقلابِ فرانس کو پیش کیا تھا، کہ گو یہ لوگ اپنے عادات و اطوار اور خیالات میں رومیون کی تقلید کرنا چاہتے تھے، لیکن اس سے وہ کچھ رومی نہیں بن گئے، کیونکہ ان کے قومی روایات رومیون کے قومی روایات سے بالکل مختلف تھے، پس دانایانِ قوم کا جو اصلی فرض ہوتا ہے' وہ صرف یہ ہے کہ وہ تغیر پذیر قومی عقائد میں سے غیر تغیر پذیر قومی عقائد کو ڈھونڈھ نکالیں اور حقیقی عقائد کو غیر حقیقی عقائد سے اور ملمع کو اصل سے متمیز کر دین، باقی رہا ان عقائد میں تغیر کرنا تو یہ ان کے بس کی بات نہین،

لیکن جب ہم کسی قوم کے عقائد و خیالات کی تجرید و تفرید کر کے معتقدات اساسی کو معتقدات غیر اساسی سے متمیز کرتے ہین تو ہمین نظر آتا ہے کہ قومون کے مزاجِ عقلی کو چھوڑ کر قومون کے باقی اور دیگر حالات میں ایک مدت کے بعد عظیم الشان تغیر

ہو جاتا ہے، شواہد و امثلہ تلاش کرنے کے لئے زیادہ دور جانے کی ضرورت نہین، ایک اپنے ہی ملک کی تاریخ کو لو، سنہ ۱۷۹۰ء اور سنہ ۱۸۲۰ء کے مابین جو واقعات ملک فرانس مین ظہور پذیر ہوے ہیں، ان میں ہم نے دیکھا ہے، کہ کس سرعت کے ساتھ قوم کے مذہبی اور سیاسی خیالات میں تغیر ہوتا رہا، جو لوگ پہلے نہایت جمہوریت پسند تھے، وہ کس طرح ایکبارگی بادشاہ پرست بن گئے، جن کا تعلق پہلے کیتھولک فرقہ سے تھا، وہ کس طرح بعد کو ملحد و بے دین ہو گئے، پھر سب سے زیادہ تعجب اس بات پر ہوتا ہے کہ وہ لوگ جو پہلے تسلط و استبداد کے جانی دشمن تھے خدا جانے ان میں کیا تغیر ہو گیا کہ وہ یکبارگی نپولین کے سامنے بالکل بے دست و پا ہو کر اس کے حلقہ بگوش بن گئے۔

اسی طرح ہمارے ملک کے علاوہ اگر یورپ کے دیگر ممالک کی سیاسی تاریخ کا مطالعہ کرو تو معلوم ہوگا، کہ ادھر کچھ عرصہ کے اندر یورپ کی سیاست میں کتنے عظیم الشان تغیرات واقع ہوے ہیں، پہلے انگریز ہمارے حلیف تھے، پھر روس کے مقابلہ مین انگریزون نے دوبارہ ہم کو دھوکا دیا، اور ہمارے دشمن بن گئے، اور [illegible] کے بعد اب پھر وہ ہمارے حلیف ہین،

علاوہ بریں ان مذہبی اور سیاسی تغیرات کے علاوہ مختلف علوم و فنون میں بھی ایک مدت کے بعد عظیم الشان تغیر ہو جاتا ہے، آجکل فلسفہ کے جو مختلف اصول ہمین نظر آرہے ہیں، وہ سب اسی کلیہ کے شواہد ہین، اسی طرح اکثر ایسا ہوتا ہے کہ آج ایک اڈیٹر یا مصور قوم کو مسخر کئے ہوے ہی، تو کل وہی قوم کی نگاہ میں ذلیل ہو جاتا ہے،

لیکن یہ تغیرات اور انقلابات زمانہ جن کو ظاہر بین نگاہیں حقیقی اور اصلی تغیرات سمجھتی ہیں، ان میں جب ذرا زیادہ غور کیا جاتا ہے، تو نظر آتا ہے کہ جو خیالات و افکار

موروثی عقائد کے خلاف اوران کے برعکس ہوتے ہیں، وہی سریع الزوال بھی ہوتے ہیں جو عقیدہ اورخیال قوم کے موروثی عقائد کے خلاف ہو، اس کے متعلق یاد رکھو کہ اسکو ایک لمحہ فروغ نہیں ہوسکتا، لیکن جو خیالات موروثی عقائد کے خلاف نہیں ہوتے وہ حسب حیثیت و رتبہ ایک مدت تک باقی رہتے ہین، اوراس کے بعد جب ان کا وقت آجاتا ہی تو وہ بھی مٹ جاتے ہین،

زمانۂ حال مین اس قسم کے تغیر پذیر خیالات کی بڑی کثرت ہی، اوراس کے تین سبب ہین،

۱- چونکہ قدیم افکار وعقائد بہت بوسیدہ اور ازکار رفتہ ہوگئے ہیں، اس لئے اب وقتی اورعارضی افکار وخیالات کے لئے میدان بہت وسیع ہوگیا ہے،

۲- جماعت کے اثر مین ترقی ہوگئی ہے، اورجو قوتین جماعت کے اثر کو روکنے والی تھین، وہ اس کے غلبہ کے آگے سپر انداز ہوگئی ہین، اورچونکہ جماعت کے افکار بے حد تغیر پذیر ہوتے ہین، اس لئے اب وہ بالکل خودسر ہوگئی ہے،

۳- اس زمانہ مین مطبوعات گھر گھر پھیلے ہوئے ہین، جن کی وجہ سے اوباش لوگون کے سامنے عجیب عجیب متناقض اورغیر مربوط خیالات پیش ہوتے ہیں، آج ایک خیال اچھی طرح ذہنوں میں راسخ نہیں ہونے پایا، کہ کل دوسرا خیال کتابون کے ذریعہ سے پھیلا دیا جاتا ہے،

یہ تین سبب ہیں جن کی وجہ سے ہمارے زمانہ میں طبیعتون میں عجیب قسم کا انتشار پیدا ہوگیا ہے اور تاریخ انسانی میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا ہے، جو دوسرے ادوار سے اس بات میں ممتاز ہی، کہ موجودہ دور مین رائے عام حکومت سے بالکل آزاد ہوگئی ہے، اور حکومتون کو مجبوراً رائے عام کی اتباع کرنا پڑتی ہے،

زمانۂ سابق میں چونکہ قاعدہ یہ تھا، رائے عام پر حکومتوں اور چند صاحبِ اثر لوگوں کا غلبہ ہوتا تھا، اس لئے اس زمانہ میں رائے عام میں اضطراب و انتشار نہیں پیدا ہونے پاتا تھا، لیکن اس زمانہ میں حالت یہ ہو گئی ہے کہ اڈیٹرانِ اخبار اور ممتاز صحائف خود رائے عام کی پیروی کرتے ہیں، اور رہبری اور رہنمائی سے جی چراتے ہین، بلکہ اہلِ سیاست کا حال تو یہ ہے کہ وہ بجائے رائے عام سے آگے آگے چلنے کے اس کے پیچھے پیچھے چلتے ہین، اور رائے عام کا رعب کچھ ان پر ایسا غالب آگیا ہے کہ وہ کسی ارادہ پر منٹ بھر نہیں قائم رہتے ہیں،

گذشتہ بیانات سے معلوم ہوا کہ رائے عام روز بروز حکومتون کی سیاست پر حاوی اور مستولی ہوتی جاتی ہے، اور اب یہان تک نوبت پہنچ گئی ہے کہ وہ قومون کو مصالحت اور مخالفت پر بھی مجبور کرنے لگی ہے، فرانس اور روس کے مابین جو آخری عقدِ مصالحت ہوا ہے، اس کا باعث رائے عام ہی تھی، اور اب پوپ اور تمام بادشاہ اس بات کے عادی ہو گئے ہین کہ اپنے باہمی مراسلات اور باہمی مکالمات کو شائع کریں، تاکہ جمہور ان پر رائے زنی کر سکیں، لوگ کہتے ہیں کہ سیاست ان چیزون میں سے نہین ہے، جو جذبات و مشاعر کے زور پر چلتے ہین، لیکن میری رائے میں یہ خیال غلط ہے کہ اس وقت جماعت حکومتون کی سیاست پر مسلط ہے، اور جماعت کے تمام کام عقل کے زور پر نہیں بلکہ مشاعر و جذبات کے زور پر انجام پاتے ہین،

لیکن حکومتون کے علاوہ جرائد و صحائف کی حالت بھی موجودہ زمانہ میں ناگفتہ بہ ہو گئی ہے، اور ان کو بھی مجبوراً جماعت کے غلبہ کے آگے سرِ تسلیم خم کرنا پڑتا ہے، اور ظاہر میں یہ جو نظر آتا ہے کہ لوگوں پر جرائد کا اثر ہے، تو یہ محض اس وجہ سے ہے کہ وہ بھی روزانہ رائے عام کے ساتھ ساتھ اپنی پالیسی میں تغیر کرتے رہتے ہیں، اور ان کا وظیفۂ عمل صرف

یہ رہ گیا ہے، کہ لوگون کی رایوں کو بلا کم و کاست پیش کر دین، اب اخبارات نے صرف اس بات پر قناعت کر لی ہے کہ روزانہ چھاپ دیا کرین، اور طوعاً و کرہاً جس طرح بن پڑے جماعت کے جذبات اور اس کی خواہشون کی اتباع کرین اور اگر وہ یہ نہ کرین تو ان کو خسارہ برداشت کرنا پڑے، بڑے بڑے قدیم جرائد کی حالت دیکھو، لا کانسٹیٹیوشنل ڈیبٹس اور ساگل، یہ کسی زمانہ مین ایسے نامور اخبار تھے کہ ہمارے آبا و اجداد ان کے اقوال و آرار کو بمنزلۂ وحی سمجھتے تھے، لیکن اب ان کی حالت یہ ہو گئی ہے کہ وہ بعض ونکاہات اور تجارتی اشتہارات سے ناظرین کی ضیافتِ طبع کر دیا کرتے ہین، غرض اس زمانہ مین کوئی اخبار ایسا نہین ہے جو اپنی قلتِ آمدنی کے باعث اپنی ذاتی رائے کا اظہار کرتا ہو، کیونکہ اس بات کا خوف لگا رہتا ہے کہ اگر اس نے اپنی ذاتی رائے کا اظہار کیا، تو لوگ اس کو ناپسند کرین گے، اور اخبار کی وقعت گر جائے گی، جماعت کی حالت یہ ہو گئی ہے کہ وہ زیادہ تر اس بات کو پسند کرتی ہے، کہ اخبار مین کچھ ظریفانہ چٹکلے ہون، کچھ مضحکہ آمیز واقعات ہون، اور اسی طرح کا دلچسپی کا سامان ہو، لیکن اس کے خلاف کوئی اخبار آزادانہ اظہارِ خیال کرتا ہے، تو لوگ یہ سمجھتے ہیں، کہ شاید اس اخبار کی اس مین کوئی ذاتی غرض مخفی ہے، صرف یہی نہیں، بلکہ اب حالت یہ ہے کہ اہلِ نقد و نظر بھی کسی کتاب یا ڈرامے کے شائع کرنے سے دل چراتے ہیں، کیونکہ کتابون پر جو نکتہ چینی کی جاتی ہے، اس سے بجائے نفع کے ضرر ہوتا ہے، اخبارات کو اب اس کا پورا یقین ہو گیا ہے کہ ذاتی خیالات کے ظاہر کرنے اور کسی کتاب پر ناقدانہ نظر ڈالنے سے کوئی فائدہ نہیں، اس لئے وہ اب کسی کتاب پر نکتہ چینی کے بجائے صرف کتابون پر اشتہار شائع کر دیتے ہین، اور لوگون کو کتاب کی خریداری کے جانب مائل کرنے کی غرض سے دو چار سطرین اپنی جانب سے

بھی لکھ دیتے ہین،

پس جرائد اور حکومتوں کا مشغلہ اور وظیفۂ عمل اب صرف یہ رہ گیا ہے کہ رائے عام کا تتبع کریں، یہی وجہ ہے کہ کسی اہم واقعہ یا کسی ضروری قانون یا کسی لکچر کو ان کے نزدیک اہمیت جو حاصل ہوتی ہے، تو وہ صرف اس لحاظ سے کہ اُن چیزون کا اثر لوگوں پر کیا پڑا اور اس اثر کا دریافت کر لینا کچھ مشکل بھی نہین ہوتا، کیونکہ جماعت کے افکار اس قدر تغیر پذیر ہوتے ہیں، کہ آج جس سے وہ ناراض تھی کل اُس سے وہ خوش ہو جاتی ہے اور اس بنا پر اس کے تغیر پذیر اور متنوع تاثیرات کا حال جلد دریافت ہو جاتا ہے،

غرض اس وقت جماعت کی حالتِ اضطرابی سے جو نتائج پیدا ہوئے ہین، وہ یہ ہیں کہ یقین زائل ہو گیا ہے، وجدانیات اور جذبات کا اثر غالب ہو گیا ہے اور قومین ایک حالتِ اضطراب و فوضی میں ہین، اور جدید مذاہب جو پیدا ہوے ہیں، مثلاً مذہب اشتراکیت، تو ان کے معتقدین کی حالت یہ ہے کہ وہ اجہل طبقات میں سے ہین، اور متوسط الحال طبقہ جو ہے وہ کچھ اس طرح حالتِ شک مین گرفتار ہے کہ اس کو کسی بات پر یقین ہی نہین رہا ہے،

لیکن یہ انقلاب کوئی ادھر بیس پچیس سال کے عرصہ سے لوگوں کے خیالات مین ہوا ہے، ورنہ اس سے قبل کی حالت یہ تھی کہ چونکہ افکار و خیالات چند عقائد عامہ پر مبنی ہوتے تھے، اس لئے ان کے خاص خاص اغراض متعین ہوتے تھے، مثلاً جو شخص حکومت پرست ہوتا تھا، اس کے خاص قسم کے خیالات علمی طور پر منضبط ہوتے تھے، جو جمہوریت پسند ہوتا، وہ بھی چند مخصوص خیالات کا پابند ہوتا تھا، اگر ایک شخص کا یہ اعتقاد ہوتا کہ انسان بندر سے پیدا ہوا ہے تو دوسرے کی رائے بالکل اس کے خلاف ہوتی، اگر ایک شخص کو انقلاب

وشورش سے نفرت ہوتی، تو دوسرا اسے بیحد پسند کرتا، اسی طرح بعض اسمار اس قسم کے تھے کہ ہمیشہ اُن کے ساتھ خشوع واجلال کا اظہار ضروری سمجھا جاتا تھا، مثلاً روبسپیر اور مارٹ وغیرہ، اور بعض نام وہ ہوتے تھے جن کے ساتھ ذلت وحقارت کا برتاؤ کیا جاتا تھا، مثلاً اگسٹس، قیصر اور نپولین وغیرہ، لیکن اس وقت حالت بالکل مختلف ہوگئی ہی، اور بحث ومباحثہ کی بدولت کسی خیال کی وقعت لوگون کے ذہنون میں باقی نہین رہی ہے،

لیکن باوجود اس کے ہم کو اس انتشارِ خیال سے جو ہمارے زمانہ مین پیدا ہوگیا ہے، بالکل گھبرانا نہ چاہیئے، ہان بلاشبہتہ ضرور ہے کہ یہ انتشارِ خیال قومی انحطاط وتنزل کا باعث ہوتا ہے، اور یہ بھی صحیح ہے کہ نفوسِ جماعت پر مضطرب الخیال اور اہلِ افکار لوگون سے زیادہ اُن لوگوں کا اثر پڑتا ہے، جن کے قلوب مطمئن اور خیالات راسخ ہوتے ہین، لیکن ہم کو یہ بات بھی فراموش نہین کرنی چاہیئے، کہ جب کوئی خیال یا کوئی رائے نفوس پر ایسا غلبہ حاصل کرلیتی ہے، جیسا اس وقت جماعت کو حاصل ہوگیا ہے، تو اس مین ایک استبدادی شان پیدا ہوجاتی ہے، جو تمام کائنات کو مسخر کرلیتی ہے، اور جس سے ایک مدت کے لئے حریتِ فکری کا دروازہ مسدود ہوجاتا ہے، اس لئے اب ہمارے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہین کہ ہم جماعت کے غلبہ کو تسلیم کرلیں، اگرچہ ہم یہ جانتے ہیں، کہ جماعت کا غلبہ اور تسلط ہمارے تمدن کو برباد کرکے چھوڑے گا،

باب سوم

جماعت کے مختلف اقسام کی نفسانی تشریح

فصل اوّل

جماعت کے اقسام

جماعت کی عام تقسیم وتجنیس، جماعت کی قسمین،

۱- وہ جماعتین جو مختلف عناصر سے مرکب ہوتی ہین،

ان جماعتون کے ممیزاتِ عمومی، قومیت کے اثرات، قومیت کا اثر جتنا قوی ہوتا ہے، اسی قدر روحِ جماعت ضعیف ہوتی ہے، قومیت کا اثر حالتِ تمدن کی اور جماعت کا اثر دورِ وحشت کی یادگار ہوتا ہی،

۲- وہ جماعتین جو متشابہ عناصر سے مرکب ہوتی ہین،

ان جماعتون کے اقسام، ذاتین، فرقے، طبقات وغیرہ،

صفحات بالامین ہم جماعتون کے نفسانی خصائص کو تفصیل کے ساتھ بیان کر چکے، اب جماعتون کے نفسانی خصائص کی وضاحت کرنے کے بعد ان خاص خاص اوصاف کی وضاحت کرنا بھی ضروری ہے، جو جماعت کی بعض بعض قسمون کے ساتھ مخصوص

ہوتے ہین، اس لئے اب ذیل مین ہم پہلے جماعت کے اقسام بالاجمال بیان کرتے ہیں، پھر اس کے بعد جماعت کی بعض خاص قسمون کو لے کر قسم وار خصائص کی تشریح کرینگے،

جماعتوں میں سب سے پہلے ہماری نظر جس جماعت پر پڑتی ہے، وہ ایسی جماعت ہوتی ہے، جس کے افراد کے مابین ہیں کوئی رابطۂ اتحاد بجز اس کے نظر نہیں آتا، کہ ان جماعتون کا سردار چند آوارہ گرد افراد کو اپنے ذاتی اثر سے اپنے ذاتی اغراض حاصل کرنے کے لئے مجتمع کرلیتا ہے، اس قسم کی ابتدائی جماعتوں کی مثال میں ہم اُن گروہوں کو پیش کرسکتے ہیں، جو قدیم زمانہ مین دولتِ روم پر مختلف اوقات میں حملہ آور ہوئے تھے،

پھر ان کے بعد ان جماعتون کا نمبر آتا ہے، جن میں مختلف عوامل اور ماحول کے اثر سے مختلف نفسانی خصائص کا ظہور ہونے لگا ہو، اور گو ان جماعتون مین بعض ایسے اوصاف بھی پیدا ہو جاتے ہین، جو ان ہی کے ساتھ مخصوص ہوتے ہین، لیکن یہ مخصوص اوصاف ہمیشہ جماعت کے اوصافِ عمومی کے زیر اثر رہتے ہین،

لیکن جب ان دونوں قسم کی جماعتون میں وہ اوصاف پیدا ہو جاتے ہیں جن کی تشریح صفحاتِ بالا مین گذر گئی ہے، تو اس وقت ان کو "جماعتِ نفسی"، یا "جماعتِ منتظمہ" کہتے ہیں،

ان جماعتوں کی تقسیم حسب ذیل طریقہ پر کی جاسکتی ہے،

۱۔ وہ جماعت جن کی ترکیب مختلف عناصر سے ہوتی ہے،	۱۔ غیر معروف الاسم جماعتین (جیسے شہدون الحجون، یا شوارعِ عام کی جماعتین وغیرہ)

۲- وہ جماعتین جن کی ترکیب متشابہ عناصر سے ہوتی ہے،

۲- معروف الاسم جماعتین، مثلاً (جیوریون کی جماعت یا نیابی مجالس)

۱- سیاسی اور مذہبی فرقے،

۲- پیشہ ور جماعتین،

۳- طبقات (یعنی قوم کا طبقہ اعلیٰ طبقہ متوسط اور طبقہ ادنیٰ)

(۱)

وہ جماعتین جو مختلف النسل افراد سے مرکب ہوتی ہین

یہ جماعتین جو مختلف النسل، مختلف الخیال اور مختلف العقیدہ افراد سے مرکّب ہوتی ہیں، اسی قسم کی جماعتین ہین جن کے نفسانی خصائص کی تشریح ہم نے صفحاتِ بالا میں کی ہے، یہ جماعتین عموماً ایسے افراد سے مرکب ہوتی ہین، جن کے پیشے اور کاروبار مختلف ہوتے ہیں، جب اس قسم کے چند افراد مجتمع ہو کر جماعت کی تشکیل کرتے ہیں، تو ان کے انفرادی نفسانی خصوصیات پر اُن خصائص سے پردہ پڑجاتا ہے، جو عموماً جماعتون میں پائے جاتے ہین، اور جن مین اس خصوصیت کو زیادہ اہمیت ہوتی ہے، کہ جماعت میں آکر افراد کی عقلی خصوصیتین جماعت کے جذبات و احساسات سے مغلوب ہوجاتی ہیں،

جماعاتِ مختلفۃ العناصر پر جو عوامل اثر کرتے ہیں، ان میں سے ایک عامل یعنی قومیت کا اثر ان جماعتون پر بہت گہرا ہوتا ہے، صفحاتِ بالا میں ہم متعدد جگہ بیان کر چکے ہین کہ جس طرح قومیت کا اثر افراد کے افعال و عادات پر گہرا ہوتا ہے، اسی طرح جماعتین بھی

اس اثر کی بہت زیادہ محکوم ہوتی ہیں، یہی وجہ ہے کہ جو جماعت صرف انگریزون سے مثلاً مرکب ہوتی ہے، اس کی حالت اس جماعت سے مختلف ہوتی ہے، جس مین روسی یا فرانسیسی قوم کے افراد بھی شامل ہوتے ہین،

جب چند مختلف الجنس افراد مجتمع ہوتے ہین، تو گو وہ منافع اور مقاصد جن کیلئے یہ افراد مجتمع ہوئے ہیں، ظاہر میں متحد ہون لیکن جہان تک اس جماعت کے شعور اور دماغی حالات سے تعلق ہے، ان افراد میں اختلافِ قومیت کی بنا پر ضرور کچھ نہ کچھ فرق نمایاں رہتا ہے، اشتراکیین نے اکثر ایک ایسی مجلس منعقد کرنے کا ارادہ کیا، جس مین ہر قوم کی مزدوری پیشہ جماعت کے ڈیلیگیٹ شریک ہون لیکن ہمیشہ اس کا نتیجہ باہمی اختلاف کی صورت میں ظاہر ہوا، یورپ کی قومون میں باہم اتنا اختلاف ہے کہ اگر لاطینی قوم کا میلان اس جانب ہے کہ تمام قومی فرائض کو حکومت انجام دے تو اس کے مقابلہ میں انگریزی قوم حکومت کے دائرۂ عمل کو بہت محدود کر دیتی ہے، اور اگر لاطینی قومین افراد کی حریتِ شخصی اور استقلالِ ذاتی کو عملاً ہیچ سمجھتی ہیں تو اس کے مقابلہ میں انگریزی قوم میں تمام کام افراد کے ذاتی استقلال اور ان کی ذاتی ہمت سے انجام پاتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ قومی اختلافات کی بنا پر یورپ کے اشتراکیین اور جمہوریت پسندون کے اصول اور مذاہب میں ہم کو نمایان اختلاف نظر آتا ہے،

قومیت کا اثر جماعت پر اس قدر گہرا ہوتا ہے کہ یہ اثر جماعت کے حرکات و سکنات میں ہمیشہ پیش پیش اور نمایان رہتا ہے، اسی مقام پر سے یہ کلیہ قائم کیا گیا ہے، کہ قومیت کی روح جتنی زیادہ قوی ہو گی، اسی قدر جماعت میں انحطاط پذیر اوصاف کا اثر ضعیف ہو گا، بات یہ ہے کہ جماعت کی روح دورِ توحش کی یادگار ہے، اور جب اس روح کا غلبہ

ہوتا ہے، تو جماعت سے وحشت کے افعال صادر ہونے لگتے ہیں، لیکن قومیت کی روح دورِ تمدن کی یادگار ہے، تو جب تک جماعت پر اس روح کا غلبہ رہتا ہے، اُس وقت تک قوم جماعت کے اثر و غلبہ سے اطمینان میں رہتی ہے،

اس قسم کی مختلفۃ العناصر جماعتوں کے تحت میں بعض وہ جماعتین شامل ہیں، جو مجہول الاسم ہوتی ہیں، مثلاً شوارعِ عام کی جماعتین یا شہدوں کی جماعتین وغیرہ، اور بعض جماعتین وہ ہوتی ہیں جو خاص خاص اسمار کے ساتھ مشتہر ہوتی ہیں، مثلاً جیوریوں کی جماعتین، اور نیابی مجلسین وغیرہ، ان دونوں قسم کی جماعتوں میں جو اختلاف و امتیاز ہوتا ہے، وہ یہ ہے، کہ پہلی قسم کی مجہول الاسم جماعتین اپنے نتائجِ اعمال کی ذمہ دار نہیں ہوتین، اور دوسری قسم کی جماعتین اپنے نتائجِ اعمال کی ذمہ دار ہوتی ہیں،

(۲)

وہ جماعتین جو متحد النسل افراد سے مرکب ہوتی ہیں

وہ جماعتیں جو متحد النسل افراد سے مرکب ہوتی ہیں، ان کی تین قسمیں ہیں،

۱- فرقے (۲) پیشہ ور جماعتین (۳) طبقات،

ان اقسام میں فرقوں کا پہلا مرتبہ ہے، جن کی ترکیب اُن افراد سے ہوتی ہے جو تربیت اور پیشہ میں مختلف ہوتے ہیں، لیکن جن کے درمیان رابطۂ اتحاد صرف وحدتِ اعتقاد سے ہوتا ہے، ان جماعتوں میں دینی اور سیاسی فرقے شامل ہیں، ان کے بعد دوسرا درجہ پیشہ ور جماعتوں کا ہے، جن کی تشکیل اُن افراد سے ہوتی ہے جو پیشہ اور تربیت میں متحد ہوتے ہیں، مثلاً فوجی جماعتین وغیرہ، پھر ان کے بعد سب سے اعلیٰ مرتبہ طبقات کا ہے، جن کی

تشکیل اُن افراد سے ہوتی ہے جن کے درمیان رابطۂ اتحاد نہ تو فرقوں کی طرح وحدتِ اعتقاد سے ہوتا ہے، اور نہ پیشہ ور جماعتوں کی طرح وحدتِ تربیت سے بلکہ جن کے ذرائعِ معاش متحد ہوتے ہیں، ان کی مثال زراعت پیشہ دیہاتی وغیرہ ہیں،

لیکن چونکہ اس کتاب میں میرا مقصود صرف جماعاتِ مختلفۃ العناصر سے بحث کرنا ہے، اور میرا ارادہ یہ ہے کہ جماعاتِ مؤتلفۃ العناصر سے ایک جداگانہ کتاب میں بحث کروں اس لئے اب میں جماعاتِ مؤتلفۃ العناصر کے بیان کو زیادہ طول دینا نہیں چاہتا، اور جماعاتِ مختلفۃ العناصر کے بعض مخصوص اقسام سے بحث کر کے کتاب کو ختم کرتا ہوں،

فصل دوم

جرائم پیشہ جماعتیں

جرائم پیشہ جماعتیں، جماعت قانون کی نگاہ میں مجرم ہو سکتی ہے، مگر فلسفیانہ نگاہ میں اس کو مجرم نہیں کہا جا سکتا، جماعت سے غیر شعوری کی حالت میں افعال کا صدور ہوتا ہے، بیانِ ماسبق کی مختلف مثالین، ماہ ستمبر کی شورہ پشت جماعت کے افعال کی نفسانی تشریح اس جماعت کے افکار، اس کے شعور، اور اس کے اخلاق پر بحث،

چونکہ ایک مدت تک مختلف ہیجات اور عوامل کے زیر اثر رہتے رہتے جماعت پر غیر شعوری کی ایک ایسی کیفیت طاری ہو جاتی ہے کہ وہ آلۂ ہیجان ہو کر تمام اوامر و احکام کی تعمیل کرنے لگتی ہے، اور اسی حالت میں اس سے بعض اوقات جرائم کا ارتکاب بھی ہو جاتا ہے، اس لئے عام استعمال اور علم النفس کی کتابوں میں جماعتون کے جانب مجرمانہ افعال کا بھی انتساب کیا گیا ہے، لیکن میرے خیال مین فلسفیانہ حیثیت سے جماعت کی جانب مجرمانہ افعال کا انتساب کرنا سخت غلطی ہے، یہ صحیح ہے کہ جماعت کے بعض افعال بعض اوقات جرم کی حد کے اندر آجاتے ہیں، لیکن یہ جرائم اسی طرح

کے ہوتے ہیں، جس طرح درندے جرائم کا ارتکاب کرتے ہیں، اور باوجود اس کے درندوں کو کوئی مجرم نہیں کہتا، بات یہ ہے کہ جماعت سے جو جرائم سرزد ہوتے ہیں، وہ کسی ہیجِ شدید کی بدولت اس سے وقوع میں آتے ہیں، اور اس ہیجِ شدید سے متاثر ہو کر جو افراد ان جرائم کا ارتکاب کرتے ہیں، وہ یہ نہیں سمجھتے کہ وہ جرائم کا ارتکاب کر رہے ہیں بلکہ وہ یہ سمجھتے ہیں، کہ وہ ایک واجب یا فرض ادا کر رہے ہیں، اور ظاہر ہے کہ یہ شان مجرموں کی نہیں ہوتی ہے،

اس طرح کے واقعات میں سے ایک واقعہ قلعہ باسٹل کے مہتمم جیل موسیو لونی کے قتل کا ہے، تفصیل اس واقعہ کی یہ ہے، کہ قلعۂ باسٹل پر انقلاب فرانس کے زمانہ میں جب شورش پسندوں کا قبضہ ہو گیا تو باغیوں نے وہاں کے مہتمم جیل کو گھیر لیا، اور اس بیچارے پر ہر طرف سے بوچھار شروع ہو گئی، کوئی اس کے بابت پھانسی دینے کی رائے دیتا تھا، کوئی کہتا تھا، کہ اس کو قتل کر دینا چاہئے، کسی کی رائے یہ تھی کہ نہیں گھوڑے کی دم میں باندھ کر اس کی تشہیر کرنا چاہئے، غرض اس کی بابت ہر شخص ایک نئی رائے دیتا تھا اور وہ بیچارہ مدافعت میں مشغول تھا، کہ اتفاق سے باغیوں کے گروہ میں سے ایک شخص کے اس کی لات لگ گئی، بس پھر کیا تھا، مجمع غصہ سے بیتاب ہو گیا، اور رائے یہ قرار پائی کہ اس کی لات جس شخص کے لگی ہے، وہ اس کو قتل کرے، راوی بیان کرتا ہے کہ لات جس شخص کے لگی تھی وہ ایک تماشہ بین نانبائی تھا، جو وہاں تماشہ دیکھنے گیا تھا، اس نے جو یہ سنا، کہ مجھے مہتمم جیل کو قتل کرنا ہوگا، تو وطن پرستی کے جوش کی بنا پر اسے خیال پیدا ہوا کہ اچھا میں وطن کا ایک فرض ادا کر کے ایک تمغہ حاصل کرونگا، اس جوش میں آکر اس نے تلوار کا ایک وار کیا، لیکن وار خالی گیا، جھنجھلا کر اس نے

جیب سے چھرا نکالا اور اس سے شخص جمیل کا کام تمام کر دیا،

اس مثال سے ظاہر ہوتا ہے کہ کس طرح غیر شعوری کی حالت مین جماعت سے جرائم کا صدور ہوتا ہے، اسی واقعہ میں دیکھو کہ جماعت کس طرح خارجی تحریک سے غصہ میں آگئی، اور قاتل یہ سمجھتا رہا کہ وہ وطن کا فرض ادا کر رہا ہے، پس اس طرح کے افعال جو جماعت سے صادر ہوتے ہیں، گو قانوناً جرم سمجھے جا سکتے ہیں، مگر علم النفس کے نقطۂ نظر سے وہ کسی طرح جرم کی حد مین داخل نہیں ہیں،

جرائم پیشہ جماعتوں کو دوسری جماعتون سے کسی بات میں امتیاز نہین ہوتا اور اُن جماعتون میں بھی تقریباً وہ تمام خصائص پائے جاتے ہیں، جن کا ظہور دیگر جماعتون میں ہوتا ہے، اور جن کو ہم صفحات بالا میں بالتفصیل بیان کر چکے ہین، مثلاً اثر پذیری، تلوّن مزاجی اور ضعفِ عقلی وغیرہ،

اب ہم ذیل میں جرائم پیشہ جماعتون کے خصائص پر مفصل نظر ڈالنے کے لئے ایک خاص جماعت کے کارناموں کو تفصیل سے بیان کرتے ہیں جس سے جرائم پیشہ جماعتون کے اوصاف کی نفسانی تشریح اچھی طرح ہو جائے گی، ماہ ستمبر کے فتنہ کا واقعہ فرانس کی تاریخ میں ایک افسوسناک یادگار ہے، اور گو واقعۂ ماہ ستمبر کی جماعت اور واقعۂ سینٹ بارتھولومیو کی جماعت کے اوصاف میں نمایان مشابہت پائی جاتی ہے، مگر میں یہان واقعۂ ماہ ستمبر[1] کے تفصیلی حالات موسیو ٹائن سے لیکر نقل کرتا ہوں، جو واقعۂ انقلاب فرانس کا بہترین مورخ ہی

[1] یہ مشہور حادثہ زمانہ انقلاب فرانس میں ماہ ستمبر ۱۷۹۲ء پیرس میں وقوع پذیر ہوا، اس واقعہ کا باعث ایک شخص مارٹ نامی تھا یہ شخص پہلے طبیب تھا، پھر ایک اخبار کا اڈیٹر ہو گیا، اس کا یہ خیال تھا کہ ۲۷۰ آدمیون کو وطن کے فدیہ میں پھانسی دیدینا چاہیے، (مؤلف)

ہم کو اس سے غرض نہیں کہ واقعہ ماہ ستمبر کے فساد کا بانی کون تھا، ڈانٹن یا کوئی اور،[1] بہرحال اس واقعہ میں ہماری بحث کا تعلق جس بات سے ہے وہ یہ ہے کہ باغیوں کی جماعت میں ایک ایسی تحریک پیدا کر دی گئی، جس سے اس جماعت کے تمام افراد متاثر ہو گئے، اور جماعت وحشیانہ افعال کا ارتکاب کرنے لگی،

باغیون کی یہ جماعت تین سو جلادوں سے مرکب تھی، جو سب کے سب مختلف ذاتوں اور مختلف فرقوں سے تعلق رکھتے تھے، ان میں دوکاندار، پیشہ ور، دست کار، معمار، سرکاری ملازمین، اور دلال سبھی طرح کے لوگ تھے، اور سب ایک ہی مہیج کے زیر اثر تھے، اور سب کا اعتقاد یہ تھا کہ وہ ایک وطنی خدمت انجام دے رہے ہین، ان لوگون نے جو پہلا کام کیا وہ یہ تھا، کہ ایک خاص عدالت کا محکمہ ایجاد کیا، اس محکمہ نے تفتیش کر کے ملزمین کی ایک فہرست تیار کی، اور یہ قرار پایا کہ سب سے پہلے امرا، پادریوں، ملازمین پولیس اور سرکاری ملازمون کو قتل کرنا چاہیے، غرض کہ جتنے لوگ اس محکمہ کے نزدیک مجرم قرار پائے وہ بلا رو و رعایت تلوار کے گھاٹ اتارے گئے اور شہر میں ایک فتنہ محشر خیز برپا ہو گیا، عام باشندون کے قتل کرنے کے لئے کسی خاص حکم کی ضرورت نہ تھی، بلکہ قتل خود ایک قضاے مبرم تھا، لیکن خاص خاص لوگون کے قتل کے لئے علی حسب مراتب احکام صادر کئے جاتے تھے، اس فتنہ میں جس قساوت قلبی اور وحشت کا اظہار کیا گیا ہے، وہ بیان سے باہر ہے، لیکن باوجود اس کے یہ عجیب بات تھی، کہ اس قساوت قلبی کے مقابلہ میں لطف و مہربانی کے نمونے بھی کہیں کہیں نظر پڑتے تھے،

چنانچہ یہ ایک واقعہ قابل ذکر ہے کہ اتفاق سے اس جماعت مین ایک

[1] صحیح یہ ہے کہ اس فساد کا بانی ایک شخص موراٹ نامی تھا،

شخص کو معلوم ہوا، کہ قیدیوں کو چھ گھنٹے سے متواتر پانی نہین ملا ہے، یہ سنکر وہ فوراً غصہ مین آگیا، اور مہتمم جیل پر جھپٹ پڑا، لیکن جب قیدیوں نے خود ہی اس کی سفارش کی تو اس نے چھوڑ دیا، اسی طرح جب عدالت سے کوئی مجرم بری کیا جاتا تو یہ لوگ بہت خوش ہوتے، اور وفورِ مسرت سے تالیان بجاتے اور جب زیادہ وجد مین آجاتے، تو ناچنے گانے لگتے تھے، عورتوں کے لئے بھی ایک جگہ مخصوص کردی گئی تھی، جہان سے وہ قتل وغارت کے مہیب منظر کا تماشہ دیکھتی تھیں، لیکن جب لوگوں نے یہ شکایت کی کہ عورتون اور دیگر تماشہ بینوں کو تماشہ اچھی طرح نظر نہیں آتا، تو اس وقت سے یہ حکم ہوگیا کہ ملزمین کو دو دو صفین گھیرے رہا کرین، اور آہستہ آہستہ چلا کرین تاکہ تماشہ بینوں کی نظر کے سامنے یہ تماشہ دیر تک رہا کرے، بعض لوگ ملزمین کو برہنہ کرکے میدانِ قتل مین لاتے، اور اس کے بعد ان کے پیٹ پھاڑتے، یہ عجیب دردناک منظر ہوتا تھا، لیکن ان دردناک منظروں میں کہیں کہیں دیانت وامانت کی مثالین بھی نظر پڑجاتی تھین، یہ لوگ مقتولین کے مال وزر کو بالکل ہاتھ نہین لگاتے تھے، بلکہ تمام مال وزر اور جواہر لاکر ججوں کے سامنے پیش کردیتے تھے،

اس کے علاوہ جو دلائل وبراہین وہ قائم کرتے تھے، وہ نہایت سادہ لوحی پر مبنی ہوتے تھے، چنانچہ جب یہ لوگ ایک ہزار دو سو یا ایکہزار پانچسو آدمیوں کو (باختلافِ روایت) قتل کرچکے، تو ان کو خیال ہوا کہ دوسرے قیدخانون میں بھی بہ کثرت آدمی سڑگل رہے ہیں، ان کو بھی قتل کردینا چاہئے اور قیدخانون میں اتفاق سے جو لوگ تھے، وہ نہایت بیکس اور غریب تھے، اور زیادہ حصہ ان میں عورتون اور نابالغون کا تھا، ان لوگوں نے خیال کیا کہ یہ قیدی اگرچہ مجرم نہین ہیں، اور نہایت غریب اور بالکل

بے گناہ ہیں، لیکن ممکن ہے کہ آگے چل کر یہ لوگ قوم و وطن کے دشمن نکلین، اس لئے ان کو مٹا دینا ہی اچھا ہی، ان قیدیوں میں ایک عورت تھی جس کا شوہر زہر دے کر مار ڈالا گیا تھا اس کے متعلق بعضون نے یہ راے قائم کی کہ یہ عورت اپنے قید ہونے پر غصہ مین تو ضرور ہو گی، اگر کہیں اتفاق سے یہ چھوڑ دی گئی تو یہ غصہ کے مارے پیرس میں آگ لگا دے گی اس لئے اس کو تو ضرور ہی قتل کر دینا چاہیئے، اس راے کو سب نے بسر و چشم قبول کیا، اور بیچاری عورت اور اس کے ساتھ پچاس نوعمر لڑکے سترہ سترہ، اٹھارہ اٹھارہ برس کی عمر کے تہ تیغ کر ڈالے گئے، اس پر ان جلادوں کا یہ قول تھا کہ اچھا ہوا کہ قتل کر دیئے گئے، ورنہ یہ اگر زندہ رہ جاتے، تو سب سے بڑھ کر یہی قوم و وطن کے دشمن نکلتے، اچھا ہوا جو انسے نجات ملگئی،

غرض یہ مشق جفا کامل ایک ہفتہ تک جاری رہی، اور اس کے بعد جب یہ لوگ قتل کرتے کرتے تنگ آگئے، تو اس وقت ان کو یہ خیال پیدا ہوا کہ چونکہ انھوں نے وطن کی ایک بیش بہا خدمت انجام دی ہے، اس لئے انھین تمغہ اور انعام ملنا چاہیئے، یہ تفصیل ہے اس عبرتناک واقعہ کی،

اس واقعہ کے علاوہ ۱۷۸۱ء کی بغاوت کے دوران میں بھی بہت سے واقعات اسی طرح کے پیش آئے، اور آیندہ بھی ذرا جماعت کے اثر و غلبہ کو ترقی ہونے دو تو دیکھنا کیا کیا وقوع پذیر ہوتا ہے،

فصل سوم

فوجداری عدالتوں کی جیوریاں

فوجداری عدالتوں کی جیوریاں، جیوری کے خصائص، عمومی اعداد وشمار سے پتہ چلتا ہی کہ جیوریوں کے فیصلوں پر ان کی نوعیتِ تشکیل سے کوئی اثر نہیں پڑتا، جیوری کے ممبر کس طرح دفعتہً اثر پذیر ہو جاتے ہیں، عقلی دلیل کا جیوریوں کی رائے پر کوئی اثر نہیں پڑتا، مشہور بیرسٹر کن طریقون سے جیوری کی رائے پر اثر ڈالتے ہیں، وہ کون سے جرائم ہیں، جن کے ارتکاب کرنے والے جیوری کے جذبۂ تلطف کو اپنی جانب جذب کر لیتے ہیں، جرائم کی تحقیقات میں جیوری کے توسط کے فوائد اور یہ بحث کہ اگر جرائم کی تحقیقات میں جیوریوں کی رایوں سے فائدہ نہ اٹھایا جائے تو عدل وانصاف میں رکاوٹ پیش آئے،

چونکہ ہم جیوریوں کے تمام اقسام پر اس کتاب میں مفصل بحث نہیں کر سکتے، اس لئے ذیل میں ہم صرف فوجداری عدالتون کی جیوریوں سے بحث کریں گے، جو مختلف جماعتوں کا ایک نہایت کامل نمونہ ہوتی ہیں، دیگر جماعتون کی طرح جیوریوں کی جماعتین جماعت کے اُن تمام اوصاف سے متصف ہوتی ہین، جن کا ذکر صفحاتِ بالا

میں گذر چکا ہے، دیگر جماعتوں کی طرح یہ جماعتیں بھی سریع الانفعال اور متلون المزاج ہوتی ہیں، دیگر جماعتون کی طرح ان جماعتوں کے فیصلے بھی عقلی پہلو سے گرے ہوتے ہیں، اور دیگر جماعتون کی طرح یہ جماعتیں بھی اپنے اپنے لیڈروں کی تابعِ فرمان ہوتی ہیں، غرض ان جماعتوں میں بھی وہ تمام اوصاف پائے جاتے ہیں جو نفسِ اجتماعی کا خاصہ ہیں، اور جن کا تذکرہ صفحاتِ بالا میں گذر چکا ہے،

جیوریوں کی حالت کا اندازہ کرنے کی غرض سے ہماری نظر سب سے پہلے جیوریوں کی تجاویز اور فیصلوں پر پڑتی ہے، یہ جماعتیں عموماً جو فیصلے صادر کرتی ہین، ان کے دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ چونکہ جماعت پر روشن عقلون کا کچھ اثر نہیں پڑتا، اس لئے جیوریوں کی تجاویز اور فیصلے بھی عقلی پہلو سے گرے ہوتے ہیں، اور اگر اہلِ فن اور اہلِ علم لوگ بھی اپنے اپنے علوم وفنون کے حدود سے تجاوز کرکے فوجداری عدالتون کے مقدمات کے فیصلے تحریر کریں، تب بھی ان کے فیصلے ان فیصلوں سے زیادہ وسیع نہ ہوں گے، جو عام قابلیت کے لوگ صادر کرتے ہیں، ۱۸۴۸ء کے پیشتر جیوریوں کا انتخاب عموماً روشن خیال اور اہلِ علم طبقہ سے کیا جاتا تھا، لیکن اب اس زمانہ میں یہ بات موقوف ہوگئی ہے، اور اب ان کا انتخاب عموماً حرفت پیشہ گروہ سے کیا جاتا ہے، علماے اعداد نے شمار و اعداد سے بتایا ہے کہ جیوریوں کا انتخاب خواہ کسی گروہ سے کیا جاتا ہے ان کے فیصلے ہمیشہ یکسان ہوتے ہیں، بلکہ اس واقعہ کا اعتراف علمار کے علاوہ خود ججوں نے بھی کئی بار کیا ہے، موسیو ڈیوی گلاگو سابق جج عدالتِ فوجداری نے اپنی کتاب میں لکھا ہے:-

اس زمانہ میں جیوریون کے انتخاب کا حق میونسپلٹیوں کو تفویض کردیا گیا ہے، جو

اپنے سیاسی اغراض کی بنا پر جیوریوں کا انتخاب کرتی ہیں، اور عموماً اس زمانہ میں تجارت پیشہ طبقہ اور کم حیثیت لوگوں میں سے جیوریوں کا انتخاب کیا جاتا ہے، لیکن باوجود اس کے ان جیوریوں کی تجاویز اور فیصلے بھی اسی رتبہ کے ہوتے ہیں جس رتبہ کے ان کے پیشرو اہلِ علم جیوریوں کے ہوتے تھے،

عبارتِ بالا سے جو نتیجہ اخذ ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ جیوریوں کی تجاویز اور فیصلے عموماً صحیح اور انصاف پر مبنی ہوتے ہیں، البتہ عقلی پہلو سے ان میں ضعف ضرور ہوتا ہے، لیکن اگر فیصلے عقلی پہلو سے ضعیف ہوتے ہوں تب بھی تعجب کی کونسی بات ہے، اس لئے کہ تمام بیرسٹر اور جج عموماً جماعتوں کے نفسانی حالات سے ناواقف ہوتے ہیں، موسیو لاشاڈ جو عدالتِ فوجداری کا ایک کامیاب بیرسٹر تھا، ہمیشہ ججوں اور جیوریوں کی رائے سے مخالفت کیا کرتا تھا، لیکن اب تجربہ سے یہ بات معلوم ہوگئی ہے کہ روشن خیال ججوں کی رائے سے اختلاف کرنا بالکل بے کار ہوتا ہے، چنانچہ اب پیرس کے بیرسٹروں نے عموماً یہ عادت ترک کردی ہے، لیکن باوجود اس کے جیسا کہ موسیو گلاگو نے تحریر کیا ہے، ججوں اور جیوریوں کے فیصلوں میں اب بھی کسی قسم کا تغیر نہیں نظر آتا، اور اس زمانہ میں بھی جیوریوں کے فیصلے نہ سابق فیصلوں سے زیادہ منصفانہ ہوتے ہیں اور نہ نامنصفانہ،

جیوریوں کی جماعت بھی، دیگر جماعتوں سے اس بات میں مشابہ ہوتی ہے، کہ اس پر جذبات کا غلبہ زیادہ ہوتا ہے، اور دیگر جماعتوں کی طرح ممبرانِ جیوری بھی عقلی استدلال سے اثر پذیر نہیں ہوتے، ایک بیرسٹر کا مقولہ ہے کہ اگر کوئی عورت ان کے سامنے لائی جائے جو غریب ہو، اور ایک بچہ کو دودھ پلاتی ہو، یا اگر چھوٹے چھوٹے یتیم بچے ان کے سامنے پیش کئے جائیں، تو وہ جوشِ رقت سے بیتاب ہوجاتے ہیں، اور جادۂ انصاف سے ہٹ

جاتے ہیں، موسیو گلا گو لکھتے ہیں :-

" جیوری کی توجہ کو اپنی جانب جذب کرنے کے لئے صرف اتنا ہی کافی ہوتا ہے کہ عورت ذرا ظریف طبع ہو"

عموماً جن جرائم سے خود خوف کھاتے ہیں، اور ہیئتِ اجتماعی کے لئے مضر ہوتے ہیں، ان کے ارتکاب پر توجج آپے سے باہر ہو جاتے ہیں، لیکن ایسے جرائم جن کا ارتکاب محض جذبۂ محبت کی بنا پر کیا گیا ہو، اور جو ہیئتِ اجتماعی پر مضر اثر نہ ڈالتے ہوں، ان کے ارتکاب سے ججوں کو کچھ خیال بھی نہیں ہوتا، پس اگر ان کے سامنے ایسی عورتیں پیش کی جائیں جن کو بدمعاش لوگ گھروں سے بھگالے گئے ہوں، تو اس پر ان کو سخت غصہ آتا ہے، کیونکہ ان کے خیال میں یہ ہوتا ہے کہ جس ملک میں قانون اس قسم کے جرائم کا انسداد نہ کرے، وہاں گھر بار بالکل محفوظ نہیں رہ سکتا، اس لئے اس قسم کے جرائم پر وہ غصہ سے بیتاب ہو جاتے ہیں،

دیگر جماعتوں کی طرح ججوں اور جیوریوں کی جماعتیں بھی نفوذ سے بہت جلد اثر پذیر ہوتی ہیں، موسیو گلا گو نے کیا خوب کہا ہے کہ جج اور جیوری اپنے خیالات میں خواہ کتنے ہی جمہوریت کے حامی ہوں، لیکن عملاً وہ بالکل آزاد نہیں ہوتے حسب ونسب دولت و ثروت، شہرت، اور کسی مشہور بیرسٹر کی پیروکاری، یہ سب ذرائع ہیں جن سے جج کی رائے پر بہت بڑا اثر پڑتا ہے،

ججوں اور جیوریوں کی رائے پر جس تدبیر سے اثر ڈالنا چاہیئے، اس کی کیفیت ایک کامیاب انگریز بیرسٹر نے خوب بیان کی ہے، جسے میں یہاں نقل کرتا ہوں، وہ لکھتا ہے :-

"سب سے پہلے بیرسٹر کے لئے لازمی ہے کہ وہ برابر جج کی رائے پر اثر ڈالنے کی کوشش کرتا رہے، تقریر تھوڑی ہو اور استدلال سے گریز کرے، تقریر کرتے وقت جج کے حرکات و سکنات کی نگرانی اور مناسب موقع و وقت کی تلاش بھی ضروری ہے، سب سے زیادہ اس بات کی نگرانی کرتے رہنا لازمی ہے کہ میرے الفاظ اور جملوں سے جج کے چہرے پر کیا آثار طاری ہوتے ہیں، اپنے سامنے کی صف میں جو جج بیٹھے ہوں، پہلے ان کے چہروں کو بغور دیکھنا چاہئے پھر ان کے بعد والے ججوں کے چہروں کو، آخر میں اس جج کی جانب توجہ کرنا چاہئے، جو بیرسٹر کی رائے کے خلاف ہے، اور حتی الامکان یہ کوشش کرنا چاہئے کہ کسی طرح یہ جج اپنی رائے پلٹ دے، اور یہ سب سے زیادہ مشکل ہے"

سطور بالا میں بیرسٹر مذکور نے گویا فن خطابت کی تلخیص کر دی ہے، اور بتا دیا ہے کہ خطیب اپنے خطبہ کے پہلے ہی حصہ میں جو کامیاب نہیں ہوتا، تو اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ نفوسِ سامعین میں اس کے خطبہ سے جو اثر پیدا ہوتا ہے، اس کے مطابق اسے اپنے خطبہ میں تغیر کرنا پڑتا ہے، اس لئے خطیب کو اس وقت تک کامیابی نہیں ہوتی تاوقتیکہ خطبہ کے سلسلہ میں وہ سامعین کے جذبات وخیالات کا پورا اندازہ نہ کرلے، اور یہ بات خطبہ کے ابتدائی حصہ سے حاصل نہیں ہوتی،

پھر یہ کچھ ضروری نہیں ہے کہ بیرسٹر تمام ججوں کی رایوں کو اپنے موافق بنا لینے کی کوشش کرے، بلکہ صرف یہ کافی ہے کہ جو جج سب کا رئیس ہے، اسی کی رائے پر اثر ڈالا جائے، اور جہاں اس نے اپنی رائے پلٹی بس فوراً اسی کی رائے کی جانب اغلبیت ہو جاتی ہے، مذکور الصدر انگریز بیرسٹر لکھتا ہے :-

"مجھے تجربہ سے معلوم ہوا ہے کہ جب فیصلہ کے تحریر کرنے کا وقت آتا ہے تو صرف دو یا ایک ججوں کی راے دوسروں کو بھی اپنا ہم خیال بنالیتی ہے"

پس یہ ضروری ہے کہ ان دو یا تین ججوں کو ہوشیاری سے اپنا موافق بنالیا جائے تو فیصلہ بھی اپنے موافق ہو جاتا ہے، اس غرض کے حاصل کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ بیرسٹر پہلے ہی سے کوشش کر کے ججوں کو حیرت واستعجاب میں ڈالدے، کیونکہ جماعت جب کسی شخص کو حیرت واستعجاب کی نظر سے دیکھنے لگتی ہے، تو اس کے ادلہ و براہین کو خوب کان دھر کر سنتی ہے، میں نے موسیو لاشاڈ کے حالات میں حسب ذیل واقعہ پڑھا ہے، جس کو میں یہاں نقل کرتا ہوں،

مشہور ہے کہ مشہور بیرسٹر لاشاڈ اکثر بحث کرنے میں اس بات کی بے حد کوشش کرتا تھا، کہ دو ایک جج جن کو وہ صاحب نفوذ پاتا، اس کے ہمخیال بن جائیں، اور اس تدبیر سے موسیو لاشاڈ اکثر کامیاب ہو جایا کرتا تھا، ایک مرتبہ اتفاق ایسا ہوا، کہ کسی مقدمہ میں موسیو لاشاڈ قریب ایک گھنٹہ تک بحث کر کے تھک چکا تھا اور مختلف تدبیروں سے اس بات کی کوشش کر رہا تھا، کہ کسی طرح ایک خاص جج جس کی راے موسیو لاشاڈ کے خلاف تھی، اس کا ہم خیال ہو جائے، جب سب تدبیروں پر وہ عمل کر چکا، اور کسی طرح کامیابی نہ ہوئی، تو ایک دفعہ تقریر کرتے کرتے یکایک خاموش ہو گیا، اور چیف جج سے مخاطب ہو کر کہنے لگا، کہ "فلاں جج صاحب کی آنکھوں پر دھوپ پڑ رہی ہے، مہربانی فرما کر چک ڈلوا دیجئے" یہ کہنا تھا کہ اس جج کے لبوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی اور فوراً اپنی راے پلٹ کر وہ بھی لاشاڈ کا ہم خیال بن گیا،

جیوریوں کے طبقہ سے ججوں کو انصاف کرنے میں جو سہولت ہوتی ہے، اُس کو

نظرانداز کرکے اس زمانہ میں اہلِ صحافت وانشار کے طبقہ سے ایک فرقہ اٹھ کھڑا ہوا ہے جو جیوریوں کے نظام پر سختی سے نکتہ چینی کر رہا ہے، حالانکہ اس کو یہ معلوم نہیں کہ ججوں کی جماعت سے جو غلطیاں سرزد ہوتی ہیں ان کی نگرانی جیوریوں ہی کی جماعت کرتی ہے، بخلاف اس کے بعضوں کی یہ راے ہے کہ جیوری کے طبقہ کو بحال تو رکھنا چاہئے، مگر صرف روشن خیال طبقہ تک اس کے دائرہ کو محدود کر دینا چاہئے لیکن ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ تجویز اور فیصلہ کا جہاں تک تعلق ہے، روشن خیال اور غیر روشن خیال دونوں طبقے اس بارے مین یکسان ہیں،

لیکن ایک فرقہ اور ہے جس کی رائے یہ ہے کہ چونکہ جیوریوں سے غلطیاں واقع ہوتی ہیں، اس لئے ان کو قاضی اور جج بنا دینا چاہئے، میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ لوگ جن غلطیوں کا انتساب جیوریوں کے جانب کرتے ہین، انھیں یہ نہیں معلوم کہ اسی قسم کی غلطیاں ججوں سے بھی سرزد ہوتی ہیں، مجرم جب ان کے سامنے لایا جاتا ہے تو وہ اول دہلہ میں اس کی بابت مجرم ہونے کی راے قائم کر لیتے ہیں، پس اگر جیوریوں کو نظرانداز کرکے آخری فیصلہ کا حق صرف ججوں کو تفویض کر دیا جائے، تو بیچارہ مجرم اپنی برٔیت کی کوشش کس طرح کرے گا، یہ صحیح ہے کہ جیوریوں سے غلطیاں ہوتی ہیں لیکن جیوری سے پہلے خود جج غلطی کا ارتکاب کرتے ہیں، بس اصل الزام خود ججوں پر ہے، حال ہی میں یہ واقعہ گذرا ہے کہ ایک ڈاکٹر پہ ایک نوجوان سادہ لوح عورت نے یہ الزام قائم کیا تھا کہ اس نے تیس فرنک کے عوض میں اس کا حمل ساقط کر دیا، اس بیان کو سن کر ججوں نے فوڑًا اس کے لئے سزا تجویز کر دی، اگر راے عام اس فیصلہ کے خلاف نہ ہوتی تو وہ بیچارہ ماخوذ ہو کر جیل میں جا چکا تھا، اس واقعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ باوجودیکہ لوگ عام طور پہ

مجرم کو بری سمجھتے تھے، لیکن ججوں کو خواہ مخواہ اس کے مجرم ہونے پر اصرار تھا،
حاصل یہ ہے کہ جب کوئی مقدمہ پیچیدہ ہوتا ہے تو چونکہ جیوریوں کو اس کے اصلی حالات
کا علم کم ہوتا ہے، اس لئے وہ مجبور ہو کر ججوں کی رائے سے اتفاق کر لیتے ہیں، کیونکہ وہ
دیکھتے ہیں کہ یہ لوگ خود ان مسائل سے خوب واقف ہیں، یہ کیا غلطی کریں گے، پس اب
بتاؤ کہ اصلی خطاوار کون ہوتا ہے، ممبرانِ جیوری یا خود جج صاحبان، حقیقت یہ ہے کہ جس
طرح ہم نفیس چیزوں کی قدر کرتے ہیں، اسی طرح ہم کو جیوریوں کی جماعت کی بھی قدر کرنا چاہئے،
کیونکہ صرف یہی ایک طبقہ ہے جو قانون کی سختی اور شدت کا مقابلہ کر سکتا ہے، قانون کے
دفعات تو بالکل مطلق اور عام ہوتے ہیں، ان میں شواذ و نوادر کا کچھ لحاظ نہیں ہوتا، اور
جج صرف قانونی صراحت کی پابندی کرتے ہیں، ان کو اس بات کا خیال نہیں ہوتا، کہ ایک
شخص جو بھولی بھالی لڑکی کو بھگا کر لے گیا، اور پھر اس نے اس کو چھوڑ دیا، ان دونوں میں
سے لڑکی مجرم نہیں ہے، بلکہ بھگانے والا مجرم ہے، بخلاف ممبرانِ جیوری کے کہ وہ اس بات
کو خوب سمجھتے ہیں کہ اس لڑکی سے زیادہ وہ شخص مجرم ہے جو اس کو بھگا کر لے گیا،

یہ تفصیل ہے جیوریوں کی جماعت کے نفسیات کی، اور مجھے تو فی الواقع جیوریوں
کی جماعت غلطی کا ارتکاب کرتے ہوئے نظر نہیں آتی، بلکہ میرے نزدیک تو جج زیادہ غلطیاں
کرتے ہیں، ججوں کی حالت اس جماعت کی سی ہوتی ہے، جو لینت اور شفقت کے مفہوم
سے ناآشنا ہوتی ہے، اور جیوری کی حالت اس جماعت کی ایسی ہے جو مجسمہ شفقت اور
ہمہ تن رحم ہوتی ہے،

فصل چہارم

ووٹ دینے والی جماعتیں

ووٹ دینے والی جماعتوں کے خصائصِ عمومی، یہ بحث کہ امیدوارِ انتخاب کو کن اوصاف کا جامع ہونا چاہیے، امیدوارِ انتخاب کے لئے نفوذ کی ضرورت، یہ بحث کہ اجرت پیشہ اور صنعت پیشہ گروہ اپنے میں سے نائب شاذ و نادر کیوں منتخب کرتے ہیں، منتخب کرنے والی جماعتوں پر الفاظ اور جملوں کا کتنا اثر پڑتا ہے، منتخب کرنے والی جماعتوں کی راے کیونکر قائم ہوتی ہے، سیاسی کمیٹیوں کا اثر، سیاسی کمیٹیاں مجسمۂ استبداد ہوتی ہیں، واقعۂ انقلابِ فرانس کی کمیٹیاں، اس بات کا سبب کہ اگر حقِ انتخاب کو ایک خاص طبقہ تک محدود کردیا جائے، تب بھی وہ نتیجہ کیوں حاصل ہوگا، جو حقِ انتخاب کو عام کردینے کے وقت ہوتا ہے، مختلف اقوام میں ووٹ دینے کے حق کا کیا مطلب ہے،

وہ جماعتیں جو کسی خاص غرض کے لئے نائب منتخب کرتی ہیں، جماعاتِ مختلفۃ العناصر

کا مکمل نمونہ ہوتی ہیں، یعنی جن افراد سے ان جماعتون کی تشکیل ہوتی ہے، وہ مختلف نسل اور مختلف پیشہ کے لوگ ہوتے ہیں، ان میں تجارت پیشہ بھی ہوتے ہیں، اہلِ فضل و کمال بھی ہوتے ہیں، طبقۂ متوسط اور طبقۂ ادنیٰ کے افراد بھی شریک ہوتے ہیں، غرض یہ جماعتین مختلف النسل اور مختلف الخیال لوگوں کا معجونِ مرکب ہوتی ہیں، لیکن چونکہ ان جماعتون کا وظیفۂ عمل مخصوص دائرۂ انتخاب مین محدود ہوتا ہے، اس لئے ان جماعتون میں ان تمام اوصاف کا پایا جانا ضروری نہیں، جو دیگر جماعتوں میں پائے جاتے ہیں، بلکہ ان میں صرف حسبِ ذیل مخصوص اوصاف پائے جاتے ہیں،

۱۔ ضعفِ عقلی،

۲۔ فقدانِ ملکۂ انتقاد،

۳۔ سرعتِ غضب،

۴۔ زوداعتقادی،

۵۔ سادہ لوحی واثرپذیری،

اس کے علاوہ ان جماعتون کے تجاویز میں اُن تمام عوامل کے اثرات بھی صاف نمایاں ہوتے ہیں، جن کا ذکر اوپر گذرچکا ہے، یعنی قواد کا اثر اور ادعا، و تحکم و تکرار وغیرہ کے اثرات،

ان جماعتوں کے عمومی اوصاف کی تشریح کرنے کے بعد اب ہم اس امر سے بحث شروع کرتے ہین کہ بحث واستدلال میں ان جماعتون کا طریقِ کار کیا ہوتا ہے، اور یہ جماعتیں کس قسم کے دلائل سے اثرپذیر ہوتی ہیں،

سب سے پہلے یہ ذہن نشین رکھنا چاہیے، کہ جو شخص امیدوارِ انتخاب ہے، اس کی

ذات میں نفوس کا پایا جانا ضروری اور کامیابی کے لئے شرطِ اولیں ہے، لیکن اگر یہ شخص نفوذ وہبی سے محروم ہے تو اس کا قائم مقام وہ نفوذ ہو سکتا ہے، جو ثروت و دولت سے حاصل ہوا ہو، علمی اور دماغی قابلیتوں سے جو نفوذ پیدا ہوتا ہے وہ اکثر بیکار ہوتا ہے، نفوذ ایک قوت ہے، کہ جو شخص اس قوت سے بہرہ ور ہوتا ہے، وہ بلا پس و پیش لوگوں کو اپنے موافق ووٹ دینے پر مجبور کر ہی لیتا ہے، لیکن چونکہ تجارت پیشہ اور مزدوری پیشہ گروہ میں سے کسی شخص کو نفوذ حاصل نہیں ہوتا، اس لئے یہ گروہ اپنے میں سے قائم مقاموں کو کم منتخب کرتے ہیں، اور اگر کبھی منتخب بھی کرتے ہیں تو محض اس لئے کہ اپنے فریقِ مخالف صاحبِ رتبہ امیدوارِ انتخاب کو نقصان پہنچایا جائے،

لیکن ایک حد تک صرف نفوذ ہی کامیابی کا آلہ نہیں ہوتا، بلکہ اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ امیدوارِ انتخاب لوگوں کو اس بات کی امید دلائے کہ اگر وہ منتخب ہوگیا تو لوگوں کی خواہشیں پوری کرے گا، مگر اس میں اتنا تجاوز نہ کرے کہ اس کی امیدیں خلافِ عقل اور محال نظر آنے لگیں، اب اس کے مقابل میں فریقِ مخالف پر بھی یہ لازم ہے کہ وہ بذریعہ ادعا، و تحکم و تکرار یہ ثابت کرنے کی کوشش کرے کہ میرا مخالف اور مقابل نہایت بدنفس ہے، اس نے جتنی امیدیں دلائی ہیں، وہ کبھی پوری نہ کرے گا، پس اگر پہلا امیدوار جماعت کے نفسانی حالات سے ناواقف ہوا، تو وہ فوراً ادعا و تحکم کی بجائے دلائل و براہین سے ان الزامات کی تردید اور اپنی ذات کی بریت کرے گا، یہانتک کہ آخر آخرکار وہ ناکامیاب ہو جائے گا،

اس کے علاوہ امیدوارِ انتخاب کے لئے یہ بھی لازمی ہے کہ وہ اپنے انتخاب کے بعد جو جو اعمال انجام دینا چاہتا ہے، اپنی اسپیچ میں ایک طول طویل فہرست ان

اعمال واصلاحات کی ضرور پیش کردے، اگر اس نے اسپیچ دیتے وقت کوئی فہرست پیش کردی ہے، تو مجمع متاثر ہوجائے گا، اور اس کے بعد منتخب کرنے والے لوگ خود فراموش کرجائیں گے، کہ ان کے منتخب کردہ قائم مقام نے کن کن باتوں کا وعدہ کیا تھا، اور آیا اس نے وہ وعدے پورے بھی کئے یا نہیں،

غرض تقریر بالا سے یہ معلوم ہوگیا کہ امیدوارانِ انتخاب اپنی اپنی جماعتون کو کس طرح اثر پذیر کرتے ہیں، اور منتخب کرنے والی جماعتون پر بعض خاص الفاظ اور جملوں کا کتنا اثر پڑتا ہے، جو الفاظ جماعتوں پر اثر کرتے ہیں، ان کے نمونہ کے لئے چند الفاظ حسب ذیل ہیں، "راس المال" "یہ لوگ دغا باز ہیں" "مال تمام افراد میں تقسیم کردیا جائے" یہ اور اسی قسم کے دیگر جملے اور الفاظ مجمع پر زیادہ اثر کرتے ہیں، اور جو امیدوارِ انتخاب قلوب کو اپنے جانب جذب کرنے اور مجمع پر اثر ڈالنے کی تدبیرون سے واقف ہوتا ہے، وہ یقیناً اس قسم کے جملوں کو استعمال کرکے کامیابی حاصل کرلیتا ہے، اسپین میں ۱۸۷۳ء میں جو شورش برپا ہوئی تھی، اس کے باعث اسی قسم کے چند مبہم الفاظ تھے، ہم یہاں اس واقعہ کی پوری کیفیت اس زمانہ کے ایک مصنف کی زبانی بیان کرتے ہیں، وہ مصنف لکھتا ہے:-

"انتہا پسند جماعت کو خیال گذرا کہ جمہوریت ایک قسم کی شخصی سلطنت کا نام ہے، اور جمہوریت کی آڑ میں چند خود غرض حکومت کریں گے، اس لئے انھون نے جمہوریت کی مخالفت شروع کی، لیکن قوم پرست اعتدال پسند پارٹی نے انتہا پسندوں کو اس بات پر راضی کرلیا، کہ جمہوریت اس طرز کی قائم کی جائیگی جیسی امریکہ میں ہے، یہ خیال ذہنوں میں کچھ ایسا راسخ ہوگیا، کہ اب ہر

شخص یہی کہنے لگا، کہ بیشک اسی طرح کا طرزِ حکومت اسپین کی سرسبزی
اور ترقی کے لئے ضروری ہے، لیکن باوجود اس کے ہر شخص ان الفاظ کے
معنی جدا جدا سمجھتا تھا، بعض لوگ تو اس کا یہ مطلب سمجھتے تھے کہ اب تمام صوبے آزاد
کرکے مستقل حکومت بنا دیئے جائیں گے، بعض یہ سمجھتے تھے، کہ اسپین میں ولایات
متحدہ امریکہ کا نظامِ حکومت قائم کیا جائے گا، ادھر اشتراکیوں نے
بارسلونا اور اندلس میں ہر ہر گاؤں اور ہر ہر دیہات کی آزادی کا اعلان
کردیا، اور یہ صدا بلند کی، کہ اسپین کے ہر صوبہ سے دس ہزار کی تعداد
میں نائب اور قائم مقام منتخب کئے جائیں، جو ملک پر حکومت کریں،
نیز یہ کہ فوج اور پولیس برطرف کر دی جائے، تھوڑے عرصہ میں
اشتراکیوں کے اس فتنہ سے اسپین کے ہر ہر صوبہ میں بغاوت کی
آگ بھڑک اٹھی، اور ہر ہر شہر میں ایک مستقل حکومت قائم ہوگئی، تار
کے جال کاٹ ڈالے گئے، ریل کی پٹریاں اکھاڑ ڈالی گئیں، اور دارالحکومت
میڈرڈ سے بڑے بڑے شہروں کا سلسلۂ رسل ورسائل منقطع ہوگیا
اور ہر طرف توحش اور بربریت کے آثار نمایاں ہونے لگے"۔

منتخب کرنے والی جماعتوں پر عقلی استدلال کا اثر جو کم پڑتا ہے، اس
سے انکار کرنا گویا جماعت کے نفسانی حالات سے ناواقفیت کا اظہار کرنا ہے
ان مجامع میں بدگوئی، سبّ وشتم، طعن وتشنیع اور تحکمانہ خطابت کے علاوہ اور
کیا ہوتا ہے، تقریریں جو کی جاتی ہیں، ان میں دلائل و براہین کا نام تک نہیں ہوتا،
ہاں کبھی یہ دیکھا جاتا ہے، کہ ان مجامع میں مقرر نے دلائل و براہین پیش کئے،

اور مجمع پرسکون کی کیفیت طاری رہی، لیکن یہ بھی اس وقت ہوتا ہے، جب مجمع کے اندر سے کوئی شخص اٹھ کر مقرر سے سوال کر بیٹھتا ہے تو اس سے سامعین متلذذ ہوتے ہیں، اور تھوڑی دیر کے لئے مجمع پرسکون طاری ہو جاتا ہے، مگر یہ لذت بھی دیر پا نہیں ہوتی، بلکہ سائل کی آواز مجمع کے غیر معمولی شور وغل کے اندر بالکل گم ہو جاتی ہے، میں اپنے دعویٰ کی شہادت میں ایک اخبار سے لے کر اسی قسم کا واقعہ درج کرتا ہوں،

"ایک مرتبہ کسی قائم مقام کو منتخب کرنے کی غرض سے ایک مجمع مجتمع ہوا انارکسٹ طبقہ نے اس بات کی کوشش کی کہ وہ پہلے سے پہنچ کر مقام اجتماع کو اپنے افراد سے پُر کرلے، تاکہ اس کے مفاد کے خلاف انتخاب عمل میں نہ آئے، اور اشتراکیوں نے بھی اسی تدبیر پر عمل کرنا چاہا، یہاں تک کہ اسی مخالفت اور ردوقدح میں دونوں فریقوں میں مڈبھیڑ ہوگئی، پھر کیا تھا، سب وشتم، طعن وتشنیع کی خوب گرم بازاری ہوئی، اسی اثنا میں کمیٹی کا انعقاد ہوا، اور ایک شخص کا انتخاب بھی قرار پاگیا، اشتراکیوں نے جب دیکھا کہ ان کے مفاد کے خلاف انتخاب ہوگیا ہے تو انھوں نے اس منتخب شدہ قائم مقام کے خلاف کارروائی شروع کی، اور اس کی ذات پر حملے کرنے لگے، لیکن اشتراکیوں کے الزامات کا جواب اسپیکر نے ایک بسیط تقریر میں یہ دیا کہ اشتراکیوں کی جماعت نہایت نادان اور احمق ہے،

اسی قسم کا ایک دوسرا واقعہ مزید وضاحت کی غرض سے اور درج

کیا جاتا ہے،

"ماہ مئی کی پہلی تاریخ فرانس کی جرمن پارٹی نے ایک جلسہ کے انعقاد کا اعلان کیا، جس کے متعلق یہ پہلے ہی سے طے کر دیا گیا تھا، کہ نہایت سکون اور خاموشی کے ساتھ منعقد ہو گا، جب جلسہ منعقد ہوا تو ایک وطن پرست اسپیکر نے اپنی اسپیچ میں اشتراکیوں پر اس قسم کے سخت حملے کرنا شروع کئے، کہ "اشتراکی فرقہ کے لوگ لچے بدمعاش ہیں"۔ یہ ہونا تھا کہ اسپیکروں میں باہم خوب طعن وتشنیع ہوئی، حتی کہ سب وشتم سے جوتی پیزار تک نوبت پہنچ گئی، اور اسی سلسلہ میں کرسیاں اور میزیں بھی اچھلنے لگیں"

لیکن امثلۂ بالا سے یہ نتیجہ نہ اخذ کرنا چاہئے، کہ یہ طرزِ خطابت کسی ایک فریق کے ساتھ مخصوص ہے، اور روشنخیال لوگوں کے مجمع سے اس قسم کے غیر مہذب اور ناشایستہ حرکات صادر نہیں ہوتے، بلکہ جیسا کہ میں بیان کر چکا ہوں، جماعت میں داخل ہو کر افراد کے قواے عقلی ماند پڑ جاتے ہیں، پس اس بنا پر اگر روشنخیال اور اہلِ علم لوگوں کا مجمع ہو تو اس سے بھی اسی قسم کے افعال صادر ہوں گے، اس کی شہادت میں ہم اخبار ٹیمپس سے ایک ایسے جلسہ کا حال اقتباس کر کے درج کرتے ہیں، جس میں صرف طالبعلموں کا مجمع تھا،

"جب رات زیادہ آگئی تو لوگوں میں سخت اضطراب پیدا ہونے لگا، اور حالت یہ ہو گئی، کہ ادھر خطیب کی زبان سے الفاظ نہیں نکلے، اور اُدھر اس پہ طعن وتشنیع شروع ہو گئی، کسی طرف تالیاں پٹنے لگیں، ایک طرف سے سیٹیوں کی آوازیں نغمہ کی کیفیت پیدا کرنے لگیں، سامعین میں غل وشور

برپا ہو گیا، اور ایک طرف سے "بیٹھ جاؤ بیٹھ جاؤ" کی صدائیں بلند ہوئیں، اسی اثنا میں ایک دوسرا خطیب کھڑا ہوا، اور اس نے مجمع کو بہت ملامت کی کہ یہ بہت بیجا اور غیر مہذّب حرکات ہیں، جو اس مجمع کے شایانِ شان نہیں"

اب اس جگہ ایک یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ اس اژدہام و ہجوم اور شور و شغب کی حالت میں انسان کے حواس کس طرح برقرار رہ سکتے ہیں، اور وہ کسی مسئلہ پر رائے کس طرح قائم کر سکتا ہے؟ لیکن اگر یہ پیشِ نظر کر لیا جائے کہ اس قسم کے مجامع میں ہر شخص کو آزادی حاصل ہوتی ہے، نیز یہ کہ مجمع کی رائے جو قائم ہوتی ہے تو کسی عقلی استدلال کی بنا پر نہیں، بلکہ تسلّط اور غلبہ کی بنا پر قائم ہوتی ہے، اور یہ غلبہ مختلف قوتوں اور مختلف پارٹیوں کا ہوتا ہے، جن پر چند مخصوص ذی نفوذ اصحاب قابض ہوتے ہیں، تو اس وقت اس خیال کی کوئی اصلیت نہ رہے گی، اور صاف کھل جائے گا کہ اس مجمع میں ہر شخص کی رائے تابع ہوتی ہے اپنی پارٹی کے رئیس کی رائے کے، اور ہر شخص کو ہر مسئلہ میں رائے زنی کرنے کے لئے غور نہیں کرنا پڑتا، موسیو شیرر جو زمانۂ حال میں جمہوریت پرست گروہ کا رئیس ہے، کیا خوب کہتا ہے کہ

"تم جانتے ہو کہ انتخاب کرنے والے مجمع کی کیا حقیقت ہے؟ یہ جماعتیں ہمارے آئین و قوانین کی کنجیاں اور سیاسی ہتھیار ہیں، اس وقت اگر فرانس میں کوئی حکومت ہے تو انہی پارٹیوں اور جماعتوں کی ہے"

یہی بات ہے کہ ان پارٹیوں پر تسلط اور غلبہ حاصل کرنا سخت مشکل ہوتا ہے، خصوصاً اگر امیدوارِ انتخاب صاحبِ ثروت ہو تو اس وقت اس کا مقابلہ کرنا سخت دشوار ہو جاتا ہے، صرف تین ملین فرانک کے مالک ہونے کی بدولت جنرل بولنگر کا انتخاب

کئی مرتبہ ہوا، یہ تفصیل ہے منتخب کرنے والی کمیٹیوں کے نفسانی حالات کی، تم نے دیکھ لیا کہ اس قسم کی جماعتوں کے نفسانی کیفیات دیگر جماعتوں کے نفسانی کوائف سے جدا نہیں ہوتے

لیکن باوجود اسکے میں یہ نہیں کہتا کہ عام انتخاب کا طریقہ جو آجکل رائج ہے بالکل بیکار اور مضر ہے اگر انتخاب کے حقوق مجھو تفویض کر دیئے جائیں تو میں خود انتخاب عام کے حق کو وسعت دونگا، لیکن باوجود تمام مضرتوں کے میں انتخاب عام کے طریقہ کی تائید چند عملی وجوہ کی بنا پر کر رہا ہوں جو حسب ذیل ہیں۔

بلاشبہ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ انتخاب عام ہونے سے جو مضرتیں پیدا ہوتی ہیں وہ اظہر من الشمس ہیں، یہ کتنی بڑی مضرت ہے کہ چونکہ جماعتوں کی زمام قیادت قوم کے چند افراد کے ہاتھوں میں ہوتی ہے جو عقلی حیثیت سے برتر ہوتے ہیں اس لئے گو حق انتخاب عام کیا جائے، لیکن قومی تہذیب انہی ذی نفوذ اور صاحب اثر لوگوں کے ہاتھوں میں ایک کھلونے کی طرح رہتی ہے، یہ لوگ جب چاہیں اسے بگاڑیں اور جب چاہیں سنواریں اور قوم کے ادنیٰ طبقات کو گو حق انتخاب حاصل ہو، وہ کچھ نہیں کر سکتے، اور اپنے حق کو عملاً استعمال نہیں کر سکتے، قوم میں ان کی کوئی قدر و قیمت ہی نہیں ہوتی، بجز اس کے کہ ان کی وجہ سے مجمع زیادہ ہو جاتا ہے، پھر دوسری مضرت یہ ہے کہ جماعت جو رائے قائم کرتی ہے، وہ اکثر اوقات پُر خطر ہوتی ہے، ہمارے ملک میں وقتاً فوقتاً جتنے فتنے برپا ہوئے ہیں، ان کا باعث جماعت ہی کا اثر و غلبہ تھا،

بلاشبہ حق انتخاب کو عام کر دینے کی بنا پر یہ مضرتیں پیدا ہوتی ہیں، لیکن اگر عملی حیثیت سے اس مسئلہ پر نظر ڈالی جائے تو ان الزامات کی کوئی قدر و قیمت باقی نہیں رہتی، جب کوئی خیال دماغوں میں بس جاتا ہے، تو اس کی مخالفت و مقاومت میں سخت دشواریاں پیش آتی ہیں، دیکھو! قرون متوسطہ میں مذہبی عقائد کو کس قدر غلبہ حاصل تھا کہ کوئی ان کی مخالفت میں آواز نہیں بلند کر سکتا تھا، تسلط جماعت اور حق انتخاب

عام کا عقیدہ بھی اس قسم کا عقیدہ ہے کہ جس نے ان اگلے عقائد کی طرح اس زمانہ میں ذہنوں پر تسلط حاصل کر لیا ہے، قرونِ متوسطہ میں کسی آزاد خیال کے ذہن میں بھی کیا یہ گذر سکتا تھا کہ وہ اپنے زمانہ کے غیر معقول مگر مستحکم عقائد کی مخالفت میں آواز بلند کرے؟ کیا اس زمانہ کا کوئی شخص وجودِ شیطان اور حرمتِ یومِ سبت کے انکار کی آسانی سے جرأت کر سکتا تھا؟ اگر کوئی شخص ایسا ہوتا تو یقیناً وہ مذہبی عدالت کے سامنے پیش کیا جاتا، جہاں الحاد و کفر کے الزام میں ماخوذ کر کے وہ زندہ جلا دیا جاتا، بعینہٖ اسی طرح کا غلبہ ہمارے زمانہ میں حقِ انتخابِ عام اور تسلطِ جماعت کے عقیدہ کو بھی حاصل ہو گیا ہے، اسپیکر اپنے خطبوں میں، اہلِ صحافت اخبارات کے کالموں میں اس عقیدہ کا تذکرہ اس جلالت و احترام کے ساتھ کر سکتے ہیں، جو کسی بادشاہ کو بھی کسی وقت نصیب نہ ہوا ہوگا، پس اس عقیدہ کو اپنے حال پر چھوڑ دو، زمانہ خود دیکھ لیگا کہ اس عقیدہ کی مخالفت میں کارروائی کرنا گویا اپنی ہلاکت کا موجب ہونا ہے،

موسیو ٹاکویل نے کیا خوب لکھا ہے:-

"عہدِ مساوات میں کسی شخص کو کسی کے ساتھ اعتقاد باقی نہیں رہتا، کیونکہ سب کی حالت یکساں ہو جاتی ہے، لیکن اس مساوات کی بنا پر یہ عام اعتقاد پیدا ہو جاتا ہے کہ جمہور کی رائے کے آگے سرِ تسلیم خم کر دینا چاہئے، اور لوگوں کے ذہنوں میں یہ بات راسخ ہو جاتی ہے، کہ ایک جمِ غفیر کی رائے کسی طرح غلط نہیں ہو سکتی"

بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ اگر حقِ انتخاب کے دائرہ کو صرف اہل الرائے لوگوں تک محدود کر دیا جائے تو اس وقت وہ مضرتیں نہ پیدا ہوں گی، جو اس حق کو عام

کر دینے سے پیدا ہوتی ہیں، لیکن میں اس خیال کو ایک لمحہ کے لئے بھی تسلیم نہیں کر سکتا، میں اس کتاب میں متعدد مقامات پر بیان کر چکا ہوں کہ جماعت کی تشکیل خواہ کسی قسم کے افراد سے ہوئی ہو، اس کی عقلی اور دماغی حالت حد درجہ انحطاط پذیر ہوتی ہے، پس اس کلیہ کے مطابق اگر فرض کیا جائے کہ ایک کمیٹی میں چالیس ممبر شریک ہیں جن میں سے کوئی بیرسٹر ہے، کوئی پروفیسر ہے" تو میرے خیال میں اس کمیٹی کی تجاویز اور فیصلے کسی طرح اس دوسری مجلس کے فیصلوں سے بہتر نہ ہوں گے، جس کے ممبر معمولی درجہ کے لوگ ہیں، میرے ذہن میں یہ بات کسی طرح نہیں آتی کہ مثلاً جمہوریت کے فوائد کے متعلق اس زمانہ میں جو اجماعِ عام ہو گیا ہے اس میں تغیر ہو جائے گا، اگر رائے دینے والے لوگ اہلِ علم طبقہ سے ہوں گے، کیونکہ اجتماعی احوال و کیفیات کے متعلق لوگ جو رائے قائم کرتے ہیں تو اس وجہ سے نہیں کہ ان رائے دینے والے لوگوں میں فلاں شخص یونانی زبان سے واقف ہے، اور فلان پروفیسر ہے، یا فلاں ڈاکٹر ہے۔ ان پیشوں اور ذاتی حالات کو ظاہر ہے کہ رائے دینے میں کوئی دخل نہیں ہوتا، یہی دیکھو کہ ہمارے ملک کے علمائے اقتصادیں کتنے مدرس اور کتنے علمی سوسائیٹیوں کے ممبر ہیں، لیکن باوجود اس کے کبھی تم نے یہ بھی دیکھا کہ ان سب کا اتفاق کبھی کسی ایک مسئلہ پر بھی ہوا،

اس وجہ سے میرا خیال تو یہ ہے کہ اگر حقِ انتخاب کو اہلِ علم اور تعلیم یافتہ طبقہ تک محدود کر دیا جائے تب بھی نتیجہ وہی ہو گا جو حقِ انتخاب کو عام کرنے کی حالت میں ہوتا ہے، کیونکہ ان اہلِ علم حضرات کو بھی اپنے مخصوص جذبات و منافع کی بنا پر رائے قائم کرنا پڑتی ہے، یا اس وقت بھی خطرہ مٹا نہیں، بلکہ خطرہ کا اور اضافہ ہو گیا، یعنی اب گویا زمامِ قیادت جماعت کے بجائے اہلِ علم لوگوں کے ہاتھ میں دیدی گئی

پس حقِ انتخابِ جماعت کا نتیجہ ہر صورت میں یکساں ہے، اور وہ یہ ہے کہ جماعت ہمیشہ اپنے مخصوص فرقوں کے منافع ملحوظ رکھتی ہے، خواہ حقِ انتخاب کو عام کر دیا جائے یا کسی خاص طبقہ تک اس کو محدود کر دیا جائے، اس بارے میں جمہوری ممالک فرانس، بلجیم، یونان، پرتگال، اسپین، سب کی حالت یکساں ہے، وہ بھی جہان جمہوری حکومتین قائم ہیں اور ان کی بھی جہان شخصی حکومتوں کا دور ہے اسی مقام سے اس نظریہ کی اہمیت بھی جس کو میں اس کتاب میں بار بار دہرا چکا ہوں معلوم ہو جاتی ہے، وہ یہ کہ آئین و اصول اور قومی نظامِ حکومت اور نظامِ تعلیم و تربیت کو قوموں کی حیات و ممات میں کوئی مداخلت نہیں ہوتی، بلکہ قوموں کے افعال و حرکات و سکنات اپنی اپنی قومی ضرورتوں اور نسلی مقتضیات یا بالفاظِ دیگر قومی روایات ہی کے تابع ہوتے ہیں، پس قوموں کی نسلی حالت یا موروثی روایات پر ان کی روزانہ ضرورتوں کا مدار ہوتا ہے، اور یہی ضرورتین اور قومی روایات وہ مخفی طاقتیں ہیں، جو ہمارے انجام اور عاقبت کی مالک ہوتی ہیں۔

فصل پنجم

نیابی مجالس (یعنی پارلیمنٹیں)

نیابی مجالس کے بہت سے خصائص وہ ہیں جو دیگر مختلف العناصر جماعتوں میں بھی پائے جاتے ہیں، نیابی مجالس کی سادہ لوحی، اثر پذیری، اور اُس کے حدود، مجالسِ نیابی کی وہ کونسی رائیں ہوتی ہیں، جن میں تغیر نہیں ہوتا، اور وہ کونسی رائیں ہیں، جن میں تغیر ہوتا ہے، نیابی مجالس کی رایوں میں اضطراب کیوں پایا جاتا ہے، نیابی مجالس میں مختلف پارٹیوں کے لیڈروں کی حالت، ان کے نفوذ کے اسباب، ان مجالس میں تمام ممبر اپنے اپنے لیڈروں کی رائے کی پیروی کرتے ہیں، لیڈروں کے عناصر خطابت، الفاظ اور جملوں کا اثر، یہ لازمی ہے کہ لیڈر تنگ نظر ہوں، اور اپنی رائے کو استدلال کے ساتھ پیش کریں، جس خطیب کا نفوذ نہیں ہوتا، اس کی رائیں نیابی مجالس میں مشکل سے قبول کیجاتی ہیں، نیابی جماعتیں اپنے جذبات ومشاعر میں مبالغہ پسند ہوتی ہیں، کن اوقات

یں نیابی مجالس یں مذکورۂ بالا اوصاف نہیں پائے جاتے، فنی مسائل میں ماہرین فن کی رائے کا اثر، نظامِ نیابی کے منافع و مضرات، گو یہ نظام موجودہ ضروریات کا متکفل ہی، لیکن اس نظام سے دو مضرتیں پیدا ہوتی ہیں، اسرافِ مال، تحدیدِ حریت، کتاب کا خلاصہ۔"

مجلسِ نیابی اُس جماعت سے عبارت ہے، جو مختلف الجنس، مختلف الخیال اور مختلف العقیدہ افراد پر مشتمل ہو، گو مختلف ممالک یں ان مجلسوں کی تشکیل کے طریقے جدا جدا ہیں، تاہم تمام ممالک یں ان مجالس کے نفسانی خصائص یکساں ہوتے ہیں، اور ان یں قومی خصائص کا اثر نمایاں رہتا ہے، لیکن چونکہ ان مختلف ممالک کی نیابی جماعتوں کے فیصلے اور تجاویز بھی قریب قریب یکساں ہوتی ہیں، اس لئے ان حکومتوں کو ایک ہی قسم اور ایک ہی طرح کی صعوبات اور مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے،

موجودہ زمانہ یں تمام قوموں کا آخری مطمحِ نظر جس کے حاصل کرنے کا تمام قوموں کو اشتیاق ہے نظامِ نیابی ہے، لوگوں کے ذہنوں یں یہ بات خوب راسخ ہوگئی ہو کہ جب کام کو چند لوگ مل کر انجام دیتے ہیں، وہ نہایت استقلال اور عمدگی کے ساتھ انجام پاتا ہو،

نیابی مجالس یں بھی گو وہ تمام اوصاف پائے جاتے ہیں، جو معمولی جماعت کے خصائص یں سے ہیں، مثلاً سادہ لوحی، اثر پذیری، مبالغہ پسندی، قواد کا نفوذ وغیرہ، مگر اتنا فرق ہے کہ نیابی مجالس یں بعض اوصاف ایسے بھی پائے جاتے ہیں، جو دیگر جماعتوں یں نہیں ہوتے،

مجالسِ نیابی کے اہم اوصاف یں سب سے پہلا وصف سادہ لوحی اور ضعفِ عقلی ہے، جو ان مجالس کی تمام پارٹیوں یں یکساں پایا جاتا ہے، اور خصوصاً لاطینی قوموں میں

تو یہ وصف اتنا ترقی پذیر ہے کہ یہ تو ہیں تمام پیچیدہ اجتماعی مسائل کو چند سادہ اصولوں سے حل کرتی ہیں، یہ ظاہر ہے کہ یہ سادہ اصول مختلف پارٹیوں کے اختلاف رائے کی بنا پر مختلف ہوتے ہیں، لیکن انسان جماعت میں شامل ہو کر ان اصول کا اندازہ ان کی اصلی قدر و قیمت سے زیادہ کرتا ہے اور اپنی خیالی دنیا میں وہ نتائج کی آخری حد تک پہنچ جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ نیابی مجالس کی تجویزیں اور رائیں اکثر یک طرفہ ہوا کرتی ہیں،

ہم نیابی مجلس کے وصفِ سادہ لوحی اور ضعفِ عقلی کی مثال میں واقعۂ انقلابِ فرانس کی اس مذہبی جماعت کو پیش کر سکتے ہیں جو محض اس وجہ سے کہ اس کا دماغ عقلی دلائل و براہین سے پُر تھا اپنے چند خیالی اصول کو خارجی معاملات اور حالات پر منطبق کیا کرتی تھی، ان لوگوں کی حالت یہ تھی کہ ان کے خیالی اصول ان کے رہبر تھے، اور وہ یہ سمجھتے تھے کہ ان خیالی اصول کی بنا پر ہم ایک جدید اجتماعی حالت پیدا کر سکے قوم کو معراجِ ترقی پر پہنچا دیں گے، وہ اپنے ان خوابوں کو پورا کرنے کے لئے چند معمولی وسائل اختیار کرتے تھے اور جب ان کو کوئی مصیبت درپیش ہوتی تو وہ اس مصیبت کو دفع کرنے کی کوشش کرتے تھے،

نیابی مجالس کا دوسرا اہم وصف یہ ہے کہ وہ بہت جلد دوسروں کی رائے سے اثر پذیر ہوتی ہیں، اور گو نیابی مجالس اس وصف میں دیگر جماعتوں کے مشابہ ہوتی ہیں یعنی یہ کہ جس طرح دیگر جماعتیں اپنے لیڈروں کے زیر فرمان ہوتی ہیں اسی طرح نیابی مجالس کی بھی ہر پارٹی اپنے اپنے لیڈروں کے زیر اثر ہوتی ہے لیکن اس باب میں نیابی مجالس کی قابلیت ایک خاص حد تک محدود ہے جسے ذیل میں بیان کرتا ہوں،

مجالسِ نیابی کے ہر ہر ممبر کی رائے اپنے مسائلِ متعلقہ میں اس قدر مستحکم ہوتی ہے کہ

اس کا اپنی جگہ سے ہلانا دشوار ہوتا ہے، اور کوئی دلیل و حجت اس کو نہیں توڑ سکتی، اگر ڈیماستھنیز بھی اپنی قبر سے اٹھکر چلا آئے تو وہ بھی اپنے زور خطابت پر کسی ممبر کی رائے کو نہیں بدل سکتا، بات یہ ہوتی ہی کہ جن لوگوں نے اس ممبر کو منتخب کر کے پارلیمنٹ میں بھیجا ہے ان کا اثر اس پر اس قدر قوی ہوتا ہے کہ یہ ممبر دوسروں کی رائے سے متاثر ہونے کی قوت کھو بیٹھتا ہے، یہی اثر ہے جس سے متاثر ہوکر انگریزی پارلیمنٹ کے ایک ممبر نے ایک بار کہا تھا کہ گو میں پچاس سال تک ویسٹ منسٹر میں بحیثیت ممبر پارلیمنٹ بیٹھا ہوں اور اس عرصہ میں ہزاروں خطبے سنے ہیں جنمیں سے بعض خطبوں کو سن کر میرے بعض خیالات میں تغیر بھی ہوا، لیکن کوئی خطبہ ایسا نہ تھا جو ووٹ دیتے وقت میرے قرارداد و ووٹ میں تغیر کر سکا ہو"

البتہ جب کسی عام مسئلہ پر بحث شروع ہوتی ہے مثلاً انقلابِ وزارت یا کسی جدید ٹیکس کا اضافہ وغیرہ تو اس وقت لوگوں کے خیالات میں بیشک اضطراب پیدا ہو جاتا ہے، اور مختلف پارٹیوں کے لیڈروں کا نفوذ کام کرنے لگتا ہے، لیکن باوجود اس کے اس نفوذ کا اثر اتنا قوی نہیں ہوتا جتنا عادۃً دیگر جماعتوں میں ہوتا ہی اور اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ نیابی مجالس میں مختلف پارٹیاں ہوتی ہیں اور ہر پارٹی کے قائد کا اثر دوسری پارٹی کے قائد کے اثر کے مساوی ہوتا ہی، اس لئے دو برابر کی قوتیں اپنے اپنے جانب ممبروں کی توجہ کو جذب کرنا چاہتی ہیں اور ممبروں کی رایوں میں اضطراب پیدا ہو جاتا ہے، اسی بنا پر یہ دیکھا گیا ہے کہ ایک ممبر نے نصف گھنٹہ پیشتر جو رائے دی تھی اب اس کے خلاف میں وہ رائے دے رہا ہی، گویا جس اصول کی بنار پر اس نے پہلے رائے قائم کی تھی اس کو اب اُس نے منسوخ کر دیا،

پس بیاناتِ ماسبق سے معلوم ہوا کہ نیابی مجالس میں ممبروں کی دو قسم کی رائیں ہوتی ہیں، ایک وہ جن میں تغیر نہیں ہوتا، دوسری وہ جن میں تغیر ہوتا رہتا ہے اور چونکہ اکثر ان مجالس کے روبرو مسائلِ عامہ پیش کئے جاتے ہیں اس لئے ممبرانِ مجلس کی رایوں میں اضطراب بھی پایا جاتا ہے، کیونکہ ہر ممبر دو قسم کے اثرات سے اثر پذیر ہوتا ہے، ایک اثر تو اس پر ان لوگوں کا ہوتا ہے جنھوں نے اس کو منتخب کیا ہے اور دوسرا اثر اس کے اپنے فریق کے رئیس و قائد کا،

لیکن اکثر مسائل میں جن کے متعلق ممبروں کی پہلے سے کوئی رائے قائم نہیں ہوتی غلبہ لیڈروں ہی کو حاصل ہوتا ہے اور ان لیڈروں کی موجودگی ایسے نازک اوقات میں بیحد ضروری ہوتی ہے، کیونکہ ان کی حالت افسرانِ فوج کی سی ہے کہ اگر یہ نہوں تو جماعت کی تشکیل ہی نہیں ہوسکتی، یہی وجہ ہے کہ نیابی مجالس کے فیصلے اور تجاویز صرف معدودے چند اشخاص کی رایوں اور ووٹوں پر مبنی ہوتے ہیں،

لیکن ان مجلسوں میں مختلف پارٹیوں کے لیڈروں کا جو اثر ہوتا ہے وہ ان کی فصاحت و بلاغت کی بنا پر نہیں ہوتا، بلکہ زیادہ تر حصہ اس اثر کا مبنی ہوتا ہے نفوذ پر، یہاں تک کہ جب ان کا نفوذ زائل ہوجاتا ہے تو ان کا اثر بھی مٹ جاتا ہے، اور یہ نفوذ بھی محض شخصی نفوذ ہوتا ہے جس میں شہرت یا ثروت کو کوئی دخل نہیں ہوتا، ہو سیو جولیس سیمان ۱۸۴۸ء کی پارلیمنٹ کی حالت جس کے وہ ممبر تھے حسبِ ذیل بیان کرتے ہیں؛

" لوئس نپولین کا اثر اس کی حکومت کے دو ماہ پیشتر کچھ نہ تھا وکٹر ہیوگو جو نہایت مشہور خطیب تھا خطبہ دینے کے لئے اسٹیج (منصہ) پر آیا، لیکن اس کو کامیابی

بالکل نہیں ہوئی، بلکہ اس کا لکچر لوگوں نے اسی طرح سنا جس طرح وہ فیلکس پایاٹ کا لکچر سنا کرتے تھے، البتہ وکٹر ہیوگو کے خطبہ پر اتنے چیرز نہیں دیے گئے جتنے فیلکس پایاٹ کے لکچر پر دیئے جاتے تھے، فولائل مجھ سے فیلکس پایاٹ کے متعلق کہتا تھا کہ مجھے اس کے خیالات پسند نہیں، لیکن وہ بہترین انشا پرداز اور فرانس کا بہترین خطیب ہے، اسی طرح ایڈگر کوئینٹ باوجودیکہ بہت بڑا مفکر تھا لیکن پارلیمنٹ کے اندر اس کی کچھ وقعت نہ تھی، وجہ یہ تھی کہ اس کا نفوذ زائل ہوچکا تھا، نیابی مجالس کی حالت یہ ہوتی ہے کہ وہاں فصاحت و بلاغت کی کوئی قدر نہیں ہوتی اور نہ وطنی خدمات کا اعتراف کیا جاتا ہے، البتہ صرف اُن خدمات کا اعتراف کیا جاتا ہے جو احزاب سیاسیہ کے خاطر انجام دی جاتی ہیں، اور پارلیمنٹ میں جو قدر لامارٹین کی ۱۸۴۸ء میں اور موسیو ٹیرس کی ۱۸۷۱ء میں ہوئی بھی تو محض چند مخصوص حالات و وجوہ کی بنا پر ہوئی، اسی لئے ان حالات کے بدلتے ہی اس تمام قدر و عظمت کا پتہ بھی نہ لگا۔"

میں نے مندرجۂ بالا اقتباس اس غرض سے نہیں پیش کیا ہے کہ جو کچھ اس میں مذکور ہے اس کا مؤید ہوں، کیونکہ اس میں بہت سی باتیں ایسی مذکور ہیں جو علم النفس کے نقطۂ نظر سے بالکل غلط ہیں، بلکہ میں نے یہ اقتباس اس لئے درج کیا ہے کہ ناظرین کو اس سے اس بات کا اندازہ ہوجائیگا کہ پارلیمنٹ میں لیڈروں کی کامیابی کے لئے نفوذ کی کس قدر حاجت ہوتی ہے، سب سے بڑی غلطی اس بیان میں وہاں پر ہے جہاں یہ مذکور ہے کہ مجالسِ نیابی وطنی خدمات کا اعتراف نہیں کرتیں، بلکہ فرقہ وارانہ خدمتوں کا اعتراف کرتی ہیں، حقیقت یہ ہے کہ جماعت کی حالت یہ ہوتی ہے کہ باوجودیکہ

اس کو ان خدمات کا علم ہوتا ہے جو اس کے قائد نے انجام دی ہیں، لیکن اسے ان فوائد اور خدمات سے کچھ غرض نہیں ہوتی بلکہ محض اپنے قائد کے اثر و نفوذ کی بنا پر وہ اس کی فرمانبرداری کرتی ہے،

یہی وجہ ہے کہ جب قائد کا نفوذ قوم میں بڑھ جاتا ہے تو قوم بالکل اسی کے زیرِ اثر اور تابعِ فرمان ہو جاتی ہے۔ ہم میں سے ہر شخص کو اس وزیر کے حالات کا علم ہوگا جس کا نفوذ کچھ سال پیشتر اس قدر بڑھ گیا تھا کہ اس کا ایک اشارہ انقلابِ وزارت کے لئے کافی ہوتا تھا، لیکن محض اتفاقات کی بنا پر اس کا اثر بعد کو زائل ہو گیا،

ایک مشہور انشاپرداز نے اس کے اعمال پر سختی سے نکتہ چینی کی ہے جو حسب ذیل ہے:-

فلاں وزیر اعظم پر ہمارے قرضہ کا بہت بار ہے، اسی کی بدولت ہم نے تین گنے زیادہ داموں پر ٹانکن کو خریدا، مڈیگاسکر میں اسی کی بدولت ہمارا اثر زائل ہوا، اور نہر نائگر کے جنوب میں ایک پورا ملک قبضہ سے نکل گیا، اور آخر کار اسی کی بدولت مصر میں ہمارے حقوق پامال کئے گئے۔ غرض فلاں وزیر موسیو فلاں نے ہم کو جتنے نقصانات پہنچائے ہیں وہ ان نقصانات سے زیادہ ہیں جو نپولین کی بدولت ہمیں اٹھانا پڑے[1]"

مگر حقیقتِ حال یہ ہے کہ ہم کو اس فرانسیسی وزیر اعظم کے طرزِ عمل پر نکتہ چینی نہیں کرنا چاہیئے اس لئے کہ اس وقت جو نفوذ اس کو حاصل تھا وہ رائے عام کی تقلید کرنے کی بدولت حاصل ہوا تھا اور اس زمانہ میں فرانسیسی رائے کا عام میلان

---

[1] غالباً مصنف کا اشارہ موسیو کلیمانسو کے جانب ہے جو وزیر گر مشہور تھا،

استعماری مسائل کے جانب اتنا نہ تھا جتنا اب ہے، اس لئے خواہ مخواہ اس کو بھی رائے
عام ہی کی پیروی کرنا پڑتی تھی، اس بنا پر یہ جو کچھ نقصانات فرانسیسی قوم کو برداشت
کرنا پڑے ان کا باعث خود رائے عام تھی،

نفوسِ جماعت پر تسلط اور غلبہ حاصل کرنے کے ذرائع نفوذ کے علاوہ اور بھی
ہیں، جن کا تذکرہ ہم متعدد مقامات پر کر چکے ہیں، نفوس پر غلبہ حاصل کرنے کے لئے سب سے
زیادہ لازمی شرط یہ ہے کہ قائد کو اس جماعت کے نفسانی حالات سے بخوبی واقف
ہونا چاہئے جس پر وہ غلبہ حاصل کرنا چاہتا ہے نیز اس بات سے بھی واقف ہونا چاہئے کہ
الفاظ کا اثر سامعین پر کیا پڑے گا، پھر ان تمام باتوں کے ساتھ قائد قادر اللسان اور
فصیح و بلیغ بھی ہونا چاہئے، تحکمانہ طرز خطابت سے جماعت کو مسحور کرنا لازمی ہے مگر اس
شرط سے کہ ادعا و تحکم میں دلیل و حجت کا میل تک نہ ہو، اسی قسم کی فصیح و بلیغ خطابت
ہے جس کے نمونے ہم کو نیابی مجالس کے خطبوں میں نظر آتے ہیں، حتیٰ کہ انگریزی پارلیمنٹ
جس کا نظام دیگر نیابی مجالس سے زیادہ معتدل ہے اس میں تک بھی ہم کو اس قسم کی
مثالیں ملتی ہیں،

ایک انگریز فلاسفر **مائن** کہتا ہے:

"بہت آسانی کے ساتھ ہم کو نیابی مجالس کی تجویزوں میں ایسی مثالیں مل سکتی
ہیں جو محض خیالی کلیات و اصول پر مبنی ہوتی ہیں لیکن جن کا اثر لوگوں پر زیادہ
ہوتا ہے، نیز ہم نہایت آسانی کے ساتھ جماعت کو چند خیالی باتوں کا یقین دلا سکتے
ہیں جن کا حصول قریب قریب ناممکن ہے بشرطیکہ ہم ان کو تحکمانہ انداز سے ظاہر کریں"

اقتباسِ بالا سے اس بات کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ مؤثرانہ طرز ادا اور کلمات جا...

نفوسِ جماعت پر کتنا قوی اثر کرتے ہیں، ہم یہاں ایک خطبہ کا ایک جملہ نقل کرتے ہیں جس سے ہمارے بیان کی تائید ہوگی،

ایک خطیب کہتا ہے :-

"جس دن ایک زبردست سیاسی اور ایک سفاک انقلاب پرست دونوں کسی گرم ملک میں جلاوطن کئے جانے کی غرض سے جہاز پر بٹھلائے گئے، اس دن ان دونوں کی باہمی گفتگو سے پتہ چلا کہ ان دونوں کے اصول درحقیقت ایک ہی ہیں اور یہ دونوں ایک ہی قسم کے نظامِ اجتماعی کے گویا دو رُخ اور دو نمونے ہیں"

اس جملہ میں سیاسی مجرموں کی سزا کی جو تصویر کھینچی گئی ہے اس کا مدعا یہ ہے کہ سامعین پر جو ان سیاسی مجرموں کے گروہ سے ہیں اس کا اثر پڑے اور وہ سزا کے خوف سے اپنے خیالات سے باز آئیں، روبسپیر جب اپنے سامعین کو خوف زدہ اور مرعوب کرنا چاہتا تو اپنے پھانسی دینے کے آلہ سے لوگوں کو دھمکایا کرتا،

قائدین کے لئے یہ بھی لازمی ہے کہ وہ اپنے خطبوں میں ایسے مبالغہ کا استعمال کریں جو عقل میں نہ آسکتا ہو، اوپر ایک خطبہ کا ایک جملہ جو میں نے نقل کیا ہے اس میں اس حد تک مبالغہ کیا گیا ہے کہ حاضرین میں سے کوئی بھی اس کی مخالفت کی جرأت نہ کر سکا اور کسی کو یہ کہنے کی ہمت نہ ہوئی کہ جن جرائم کا ارتکاب انقلاب پرست لوگ کرتے ہیں، ان کی جانب متمول لوگ ان کو ترغیب دیتے ہیں، پس جس سزا کے مستحق انقلاب پرست لوگ ہیں اسی سزا کے مستحق یہ لوگ بھی ہیں جو ان کو ترغیب دیتے ہیں،

اسی طرح خطیب کے لئے یہ بھی جائز ہے کہ وہ یک طرفہ رائے قائم کر کے مخالف رائے پر سختی

سے نکتہ چینی کرے، بلکہ اگر وہ اس ضمن میں اپنی مخالف رائے کی ہجو کرے تب بھی سامعین متأثر ہو جائیں گے، اور بحث و مناظرہ کی اُن کو جرأت نہ ہو گی،

گو اس قسم کی فصاحت و بلاغت کے نمونے نیابی مجالس میں ہم کو ہر زمانہ میں نظر آتے ہیں، لیکن خصوصیت کے ساتھ ان مجالس میں فصاحت و بلاغت کا استعمال مصیبت یا انقلاب کے زمانہ میں زیادہ کیا جاتا ہے، اگر خطیبانہ فصاحت و بلاغت کے نمونے دیکھنا ہوں تو خصوصیت سے ان خطبوں کا مطالعہ کرنا چاہیئے جو انقلاب انگیز مجبوعوں کو مخاطب کرکے دیئے گئے ہیں، اُن کے دیکھنے سے معلوم ہو گا کہ کس طرح خطیب ظالموں کو گالیاں دیتا ہے، کس طرح وہ لوگوں سے قسمیں دے دیکر کہتا ہے کہ "زندہ رہو آزاد رہ کر ورنہ عزت کی موت مرجاؤ" اور حاضرین ہیں کہ دم بخود کھڑے ہوے مجنونوں کی طرح تالیاں پیٹ رہے ہیں،

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ قائد نہایت ذہین اور ذکی اور عقلمند ہوتا ہے لیکن ذہانت و ذکاوت قائد کے لئے سمِ قاتل ہوتی ہے اس لئے کہ ذہین شخص مناظرہ اور مباحثہ کا عادی ہوتا ہے، وہ خطبہ دیتے وقت عقلی دلائل پیش کرنے لگتا ہے، حالانکہ اس سے لوگوں کے عقیدہ میں فرق آجانے کا اندیشہ ہوتا ہے، یہی وجہ ہے کہ عموماً تمام قوموں کے قائدین خصوصاً واقعۂ انقلابِ فرانس کے قائدین کم فہم ہوئے ہیں، ان لوگوں کے خطبوں خصوصاً روبسپیر کے خطبوں کے مطالعہ سے قلب پر ایک دہشت سی طاری ہو جاتی ہے اور اسکی انشاپردازی سے انسان مسحور ہو جاتا ہے، ایک شخص نے روبسپیر کے خطبوں کی تعریف حسب ذیل الفاظ میں کی ہے:

"الفاظ ہیں کہ زبان سے نکلتے جا رہے ہیں اور فصاحت کا ایک دریا ہے جو روانی کے ساتھ بہ رہا ہے لیکن الفاظ میں طفلانہ دھمکیوں اور تحکمانہ طرز ادا کے سوا کچھ نہیں ہے اسکے

خطبہ میں نہ کہیں کسی راستے کا پتہ ہے، اور نہ کسی معقول تجویز کا، لیکن باوجود اس کے خطبہ کے مطالعہ کے بعد بے اختیار اسی طرح زبان سے اُف نکل جاتا ہے جب طرح ایک ظریف الطبع شخص کامیل ڈی مولنس کی زبان سے نکلتا تھا۔"

حاصل یہ کہ گو یہ ایک الم ناک بات ہے کہ ایک شخص جو نہایت کم فہم مگر صادق العقیدہ ہے اس کو لوگوں پر نفوذ حاصل ہو جائے، لیکن ہمیشہ ہوتا یہی رہا ہے کہ جماعتیں اسی طرح کے کم فہم لوگوں کے زیر فرمان رہی ہیں، جماعت کو اپنے لیڈروں کی کچھ ایسی شناخت ہوتی ہے کہ وہ صاحب نفوذ شخص کو خود بخود تلاش کر لیتی ہے،

یہ جو مجالس میں خطیب اپنا اثر جو قائم کر لیتے ہیں تو براہین و دلائل کے بل پر نہیں بلکہ صرف نفوذ کی قوت پر، اور جب ان کا نفوذ زائل ہو جاتا ہے، تو پھر ان کو کوئی نہیں پوچھتا، اور نہ ان میں یہ قدرت باقی رہتی ہے، کہ لوگوں کی رائے پلٹ دیں،

یہی وجہ ہے کہ اگر کوئی مجہول الحال خطیب گھر سے خطبہ تیار کر کے ادلہ و براہین کے اسلحہ سے مسلح ہو کر پارلیمنٹ کے جلسہ میں شرکت کی غرض سے جاتا ہے، تو اس کے خطبہ کو کوئی کان دھر کر نہیں سنتا، موسیو ڈیکوب جو پارلیمنٹ کا ممبر اور علم النفس کا ایک بہترین ماہر ہے ایک مجہول الحال خطیب کے لکچر دینے کا واقعہ حسب ذیل بیان کرتا ہے:-

"جب فلاں غیر معروف خطیب لکچر دینے کے لئے کھڑا ہوا، تو وہ اثنائے خطبہ میں برابر یاد کر کے دلائل و براہین پیش کرتا جاتا تھا، اور اپنے دل میں سمجھ رہا تھا کہ وہ یقیناً دلائل و براہین سے اپنے دعوے کو مدلل کر کے لوگوں کے ذہن نشین کر دے گا، کیونکہ اس نے بڑی محنت سے وہ خطبہ تیار کیا تھا، اور اپنے دعوے کے ثبوت میں ایسے ایسے دلائل تحریر کئے تھے، جو اس کے

خیال میں لاجواب تھے، لیکن اس کو سخت حیرت ہوئی، جب اس نے دیکھا کہ لوگ اس کے خطبہ سے پریشان ہوکر شور مچانے لگے ہیں، وہ بیچارہ سخت حیران تھا کہ یہ کیا ماجرا ہے؟ ایک بارگی لوگوں کو یہ تشویش کیوں پیدا ہوگئی؟ اور لوگ کیوں اس کا خطبہ نہیں سنتے، یہ خیالات بار بار اس کے ذہن میں آتے، اور وہ پیشانی پر سے گھڑی گھڑی پسینہ خشک کرتا، یہاں تک کہ مجبور ہوکر بیچارہ خاموش ہوگیا، لیکن صدر جلسہ کے حکم پر دوبارہ اس کو اپنے خطبہ کا سلسلہ پھر جاری کرنا پڑا، اب دوبارہ اس نے بلند آواز سے خطبہ شروع کیا، لیکن اس مرتبہ پہلے سے زیادہ لوگوں میں اضطراب پیدا ہوا، یہ دیکھ کر اس نے مجبوراً اپنے خطبہ کو ادھورا چھوڑ دیا، اور بیٹھ گیا،

نیابی مجالس کی یہ بھی ایک خصوصیت ہے کہ جب کوئی تحریک پیدا ہوتی ہے یا جب کوئی عامل اپنا اثر ڈالتا ہے تو دیگر جماعتوں کی طرح ان مجالس کے اندر بھی سخت اضطراب اور ہیجان پیدا ہوجاتا ہے، اور دیگر جماعتوں کی طرح اس مجمع سے بھی تعصب اور اثر پذیری کے جذبات ظاہر ہونے لگتے ہیں، اس وقت مجلس کے ہر ممبر کی شخصیت میں تغیر عظیم ہوجاتا ہے، یہانتک کہ بعض اوقات ممبر ایک نیم شعوری کی کیفیت سے متاثر ہوکر اپنے ذاتی مصالح و منافع کے خلاف بھی اظہار رائے کردیتے ہیں،

واقعۂ انقلاب فرانس کے زمانہ میں جو کمیٹیاں منعقد ہوتی تھیں، ان کی رودادیں اور حالات پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مجالسِ نیابی میں جب کسی قسم کی تحریک پیدا ہوتی ہے، تو ان مجالس اور کمیٹیوں کے ممبر ایک نیم شعوری کیفیت سے متاثر ہوکر اپنے حصولِ مقاصد کے پیچھے کس طرح سرگرداں ہوجاتے ہیں، دیکھو اپنے شخصی اغراض [illegible]

مصالح کی قربانی کس قدر مشکل کام ہے، لیکن اس واقعہ میں امرانے ایک موقع پر جس طرح اپنے مصالح کی قربانی کی ہے، اس کی نظیر کسی دوسری تاریخ میں نہیں ملتی، باوجودیکہ وہ یہ جانتے تھے کہ جس طرح آج دوسروں کو پھانسی دی جارہی ہے، اپنے اپنے حقوق و مصالح کی قربانی کرنے کے بعد ہم بھی اسی طرح کل دار پر نظر آئیں گے، لیکن وہ ایک عامل قوی سے اثر پذیر ہو کر اس طرح بے خود ہو گئے تھے کہ اپنے مقاصد کے مقابلہ میں ان کو اپنی جان و مال تک کی پروا باقی نہ رہی تھی، اور جو خیال ان کے ذہنوں میں پختہ ہو چکا تھا اس کے خاطر وہ تن من دھن قربان کرنے پر تیار تھے، اس گروہ کا ایک شخص بلاڈوبرنیں کہتا ہے کہ ہم کو اپنی تجاویز پر عمل کرنے کا خیال گو صرف دو دن پیشتر پیدا ہوا تھا، لیکن کوشش و جانفشانی نے ہم سے سب کچھ کرادیا،

ان تجاویز اور قراردادوں کو پاس کرنے کے لئے اس زمانہ میں جو جلسے منعقد ہوئے اور ان میں جس قدر جوش و خروش کا اظہار کیا گیا، اس کی تفصیل انقلاب فرانس کے فلسفی مورخ موسیو ٹائن کی زبان سے سنو، موسیو ٹائن لکھتے ہیں:-

"ان لوگوں نے تمام تجاویز مکمل کر کے ان پر عمل شروع کر دیا، اور حماقت بلکہ جنون کی حد سے بھی گذر گئے، دوست و دشمن سب دار پر لٹکا دیئے گئے، بلکہ تمام پارٹیوں نے متفق ہو کر چیرز کی آوازوں کی گونج کے ساتھ نہایت خوشی سے یہ طے کیا، کہ ڈانٹن جو انقلابِ فرانس کا لیڈر تھا، ضرور ضرور دار پر کھینچا جائے، ادھر تو سفاکی اور بے رحمی کی یہ مثالیں پیش کی جارہی تھیں، اور اُدھر کو لوٹ دی ہربیں، کوتھن اور روبسپیر پر حد سے زیادہ نظرِ عنایت مبذول ہو رہی تھی، اب ان لوگوں نے نئے سرے سے پھر انقلابی حکومت کا

ایک جدید انتخاب کیا، اور ایک ایسی حکومت قائم ہوئی، جس کے ممبر سخت ظالم اور سفاک تھے، بحر و بر کو ان سے دشمنی تھی، اور کوئی فرد بشر ایسا نہ تھا جو ان کے حرکات سے نالاں نہ ہو، آخر مظلوموں کی فریاد سنی گئی، اور اس مہینہ کی ۲۲ تاریخ کو اس حکومت کا تختہ الٹ دیا گیا اور اس کے افراد ایک ایک کر کے قتل کرڈالے گئے ''

نیابی مجالس سے بھی اسی قسم کی حرکات اس وقت صادر ہونے لگتی ہیں، جب کسی قومی ہیجان کے اثر سے وہ متاثر ہو جاتی ہیں، موسیو اسپولر جو نظامِ نیابی کا بہت بڑا مؤید ہے، ۱۸۴۸ء کی پارلیمنٹ کے متعلق حسب ذیل ریمارک کرتا ہے :-

بغض و حسد، بیجا اعتماد اور بے انتہا خیالی امیدیں، یہ باتیں ہیں جو جمہوریت پسند گروہ کو فنا و موت کی جانب لے جا رہی ہیں، اس گروہ کی سادہ لوحی کی بھی کوئی حد ہے، کہ نہ اس کو قانون کی پروا ہے، اور نہ نظامِ و صلاح کا مفہوم اس کے ذہن میں آتا ہے، بیجا خیالی امیدیں قائم کرنے اور دلیری اور وحشت میں ان کی حالت دیہاتیوں اور بچوں کی حالت سے بالکل مشابہ ہوتی ہے، کہ حالتِ سکون میں اضطرابِ شدید اور حالتِ اضطراب میں اطاعت وانقیاد کے متضاد جلوے نظر آتے ہیں، جو غیر تربیت یافتہ دماغ کی شان ہوتی ہے، اس قسم کے دماغوں کا یہ خاصہ ہوتا ہے کہ وہ ہر بات سے حیرت زدہ ہوتے، سیدھے اور صحیح راستے سے گھبراتے اور اقدام و شجاعت کے ساتھ اگر آگ بھی ہو تو اس میں کود پڑتے ہیں، نسیان و ذہول کی استعداد ان میں زیادہ پائی جاتی ہے، اور وہ اپنے اعمال و افعال میں افراط و تفریط کی جانب

زیادہ مائل ہوتے ہیں، غرض ان کی حالت پانی کی سی ہوتی ہے، جس میں ہر طرح
کی صورتیں اتر آتی ہیں، بتاؤ اس حکومت سے کس بات کی امید رکھی جائے،
جس کی تشکیل اس قسم کے افراد سے ہوئی ہو"

اب یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب مجالسِ نیابی کی حالت یہ ہے کہ ایک ذراسی تحریک پر شرکائے مجلس آپے سے باہر ہو جاتے ہیں تو ایسی حالت میں اعضائے مجلس کے اوسان کہاں برقرار رہ سکتے ہیں، حالانکہ ہم دیکھتے ہیں کہ ان مجالس میں بعض اوقات مفید اصلاحی تجویزیں بھی پاس ہوتی ہیں، لیکن اس کا جواب یہ ہے کہ مجالسِ نیابی سے ہر زمانہ میں اثر پذیری اور ضعفِ عقلی وغیرہ کا اظہار نہیں ہوتا، ان اوصاف کا اظہار ان مجلسوں سے صرف اسی وقت ہوتا ہے، جب کوئی ہیجِ شدید دفعۃً رونما ہوتا ہے، باقی ان مجالس کی غالب حالت تو یہ ہوتی ہے کہ ان مجلسوں کے ہر ہر فرد کی شخصیت علی الاستقلال باقی رہتی ہے، اور شعور تام کی حالت میں جو تجاویز وہ پاس کرتے ہیں، وہ نہایت درجہ مفید اور ضروری ہوتی ہیں، ہاں البتہ یہ ضرور ہوتا ہے کہ اس قسم کی تجویزوں پر غور و فکر کرنے والا دماغ ایک ہی ہوتا ہے، قانون مجلس نہیں وضع کرتی ہے بلکہ قانون ایک ہی دماغ کی کاوش اور جانفشانی کا نتیجہ ہوتا ہے، لیکن جب یہ قوانین مجلس کے اندر پیش کئے جاتے ہیں، اور شرکائے مجلس ان میں ترمیم و تنسیخ کرتے ہیں، تو اس وقت ان قوانین میں نقصانات پیدا ہوتے ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ ہر مجلس کا سکریٹری مضر تجویزوں کے اثر سے اپنی مجلس کی حفاظت کرتا ہے، اور گویا سکریٹری کی حالت جماعت کے قائد سے مشابہ ہوتی ہے، جو مجلس پر قائد کی حیثیت سے حکومت کرتا ہے،

بلاشبہہ نظامِ نیابی ایک ایسا طرزِ حکومت ہے جس کی بدولت شخصی مظالم سے لوگوں کو امن حاصل ہوتا ہے، اور لوگ اپنے اوپر آپ حکومت کرنے کے عادی ہوتے ہیں اور خواہ عام آدمیوں کے ذہنوں میں یہ طرزِ حکومت کتنا ہی بے وقعت ہو، لیکن کم ازکم فلاسفہ کے نزدیک تو ثابت ہو چکا ہے کہ نظامِ نیابی سے بڑھکر طرزِ حکومت کی کوئی ترقی یافتہ صورت نہیں ہو سکتی؛

لیکن باوجود ان سب باتوں کے اگر نظامِ نیابی کو عملی حیثیت سے دیکھا جائے تو اس طرزِ حکومت میں دو بڑی خرابیاں نظر آئیں گی،

۱۔ مال کا بیجا اسراف،

۲۔ حریتِ شخصی کی تحدید،

ان دو نقائص میں سے پہلا نقص اس طرزِ حکومت میں اس وجہ سے پیدا ہوتا ہے کہ منتخب شدہ جماعتِ نائبین ہر اس تجویز کی تائید کرتی ہے، جو مجلس میں پیش کی جاتی ہے، مثلاً اگر کوئی ممبر اس مضمون کا رزولیوشن پیش کرتا ہے کہ مزدوری پیشہ جماعت کی شرحِ اجرت مقرر کر دی جائے یا بعض عہدیداروں کی تنخواہوں میں اضافہ کر دیا جائے تو دوسرے ممبر باوجودیکہ جانتے ہیں کہ اب میزانیہ (بجٹ) میں ان اخراجات کی گنجایش نہیں، مگر جان بوجھ کر ان تحریکات کی مخالفت نہیں کرتے، کیونکہ ان کو یہ خوف لگا رہتا ہے کہ جن لوگوں نے ان کو ممبر منتخب کر کے پارلیمنٹ میں بھیجا ہے، وہ بدظن ہو کر یہ خیال نہ کرنے لگیں کہ یہ لوگ ہمارے مصالح کا لحاظ نہیں کرتے، اب ممبروں کو دو مشکلوں کا سامنا ہوتا ہے، اگر وہ اپنی قائم مقامی کا خیال کرتے ہیں تو اخراجات کا اضافہ ہوتا ہے، اور اگر اخراجات اور بجٹ کا خیال کرتے ہیں تو قوم اُن سے بدظن ہوئی جاتی ہے، لیکن چونکہ کثرتِ اخراجات کے نتائج عام لوگوں کی نظروں سے اوجھل رہتے ہیں، اس لئے شرکاے مجلس

اس قسم کی تحریکات کی تائید میں اپنی رائے پیش کر دیتے ہیں،

پھر سب سے زیادہ مشکل اس وقت پیش آتی ہے جب مقامی ضرورتوں کے لئے کثیر اخراجات کی تحریک کی جا رہی ہو، اور چونکہ مقامی ضرورتوں کا تعلق خود ان لوگوں سے ہوتا ہے جنھوں نے قائم مقام منتخب کرکے بھیجے ہیں، اس لئے ان ضرورتوں کی بنا پر قائم مقاموں کو کثیر اخراجات برداشت کرنے پر مجبور ہونا پڑتا ہے[1]،

---

[1] اخبار ایکانومسٹ نے ۱۶- اپریل ۱۸۹۵ء کی اشاعت میں ایک دلچسپ مضمون ان کثیر اخراجات کے اوپر لکھا ہے جو مقامی ضرورتوں خصوصاً ریل اور وسائل آمد و رفت کی سہولتوں اور ترقی کے لئے حکومتیں برداشت کرتی ہیں، اس مضمون کا خلاصہ حسب ذیل ہے:- لانگو (جس کی آبادی تین ہزار نفوس ہے) اور پوئی کے درمیان ۱۵ ملین میں ریل تیار ہوئی ہے، اسی طرح لوموں (جس کی آبادی ۴۰۰۰ نفوس ہے) اور کاسٹیل سارزاں کے درمیان ۷ ملین میں، اور اوسٹ (جس کی آبادی ۲۳۰۰ نفوس ہے) اور سیکس (جس کی آبادی ۱۲۰۰ نفوس ہے) کے درمیان ۷ ملین میں، اور براڈ اور اولیٹ (جسکی آبادی ۷۰۴ نفوس ہے) کے درمیان ۷ ملین میں، اسی طرح ۱۸۹۵ء میں جن جدید ریلوں کی تیاری منظور ہوئی ہے اور جن کا بنانا بالکل بے کار ہے، ان کے اخراجات ۹۰ ملین ہوں گے، اس کے علاوہ مزدوری پیشہ جماعت کی شرح اجرت کے متعلق جو قانون پاس ہوا ہے اسکی تنفیذ کے لئے وزیر مال کے اندازہ میں ۱۶۵ ملین اور لوروا لیو ممبر سائنٹفک سوسائٹی کے اندازہ میں ۸۰۰ ملین کی منظوری درکار ہوگی، یہ حالت ان کثیر اخراجات کی ہے جو عموماً بلاد یورپ میں بے فائدہ برداشت کئے جا رہے ہیں اور جنکے باعث بعض ممالک مثلاً پرتگال، اسپین، ٹرکی وغیرہ تو بالکل مفلس ہو چکے ہیں اور بعض ممالک مثلاً اٹلی میں افلاس پھیلنا شروع ہو گیا ہے، لیکن حالت یہ ہے کہ قومیں ان کثیر اخراجات کو برداشت کرکے قرضہ اور سود کی مقدار کو اپنے بجٹ میں برابر بڑھا رہی ہیں، ان مصائب کے علاوہ مذہب اشتراکیت کی آفتیں اور اقتصادی منازعات ہماری جسموں کو اور گھلائے دیتے ہیں لیکن اب افسوس کرنا بیکار ہے، اب وقت گذر چکا اور مستقبل

دوسرے مضر یعنی تحدید حریت کی حالت یہ ہے کہ گو اس میں روزانہ اضافہ ہوتا جاتا ہے، لیکن مجالسِ نیابی کے نزدیک چونکہ روزانہ قوانین کے وضع کرنے کی ضرورت ہے، اس لئے کسی کے ذہن میں یہ نہیں آتا کہ ان جدید قوانین کے وضع کرنے سے جو کچھ آزادی عمل ہمیں حاصل تھی، وہ بھی سلب ہو جائے گی۔[۱]

انگلستان کی نیابی مجلس (پارلیمنٹ) تمام ملکوں کی نیابی مجالس سے زیادہ آزاد ہے، اور اس میں ہر ممبر کی آزاد مستقل حیثیت برقرار رہتی ہے، لیکن باوجود اس کے وہ بھی ان مضرات کے دفع کرنے سے قاصر ہے،

ہربرٹ اسپنسر جو انگلستان کا ایک مشہور فلسفی ہوا ہے، اُس نے مدت ہوئی اپنی کتاب "افراد اور حکومت" میں اس مسئلہ کو نہایت وضاحت سے لکھا تھا، اس کے بعض جملوں کا اقتباس میں ناظرین کی ضیافتِ طبع کے لئے پیش کرتا ہوں، وہ لکھتا ہے:-

"تشریع اور قانون سازی کا جو طریقہ ہمارے ملک میں مدت سے رائج ہے اس کا ایک مضر پہلو یہ ہے، کہ لوائح (رزولیوشن یا قوانین) اور تعدیلات (ترمیمات) کی کثرت کی وجہ سے حریتِ شخصی کے حدود تنگ ہوتے

---

[۱] یہ حالت تو فرانس کی ہے، لیکن غریب ہندوستان کی حالت اس بارے میں فرانس سے زیادہ قابلِ رحم ہے، انگریزوں نے ہندوستانیوں کی مشق اور تمرین کے لئے مختلف صوبوں میں جو کونسلیں قائم کی ہیں، وہ صرف اس غرض سے قائم کی گئی تھیں کہ ہندوستانی خود اپنے لئے قوانین وضع کریں گے جو ان کی ضرورتوں کے مطابق ہوں گے لیکن اب ملکی نامزد شدہ قائم مقاموں کے علی الرغم روزانہ جدید قوانین وضع کئے جاتے ہیں، اور ملک استبداد کی مصیبت میں مبتلا ہے، یہ وہ اصلاحی تجویز ہے جو انگریزی نقطۂ خیال سے ہندوستان میں سلف گورنمنٹ کیلئے راستہ صاف کر رہی ہے، (مترجم)

جا رہے ہیں،

۱۔ ہر سال ایک جدید قانون نافذ کیا جاتا ہے، جو جدید فرائض و واجبات (جن سے پہلے آزادی تھی) لوگوں پر عائد کر دیتا ہے،

۲۔ ہر روز نئے نئے ٹیکس وضع کئے جاتے ہیں، اور اس طرح لوگوں کو روزانہ اپنے مالِ مکسوبہ کی کثیر مقدار سے محروم کر دیا جاتا ہے، اور یہ سارا روپیہ عہدہ دارانِ حکومت پر صرف ہوتا ہے"

نظامِ نیابی کی ان دو مضرتوں کے علاوہ جو ہربرٹ اسپنسر نے بتائی ہیں، ایک بڑی مضرت اور ہے جو تمام ممالک میں مصیبتِ عظمیٰ کا پیش خیمہ ہے، اور وہ یہ ہے کہ ان نئے نئے قوانین کی وجہ سے روزانہ ان عہدہ داروں کی تعداد میں اضافہ ہوتا جارہا ہے جو ان قوانین کی تنفیذ کے لئے مقرر کئے جاتے ہیں، اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس قسم کے عہدہ داروں کو ملک کی حقیقی حکومت سپرد کر دی جاتی ہے، اس گروہ کی حکومت نہایت ظالمانہ ہوتی ہے، اور اس کے اعمال و افعال کی کوئی بازپرس نہیں کرتا، دیکھو یہ کتنا شدید استبداد ہے، کیا اس سے بڑھ کر کوئی استبداد ہو سکتا ہے؟

غرض جدید قوانین کا اضافہ اور کثیر اخراجات جن کا بار ٹیکس کی صورت میں رعایا اور قوم پر ڈالا جاتا ہے، یہ مضرتیں ہیں جن کے باعث افراد کا دائرۂ عمل محدود ہو گیا ہے اور افسوس کہ قومیں اب تک یہ سمجھی بیٹھی ہیں کہ نظامِ نیابی حریت و مساوات کا کفیل ہے، افسوس ان کو یہ نہیں سوجھتا کہ نظامِ نیابی ایک بڑی مصیبت ہے جو استبداد میں قوموں کو مبتلا کر رہی ہے، اور یہ استبداد شخصی استبداد سے بڑھ کر ہے،

لیکن جو کچھ ہو، اب تو بجز اس کے کوئی چارہ نہیں کہ ہم نظامِ نیابی اور موجودہ

طرز حکومت کی اتباع کریں، کیونکہ اب اس نظام کے استبداد کو برداشت کرتے کرتے کچھ ہم اس طرح کے عادی ہو گئے ہیں کہ ملکۂ انتقاد اور ملکۂ اقدام ہم سے مفقود ہو چکا ہے اور یہ قاعدہ ہے کہ جب انسان اپنے ذاتی اخلاقِ فاضلہ کو کھو بیٹھتا ہے تو وہ دوسروں میں ان کے دیکھنے کی تمنا کرتا ہے، اس بنا پر جب افراد کا ارادہ سلب ہو چکا اور ان کی قوت عزیمت فنا ہو گئی تو بداہتہً جماعت کی قوت وسطوت میں اضافہ ہو گیا اور افراد کا ارادہ جماعت کے ارادہ میں ضم ہو کر بالکل فنا ہو گیا، اب وہ اعمال جو پہلے افراد کی قوت سے انجام پاتے تھے بجائے افراد کے جماعت کی قوت سے انجام پانے لگے، اور بجائے افراد کے جماعت تمام اعمال کی نگران اور محافظ بن گئی، اب جماعت گویا قادر مطلق معبود ہے جو انسان پر حکومت کر رہی ہے لیکن تجربہ سے معلوم ہوا ہے کہ اس قسم کے معبودوں کی حکومت چند روزہ ہوتی ہے،

جن قوموں میں افراد کی حریتِ ارادی سلب ہو گئی ہو، ان کے متعلق یقین رکھو کہ اب ان کا دورِ انحطاط شروع ہو گیا ہے، اور بہت جلد یہ قومیں فنا ہو جانے والی ہیں، اس بنا پر جب ہم اقوام کے دورِ ماضی اور حال کا مقابلہ کرتے ہیں تو ہم کو نظر آتا ہے کہ علاماتِ انحطاط نے ہمارے تمدن کو چاروں طرف سے گھیر لیا ہے، فنا کی علامتیں نظر آ رہی ہیں، اور یورپ کی تباہی کا زمانہ قریب آ گیا ہے، اور ہم ایک ایسے دور میں سے ہو کر گذر رہے ہیں جو ہم کو فنا اور موت کی جانب لئے جا رہا ہے،

اوراقِ بالا میں نفسِ اجتماعی کے مظاہر کی تشریح ختم ہو گئی، اب ہم چاہتے ہیں کہ گذشتہ بیانات کا خلاصہ درج کر کے کتاب کو ختم کر دیں،

یہ معلوم ہے کہ ہر قوم کو دو دوروں سے ہو کر گذرنا لازمی ہے:- دوّر ترقی،

اور دَورِ انحطاط، لیکن سوال یہ ہے کہ قوموں کی ترقی اور تنزل کے اسباب کیا ہوتے ہیں، ذیل میں ہم مجملاً اس سوال کا جواب دیں گے،

سب سے پہلے ہم کو چند ایسے لوگوں کا مجمع نظر آتا ہے، جو ہجرت یا فتوحات کی بنا پر کسی ملک میں مجتمع ہو جاتے ہیں، ان کی زبانیں مختلف ہوتی ہیں، اُن کے رسوم ورواجات جدا جدا ہوتے ہیں، اور ان میں کوئی رابطۂ اتحاد نہیں نظر آتا بجز اس ایک رابطہ کے کہ اس گروہ کا ایک رئیس ہوتا ہے جو سارے گروہ کو بایں ہمہ اختلاف وتشعب مجتمع کئے رہتا ہے، شجاعت واقدام اس گروہ کی سرگذشت میں داخل ہوتے ہیں، اور قوت وتوحش سے اس گروہ کا خمیر ہوتا ہے،

فرض کرو کہ ایک مدت گذر گئی، اور وہ گروہ اپنے اسی حال پر تھا کہ دفعۃً ماحول کے تغیرات اور اجتماعی ضروریات کے تقاضے سے اس گروہ کے جو اجزاء و عناصر باہم منفصل تھے، وہ پیوستہ ہو گئے، اور اس گروہ کے تمام افراد میں ایک گونہ ارتباط واختلاط پیدا ہو گیا، اور اس اختلاط وارتباط کے پیدا ہوتے ہی اس گروہ میں اُن اوصاف کا بھی وجود ہو گیا، جو علم النفس کے نقطۂ نظر سے جماعت کے خصائص ہیں، یہ دوسرا دور ہے، جہاں آ کر ایک منتشر گروہ منتظم جماعت کی صورت اختیار کرکے دورِ تمدن میں قدم رکھتا ہے،

لیکن ابھی اس جماعت کی حالت اتنی درست نہیں ہوئی ہے، کہ وہ وحشی سے متمدن ہو جائے، ابھی اس کو ایک نقص کی تکمیل کرنا ہے، اور وہ نقص یہ ہے کہ ابھی اس کا کوئی خاص مقصد متعین نہیں ہوا، جس کے حاصل کرنے کی اس کو کوشش کرنا چاہیئے، اس لئے ابھی اس پر حالتِ جمود طاری ہے، اور مقصد کے متعین ہونے کے لئے ایک مدت درکار ہے، اب فرض کرو کہ رفتہ رفتہ اس کا مقصد بھی متعین ہو گیا، اور اب وہ جوش

وقوت سے بھرپور ہے،
اب دورِ تمدن کا آغاز ہوتا ہے، قوم اپنے مقصد کی تکمیل وتحصیل کے درپے ہوتی ہے، اور قومی ضروریات کے مطابق اس قوم کے عقائد اور اس کے علوم و فنون وغیرہ کی تدوین کی جاتی ہے، اور دنیا کی قوموں کی صف میں یہ قوم صدر نشینی کا اعزاز حاصل کرلیتی ہے، اس اثنا میں گو بعض جدید مصائب بھی اس کو پیش آتے ہیں جو اس کی حالت میں تغیر پیدا کردیتے ہیں، لیکن یہ تغیر صرف وقتی ہوتا ہے، اور اس کی قومی روح کو ان حوادث ومصائب سے کوئی صدمہ نہیں پہنچتا،

لیکن اب یہاں آکر زمانہ کی قوتِ ایجادی ختم ہوجاتی ہے، اور اس کی قوتِ اعدامی کا ظہور ہونے لگتا ہے، اور تمدن قوت وشوکت کی ایک حد معین پر پہنچکر رک جاتا ہے، یہ قوم کا دورِ وقوف ہے، اس دور کے ختم ہونے کے بعد قوم کا دورِ شیخوخیت شروع ہوتا ہے، جس کے بعد فنا وموت لازمی ہے،

فنا وموت سے گو کسی قوم کو مفر نہیں، لیکن ساعتِ موت اکثر اُس وقت آتی ہے جب قوم کے مقصد معین میں ضعف پیدا ہوجاتا ہے، جب تک قوم کا یہ تخیل قوی تھا، اُس وقت تک قوم کے قوار واعضار قوت سے بھرپور تھے، لیکن جہاں اس میں ضعف پیدا ہوا، بس قوم کے قوائے عمل شل ہوگئے، سیاست ومذہب کے قصور عالیہ ایک دم زمین پر آرہے، اور قومی موت کی ساعتِ موعود آن پہنچی،

جب کسی قوم کے تخیل اور مقصد معین میں ضعف آجاتا ہے تو اس کی قوتِ امتزاجی فنا ہوجاتی ہے، افراد کی شخصیت مضمحل اور قوم کے قوائے عمل شل ہوجاتے ہیں، اور گو اس وقت دماغی قوتوں میں حیرت انگیز طاقت آجاتی ہے لیکن اسی وقت سے

نظامِ اخلاق کا زوال اور عملی طاقت کا فقدان بھی شروع ہو جاتا ہے جو دورِ انحطاط وتنزل کی نشانیاں ہیں، اس وقت قومی کالبد قالبِ بے جان ہو کر رہ جاتا ہے، اندر دیکھو تو کچھ نہیں، لیکن ظاہری حالت زندگی کا ثبوت دے رہی ہے، یہی وقت ہوتا ہے جب قومی نظام درہم برہم ہو جاتا ہے، افراد اپنا ذاتی استقلال کھو بیٹھتے ہیں، امیدیں اور تمنائیں دل ہی دل میں پیدا ہوتی اور مٹ جاتی ہیں، تمدن کے ستون منہدم ہو جاتے ہیں، اور دورِ وحشت لوٹ آتا ہے، اور گو اس وقت قوم کی ظاہری شان سے یہ گمان ہوتا ہے کہ قوم اپنے شباب پر ہے، لیکن حقیقت میں اس وقت قوم کی حالت یہ ہوتی ہے کہ اس کے اعضاء وجوارح میں ضعف پیدا ہو چکا ہے، اُس کی روح کو دیمک چاٹ گئی ہے، اور قوم ایک خشک درخت کے مانند ہو گئی ہے جو ہوا کے ایک جھونکے سے زمین پر آرہتا ہے،

غرض قومیں ایک خیال اور ایک مقصد کے درپے ہو کر دورِ وحشت سے دورِ تمدن تک ترقی کرتی ہیں، اور دورِ تمدن کے بعد ان پر انحطاط طاری ہوتا ہے، پھر جب ان کا مقصدِ معین کمزور ہو کر فنا ہو جاتا ہے، اس وقت وہ خود بھی نذرِ اجل ہو جاتی ہیں، یہ ہے ناموسِ الٰہی جو تمام اقوامِ عالم پر مسلّط ہے،